دو انسان آدم کہلائے

مختلف مذہبی نقطہ ہائے نظر سے
تخلیق اور ارتقاء کی بحث پر ایک نظر

منجانب:

آرتھر سی کسٹنس

تدوین چوتھی اشاعت:

ای۔ایم۔وائٹ اور آر۔جے۔ چیانگ

ڈوروے پبلیکیشنز 2010

مترجم: احسان الٰہی

تدوین: یاسر طالب

Two Men Called Adam:

A fresh look at the creation/evolution controversy from a

different point of view - the THEOLOGICAL

Custance, Arthur C., 1910-1985

Fourth Edition

Edited by E. M. White and R. G. Chiang

Translated by Yasir Talib & Ehsan Elahi

Copyright © 2010 Doorway Publications, Hamilton, ON, Canada.

Cover and text formatting by R. G. Chiang

Diagrams redrawn by R. G. Chiang

All rights reserved. No part of this book may be reproduced in any form without written

permission from Doorway Publications,

Redeemer University College, Ancaster, Ontario, Canada, L9K 1J4.

Help Acadamy

Translation & Publication

Street #4, Bagh Ban Pura

Faisalabad, Pakistan

email: yasartalib@yahoo.com

Custance Centre

www.custance.org

custancecentre@redeemer.ca

فہرست

باب اوّل: نوعِ انسانی کا مسئلہ 1

پہلا حصہ
انسانی جسم کا مخصوص نمونہ

باب دوم: بنی نوع انسان کے لیے بنایا گیا کوئی جسم 11

باب سوم: انسانی جسم 20

باب چار: انسان سے ایک عورت اخذ ہوئی 27

باب پانچ: ابدیت: انسانی منزل 32

باب چھ: فانی بنائے گئے انسان کی نجات 39

دوسرا حصہ
انسانی روح: ایک منفرد تخلیق

باب سات: انسانی روح + انسانی جسم = انسان 49

باب آٹھ: روح + جسم = قابلِ شناخت جسم 55

باب نو: روح / جسم ایک باہمی عمل 62

تیسرا حصہ
پہلے اور آخری آدم کی انسانیت

باب دس: کھنڈرات میں گھر 73

باب گیارہ: عالیشان گھر 78

باب بارہ: پوشیدہ ظاہر ہوگیا 86

باب تیرہ: دو آدم: دو انسان 95

چوتھا حصہ
موت پر فتح

باب چودہ: زوال شدہ انسان کا مرنا ایک المیہ 108

باب پندرہ: غیر زوال شدہ انسان کا قربان ہوکر مرنا 116

باب سولہ: موت کی موت 129

باب سترہ: موت منسوخ کردی گئی 141

باب اٹھارہ: نتیجہ: منزل بنیاد ماپتی ہے 150

نوعِ انسانی کا مسئلہ

کیا ارتقاء اور ایمان کو یکجا کیا جا سکتا ہے؟

جب 1859ء میں ڈارون نے ''اصناف کی بنیاد'' شائع کی تو اس نے مذہبی لوگوں کو زیادہ پریشان نہ کیا کیونکہ اس نے انسانی ارتقاء کو کوئی منطقی نتیجہ نہیں دیا تھا۔ لیکن جب اس نے 1871ء میں ''انسان کا نزول'' شائع کی، تو مسیحی ایمان کو خطرے کی اہمیت کھل کر سامنے آ گئی۔ سب سے پہلے یہ واضح تھا کہ ارتقاء کے حوالے سے صنفِ انسان کا تصور کسی بندر نما چیز سے شروع ہو کر خدا کی خصوصی تخلیق یعنی انسان تک پہنچ گئی، جس میں خدا کی اپنی تصویر موجود تھی اور جو شروع ہی سے ذہانت اور اخلاقی آزادی کا حامل تھا۔

نظریہ ارتقاء نے انسان کو زیادہ سے زیادہ 6000-10,000 سال تک ایک روائتی دور دیا، جس کی ترتیب بائبل کی بنیاد پر رکھی گئی لیکن کچھ دوسری باتیں بھی تھیں جن کا وقت کے ساتھ ساتھ سامنا کرنا پڑا۔ ارتقاء آخری آدم مسیح اور پیدائش کے پہلے آدم (باوا آدم) کے درمیان مخالفانہ تعلق کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ انسان کے لیے یسوع بطور نجات دہندہ کا کردار ایک تعلق کے لیے بہت ضروری ہے۔ کیا واقعی پہلا آدم بندر تھا یا انسان؟

کیا ہزاروں سالوں سے انتہائی ذہانت کے باوجود انسان اپنی اعلیٰ خود انحصاری محفوظ کرنے کے لیے ارتقائی ضروریات کے تحت کسی سرد اندھیرے غار کے خوف میں مبتلا ہے؟ کیا یہ ابتدائی آدھے انسان کے نقوش، جس کی فطرت لافانی ہے جس کا کوئی جسم نہیں ہے کہ اُسے موت آئے، پھر بھی وہ نافرمانی کی سزا کے طور موت کا مزہ چکھے گا۔ اس طرح کا ایک انسان بندر سے اخذ نہیں کیا جا سکتا جس کے لیے یہ بات یقینی ہے کہ موت طے شدہ ہے جو سب جانداروں کو اپنی زندگی کے دن گزارنے پر آتی ہے۔

دوسرے مسائل بھی ہیں، یقیناً حوا کو آدم میں سے بنایا گیا ہے۔ اگر حوا آدم کے جسم سے نکالی گئی ہے اور آدم اور حوا کو ارتقاء سے بنایا گیا ہے تو کیا وہ نر اور ناری ہو سکتے تھے؟ کیا خدا نے نر اور ناری میں زندگی کا دم پھونکا تا کہ حقیقی آدم اور حوا کو بنایا جائے جیسے مذہبی عقائد بتاتے ہیں؟ تاہم بائبل اس معاملے پر انتہائی واضح طور پر بتاتی ہے کہ کوئی اور جاندار نہیں جس کی مادہ نر سے نکالی گئی ہو۔ ''ابتدا'' اور ''انسان کا نزول'' نامی کتابوں کے شائع ہونے کے بعد آئندہ واقعات سے واضح ہو گیا ہے کہ ٹھوس مذہبی اور انجیل مقدس پر ایمان رکھنے والے لوگوں کے لیے مشکلات پیدا ہوئی ہیں، تاہم دو بڑے مسئلے تھے جنہیں بہت پہلے سے ہی جان لیا اور پریشان کُن محسوس کر لیا گیا تھا۔

یہ دو مسائل تھے:

(۱) بائبل کے مطابق انسانی وجود کے آثار 4004 سال قبل مسیح سے بھی دور تک ملتے ہیں۔

(۲) دنیا میں انسانی تعارف کی کہانی کسی نچلے درجے کے جانور سے نہیں بلکہ زمین کی مٹی سے تھی جسے خدا نے براہ راست تخلیق کیا اور اُسے اپنی شکل دی۔

آدم ایک مقدس تخلیق تھی، اس مسئلے کو بائبل کی تاریخ اور تصورِ ارتقاء کو دیکھ کر حل کیا گیا۔

میرا مقصد دنیا کے آغاز کے اس نظریے کے عوامل کا جائزہ لینا تھا جنہوں نے ایک سنجیدہ مذہبی مسئلہ پیدا کر دیا تھا، ماضی میں لوگوں نے اس مسئلے کو سنجیدگی سے نہ لیا، جو کہ خطرے کی گھنٹی تھی۔

تعارف کے طور پر میں بہت مختصر جائزہ لوں گا کہ پرنسٹن تھیولوجیکل سیمنری میں کیا ہوا؟ اس وقت یہ درسگاہ شمالی امریکی مسیحیوں کا مرکز تھی، جسے سالوں تک ایک خاص نظام کے تحت تیار کردہ امریکی مسیحیوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ حیران کُن بات یہ ہے کہ ڈارون ازم (انسان قدیم سے بندر تھا) نے تیزی سے جگہ بنالی بے شک 1900ء تک پرنسٹن میں تقریباً سب لوگ ڈارون ازم پر یقین رکھنے لگے۔ ڈارون ازم نے اُن کے لیے مسائل پیدا کیے جو خدا کے کلام میں یقین رکھتے اور وہ آہستہ آہستہ واضح ہونے لگے تھے۔ 1900ء تک بہت سے لوگ ہار مان گئے کیونکہ دوسری مذہبی درسگاہیں اور ادارے انسانی ارتقاء کا نظریہ تیزی سے اپنانے لگے جو کہ بائبل کے مطابق الگ تھا جس کی بنیاد اُن کے بڑوں نے رکھی تھی۔

ڈارون کی کتاب کس طرح مسیحی ایمان پر اثر انداز ہوئی؟

نظریہ ارتقاء انیسویں صدی کی آخری سہ ماہی تک بہت مقبول ہو گیا۔ پرنسٹن کو بہت بڑے بڑے مذہبی لوگ عطا تھے۔ انیسویں صدی کا سب سے بڑا امریکی مذہبی عالم چارلس ہوج (1797-1878)، اُس کا بیٹا الیگزینڈر اے ہوج (1823-1886) جس نے اپنے باپ کی پیروی کی، ولیم ایچ گرین (1825-1896) جو کہ پرانے عہدنامہ کا پروفیسر تھا اور اُس نے ابتدائی ترتیب پر ایک کتابچہ بھی لکھا جو اب بھی موجود ہے۔ اس کتابچے نے انسان کی قدامت پر گہرا اثر ڈالا (جسے ہم باب 18 میں دیکھیں گے) اور بنجمن بی وارفیلڈ (1851-1921) جو کہ پرنسٹن ہی کی پیداوار تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی رقاصہ ماں کی وجہ سے اے اے ہوج کے بعد آنے والا ایک عبرت آمیز جُتی، پروفیسر بن گیا۔

چارلس ہوج نے پہلے پہل یہ کہا کہ نظریہ ارتقاء قیاس آرائی ہے اور حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوچا کہ انسانی روح اور جسم ارتقاء سے وجود میں آئے۔ اس کے بعد اس کی جگہ آنے والے اس کے بیٹے الیگزینڈر کا بھی یہی ماننا تھا۔ براہ راست تخلیق پر سوال ہی نہ تھا لیکن 1863ء میں سر چارلس لائل کی کتاب ''انسان کے آثار'' کی اشاعت کے ساتھ چارلس ہوج شک میں پڑ گیا، آیا کہ بائبل کی ترتیب جو کہ آدم کی تخلیق 6000 ہزار سال پہلے کی بتاتی ہے کا دفاع کیا جا سکتا ہے، یا نہیں۔

اپنے والد کی طرح الیگزینڈر ہوج، لائل کی عقیدت سے متاثر تھا، اس لیے لائل کے نظریات نے اُس کے ذہن میں جگہ بنالی۔ لائل زمین کی انتہائی قدامت کو تسلیم کر چکا تھا اور اس بات کو بھی کہ انسان بائبل کی تاریخ سے بہت پہلے تخلیق کیا گیا۔ اُس نے لکھا ''کسی بھی صورت میں آدم کا تعلق اس نسل سے ثابت نہیں ہوتا، لیکن صرف یہ کہ اُس کو ہمارے انداز سے بہت پہلے بنایا گیا'' یہ کسی پھانے کے پتلے کنارے کی طرح تھا۔

قدیم انسانی دور کے خیال سے ولیم ایچ گرین پریشان تھا اور پیدائش کی کہانی کیخلاف بشپ Colenso کے شدید حملوں اور

الزامات کا دفاع کرتے ہوئے گرین نے 1863 میں اپنی کتاب ''توریت کی پانچ کتابوں کی تائید'' شائع کی۔

اس کتاب میں اُنھوں نے ثابت کیا کہ بائبل کی ترتیب پر اس بنیاد پر حملہ نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کی تاریخ ارضیاتی ثبوت کے مطابق نہیں۔ کیونکہ بائبل نے کسی طور کوئی حتمی ترتیب مہیا نہیں کی۔ صنفی علوم کی ترتیب جو گرین پر ظاہر ہوئی میں کافی خلا تھا جس میں آدم کی تخلیق کی تاریخ غیر یقینی تھی۔ لہٰذا اب 4004 قبل مسیح کی روائتی تاریخ کو بائبل کی بنیاد پر ترک کیا جا سکتا تھا۔

الیگزینڈر ہوج نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنے والد پر گرین کی کتاب کے زوردار اثرات بیان کیے، وہ بیان کرتا ہے ''مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میرے والد چہل قدمی کرتے ہوئے مطالعہ کر رہے تھے تو میں نے انھیں کہتے ہوئے سنا، میرے لیے یہ کتنا پرسکون ہے، انھیں یہ ہی کہنا چاہیے تھا۔'' اس سے بائبل اور ارضیات کا تنازعہ حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ ایسا نہیں لگتا کہ الیگزینڈر ہوج نے فرار ہونے کا منصوبہ بھانپ لیا ہو۔ گرین نے لکھا تھا ''ہو سکتا ہے کہ آدم اور ہم سب تخلیق ہوئے ہوں لیکن ہم سب اسے بائبل کے برعکس جانتے ہیں۔ الیگزینڈر کے مطابق اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آدم کو بہت پہلے بنایا گیا، یہ نہیں کہ آدم کوئی مختلف انسان تھا۔ اُن کے روائتی نقطہ نظر اور آنے والی تاریخ کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ آدم ابھی تک ایک منفرد تخلیق تھا۔

وارفیلڈ نے، جو الیگزینڈر ہوج کے بعد آئے، اس فیصلے کو پھر تسلیم کر لیا اور پیدائش کے پہلے تین ابواب پر اسطرح کے وسیع دور کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں کا احساس نہ کیا۔ اُنھوں نے یہ بھی مان لیا کہ کسی طور آدم ایک حقیقی تخلیق ہے لیکن اس کو بہت پہلے خلق کیا گیا ارضیاتی وقت بھی اہمیت رکھتا ہے اس طرح انھوں نے 1911 میں لکھا ''انسان کے آثار کے سوال کی اپنی کوئی مذہبی اہمیت نہیں۔ یہ بالکل مختلف نظریہ ہے کہ کتنا عرصہ پہلے انسان زمین پر موجود تھا۔''

اس پوری بحث کے دوران، جو آدم کے جسم کی تخلیق پر تھی، ذہن میں اس کی روح کی تخلیق، جسے خدا نے براہ راست تخلیق کیا، پر کوئی سوال پیدا نہ ہوا۔

دونوں ہوج، وارفیلڈ اور یقیناً گرین بھی اس بات سے آگاہ نہ تھے کہ یہ قبولیت بہت سنگین ہے۔ اس طرح کی قبولیت اور زوال کی کہانی، نئے عہدنامے اور پہلے اور آخری آدم کے تصور کے لیے تباہ کن تھی۔

انسان کی تخلیق پر پختہ یقین ہو جانے پر وہ اس بات کو ماننے لگے کہ آدم کے جسم کو خدا نے بنایا ہے۔ وارفیلڈ نے اپنے قارئین کو یقین دلایا کہ ارتقاء تخلیق کا متبادل نہیں بلکہ الٰہی طور طریقوں کا ثبوت ہے۔ انسانی جسم اب ارتقائی نظریہ زندگی میں جگہ پانے کے لیے تیار تھا یعنی یہ کوئی براہ راست تخلیق نہیں تھی بلکہ ایسا (عام آنکھ سے نہ نظر آنے والا ایک یک خلوی جاندار) سے انسان تک کی تبدیلی میں غیر محسوس طور پر لاکھوں سال لگ گئے۔ یہاں پر آدم سے حوا کو نکالنے کے لیے نہ غیر فطری مداخلت کی ضرورت تھی نہ ہی کسی لفظی الٰہی سرجری کی۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ جب اناجیل کا دفاع کرنے والے وقتی قبولیت حاصل کر رہے تھے، تو آزاد مذہبی لوگ اسے مختلف وجوہات کی بنا پر رد کر رہے تھے۔ اور جب اناجیل کو ماننے والے ڈارون ازم کی طرف جھک رہے تھے تو ایمان کی نسبت اُن کا آسانی سے دفاع کر لیا گیا۔ ڈارون خود آہستہ آہستہ اپنے مسیحی ایمان کی وجہ سے ہتھیار ڈال رہا تھا جسے ہم آخری باب میں دیکھیں گے۔ ارتقائی نظریات

کو ماننے کے نتائج نہ صرف پرنسٹن تھیولوجیکل سیمنری (انا جیلی نظریات کا مرکز) پر بلکہ براعظم امریکہ اور انگلش ممالک کی بہت سی مسیحی درسگاہوں پر بھی، تباہ کن ثابت کرنا تھے۔

اس کا ایک مطلب موجودہ نسل کو انا جیلی سچائی سے دور کر کے مسلسل جنگجو کفر کی طرف لیجانا تھا۔ حوالے کے طور میرے ذہن میں معروف اگسٹس ایچ سٹرانگ (1836-1921) کی کتاب ''سلسلہ وار عقائد'' کا یادگار کام بھی ہے۔ جس کا 1907 میں پہلا ایڈیشن دوبارہ شائع کیا گیا۔ اپنے ہم عصروں کی طرح اس کا خیال بھی تھا کہ آدم کے جسم کو ارتقاء سے تخلیق کیا گیا ہے لیکن روح کو نہیں جیسے کہ اس نے کہا، ''صنفِ انسان وحشیوں میں سے ہے۔''

پھر انھوں نے اپنی کم معروف کتاب ''مسیح کی تخلیق'' میں بلا تکلف تسلیم کر لیا کہ جونہی انسان کو ارتقاء سے اسکا جسم ملا، تو کوئی منطقی وجہ نہ رہی کہ اسی طرح اسے روح بھی مل گئی ہوگی۔ کیونکہ بہر صورت یہ خدائی تخلیق کا طریقہ تھا۔

جب انھوں نے ''مسیح کی تخلیق'' کا مسودہ مکمل کیا تو اس کی اصلاح کے لیے اپنے بیٹے چارلس (1863-1940) کو درخواست کی۔ اگر چہ تمام خاندان باپ کے انجیلی ایمان پر معتقد نظر آتا ہے پھر بھی چارلس اپنے والد کے مباحثوں کے برعکس اس کو زیادہ قبول کرتا نظر آتا ہے۔ حقیقی انجیلی مقام کو ماننے کا بہانہ اور ارتقاء کو قبول کرتے ہوئے چارلس نے محسوس کیا کہ اس کے والد خود سے سمجھوتہ اور قارئین کو گمراہ کر رہے تھے۔

نتیجتاً ایک مسیحی کے طور پر اپنے مقام کو ترک کرتے ہوئے چارلس اپنے والد کے مسودہ کی اصلاح کرتے ہوئے مکمل طور پر اس کے خلاف ہو گیا اور وہ اپنی موت کے دن تک کفر کیخلاف پر جوش مجاہد بن گیا۔

لیکن افسوس کہ کہانی یہیں پر ختم نہ ہوئی کیونکہ ارتقاء سے متفق لوگ اچھے خاصے تھے اور وہ دولت مند حلقے میں داخل ہونے لگے۔ ان کے دوستوں میں اس طرح کے لوگ تھے جیسے جان ڈی روک فیلر، چونسی ڈیپو اور اینڈ ریو کارنیگی۔ پہلے والے نے تیل میں دوسرے نے ریلوے اور تیسرے نے سٹیل کے کاروبار میں اپنی پہچان بنائی۔

ان میں سے ہر ایک اپنے کاروباری حربوں میں بے رحم تھا۔ وہ اپنے نقادوں کو یقین دلا رہے تھے کہ وہ خدا کے فطرتی طریقوں اور ارتقائی اصولوں پر عمل پیرا ہیں، جو سب کے لیے اجتماعی طور پر بہتر ہیں مگر انفرادی طور پر سخت۔ اس بات سے انھیں خاصی تسلی تھی کہ ان کے انجیلی دوست اور عالم اے ایچ سٹرانگ نے انھیں اپنے فلسفے سے سہارا دیا تھا۔

ارتقاء کی طرف جھکتے ہوئے ایمان کے نتائج

انسان کی ایسی تعلیم، صحائف سے عقیدت اور بائبل پر عالمانہ گرفت کیوں اتنی آسانی سے ارتقائی فلسفے کو اجازت دیتی ہے کہ وہ ان کی سوچ میں زہر بھر دے۔ ایک انسان کے طور پر صرف اے ایچ سٹرانگ اس بات سے مستقل متفق رہا کہ پہلے انسان کی روح مافوق الفطرت تخلیق ہے۔ پھر کیوں انھوں نے اتنی جلدی آدم کے جسم کے لیے ایک مادی ارتقائی طریقہ مہیا کیا، جبکہ ان کے پیش نظر خدا کا کلام بھی تھا جو کہ اس معاملے پر بہت واضح ہے۔

کیا اُنھوں نے نہ پہچانا کہ ارتقائی فلسفے کی سنگین جارحیت کبھی نہیں رُکے گی جب تک کہ مافوق فطرت مکمل طور پر ختم نہ ہو جائے۔ 5
ایک وقت آئے گا جب ارتقائی لوگ اپنی بدعت کے باوجود اس بات کو مان لیں گے کہ انسان کی روح بھی اسی طرح بنائی گئی جس طرح اسکا جسم۔ حتیٰ کہ اے ایچ سٹرانگ اس کی پیشن گوئی کر سکتا تھا، جیسے کہ ارتقائی معتقد کرٹلی ایف ماتر نتیجتاً کہتے ہیں ''انسانی زندگی کے روحانی پہلو یقیناً عوامل یا ارتقاء کی پیداوار ہیں جیسے کہ اس کا دماغ اور اعصابی نظام۔

منطقی طور پر ابدیت کے لیے روح کی حفاظت کی بات کرنا معقول ہے۔ اگر روح انسانی جسم میں ارتقائی طریقے سے آئی ہے، جیسے حیوانی جسم میں شعور۔ پھر روح شعور کی طرح سے جسم کے ساتھ ختم ہو جانی چاہیے اور پھر ارتقاء کے ماننے والے یا تو رضامند ہو جائیں گے یا منطقی طور پر جسم کے جی اٹھنے جیسے مرحلے کا دفاع کرنے کے اہل۔ یونانیوں نے اس نظریے کو مکمل مضحکہ خیز خیال کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انسان قطعی روحانی نہیں ہے اور اس کا جسم ایک جیل ہے جس سے روح آزاد ہونے کی خواہش مند ہے۔

انجیل پر ایمان رکھنے والے، انسانی جسم کو روح کا بنیادی جُز سمجھنے میں کیوں ناکام ہیں۔ انسان کوئی ایسی روحانی مخلوق نہیں ہے جسے قبر کی دوسری طرف آسانی سے جسم مل گیا ہو۔ اس کی روح کے لیے اسکا جسم ایک مستقل گھر کے طور پر خدمت کرنے کے لیے تخلیق ہوا۔ یہ الٰہی ارادہ نہ تھا کہ جسم اور روح جدا ہوں۔ حتیٰ کہ اے اے ہوج نے یہ جان لیا کہ آدم کا جسم پہلے انتہائی لافانی تھا اور وہ اگر وہ کبھی گناہ نہ کرتا تو اُسے کبھی جسمانی موت نہ آتی اور موت اسے کبھی اس کی نافرمانی کی سزا کے طور پر نہ دھمکاتی۔

مذہبی نقطہ نظر سے انسانی جسم کا ارتقاء سے بننا مکمل ناقابل قبول ہے کیونکہ نجات کا منصوبہ دو انسانوں کے درمیان تعلق جوڑتا ہے، پہلے آدم اور آخری آدم۔ پہلا آدم پیدائش کا آدم ہے اور آخری آدم انجیل کا آدم، خداوند یسوع مسیح ہے، جسے پولوس نے پہلے آدم کا جواب کہا۔ دونوں آدم دو اشخاص ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ کھڑے ہیں دونوں کا جسم بھی ہے اور روح بھی اپنے انسانی دستور کے مطابق ہر ایک دوسرے کی عکاسی کرتا ہے اگر متبادل موثر ہو تو ہر صورت جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے آدم پہلے آدم سے ملتا جلتا ہونا چاہیے۔

پہلے انسان کو آخری انسان کی طرح مکمل اصلاح پذیر ہونا چاہیے تھا جو کہ اس موجودہ دنیا کی فطرتی ترتیب کے تحت پیدا ہو، اس سے پہلے کے خالق اس پر پردہ ڈال دے۔ (بھلے ہی انسان خلق ہوا ہو یا بندر سے تبدیل شدہ)

پہلے انسان کو نجات دہندہ کی چھتری تلے آنا چاہیے جیسے کہ پیدا ہونے والے آخری آدمی کو۔ اس طرح پہلا انسان آدم اور اس کے پیچھے اترنے والے یعنی (سب آدم میں) ایک دوسرے سے قطعاً مختلف نہیں ہونے چاہییں۔ صنفِ انسان میں ارتقائی ترقی نجات کے منصوبے کے موافق نہیں ہو سکتی جو کہ ایک ہی (یسوع مسیح) کی موت پر منحصر ہے، جو اس سلسلے میں بہت دیر بعد ظاہر ہوا۔ اگرچہ سینکڑوں ہزاروں یا پھر لاکھوں سال گزر گئے ہوں تو بے شک وہ دیر سے ظاہر ہوا۔ اگر انسان کا ارتقاء سچ ہے تو پھر یہ نجات دہندہ جو ترقی یافتہ انسانی حالت میں ہے اُن انسانوں کا نجات دہندہ نہیں ہو سکتا جو ارتقاء کے آغاز میں ظاہر ہوئے۔

انسان کے بارے میں بائبل کا نقطہ نظر: ایک منفرد اصلاح پذیر مخلوق

انسان خدا کی تخلیق کے طور پر صحائف میں کبھی ایک روحانی مخلوق نہیں ہے، جو صرف جسم پانے کے لیے بنا، انسان نشان الحاق ہے اور روح اور جسم کا امتزاج ہے۔ جسم کے بغیر روح کوئی شخص نہیں۔ روح کے بغیر جسم صرف ایک لاش ہے۔ نئے عہدنامے میں جسم کی منزل اور روح کی منزل کے بارے میں بہت کہا گیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جسم کونسی شکل لے گا اور روح کون سی۔ ہم یقیناً صرف روحیں نہیں ہوں گے۔

مسیح خداوند جب انسان بن گیا تو اس نے ایک تیار شدہ جسم اختیار کر لیا۔ جب وہ مردوں میں سے جی اٹھا تو اپنے جسم کیساتھ جی اٹھا۔ جب وہ واپس آئے گا تو اپنے جسم کے ساتھ واپس آئے گا اور اب بھی وہ بطور انسان آسمان پر ہے کیونکہ اس کا جسم اور روح انسانی ہے۔ یہ کسی طور اس سچائی کا مقابلہ نہیں کرتا، کہ آنے والا انسان جو کچھ اس کے پاس ہے اُسے ترک کر دے گا۔

خداوند، خدا کے ساتھ اور باپ کے برابر ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیونکہ اب خدا اس کے جسم میں پورے اختیار سے رہتا ہے جس نے اس کی شخصیت کو ایک نیا رُخ دیا ہے۔ اس طرح ابن آدم کی شاندار واپسی کی راہ دیکھنا واجب ہے کیونکہ وہ اپنے زندہ کیے ہوئے جسم کیساتھ ظاہر ہوگا۔

ابھی میں نہیں چاہتا کہ اس پر مزید دلیل دوں کیونکہ اسے ہم بعد میں دیکھیں گے۔ میں صرف اس طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ زندہ خدا نے جسم اختیار کر لیا جو کہ ایک سچا اور کھرا انسان تھا۔ اور اس جسم نے انسانی روح کے لیے ذریعہ ترسیل بنا دیا جسے اِس نے اپنے لیے تخلیق کیا۔ یہ جسم اُس مادے کا تھا جو آدم کے جسم جیسا تھا، جسے آدم کی روح اُس کے جسم کے لیے ایک مکمل ٹرانسپورٹ مہیا کرتی تھی۔ صحیح جوانمردی جیسی پہلے آدم کے جسم میں تھی فطرتاً لافانی تھی۔ نتیجتاً ایک ایسے جسم کی ضرورت تھی جو خراب نہ ہو۔ یہ بھی ناقابل فہم ہے کہ خدا کسی جسم میں مجسم ہو سکتا ہے جسے بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ختم ہو جانا ہو۔

پہلے سے موجودہ جلالی خدا فروتن ہو گیا اور انسانی شکل لے لی جو بالکل آدم جیسی تھی جو خدا کے ہاتھ سے بنا تھا۔ یسوع مسیح کی انسانیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے ہمارے نظریے کو سب سے پہلے انسان کے جسم اور روح کے ساتھ زندہ کیا۔ بندر اور انسان کے درمیان مکمل خلاء تھا۔

آدم کی نسل میں انسانی اور حیوانی دنیا کے مابین کوئی درمیانی راستہ نہیں۔ اس نظریے سے پہلے انسان کا جسم منفرد طور پر تخلیق کیا گیا اور اس طرح ایک انسانی سلسلے کو روک دیا گیا۔ یہ خالق کے رہنے کے لیے ایک مناسب اور مکمل گھر تھا، تاہم یہ خالق سے الگ تھلگ ایک نئی چیز تھی۔ اگرچہ اس میں بہت سے مشترکہ افعال تھے جیسے کہ خدوخال میں مماثلت کیونکہ دنیا جس میں انسان کو متعارف کرایا جانا تھا، میں جانوروں کو بھی اپنے افعال کیمطابق بنایا گیا تھا دونوں ایک ہی ماحول میں رہتے تھے، اور دونوں کا جسم بھی تھا۔

یہ نئی مخلوق پچھلی مخلوقات کے برعکس کئی طرح سے منفرد تھی اور دو طرح سے سب سے برتر۔

ا۔ (انسان) روحانی طور پر گر بھی سکتا تھا اور نجات بھی پا سکتا تھا۔

۲۔ جسمانی لحاظ سے وہ مر سکتا تھا لیکن ایسا کرنا ضروری نہ تھا۔

اس کے علاوہ انسان کی نجات صرف اسی طور ممکن تھی کیونکہ اس کی روح اور جسم دونوں خدا کے آئین کے تحت تخلیق ہوئے، دونوں میں الٰہی مداخلت شامل تھی اور یہ پہلے اور آخری دونوں آدموں کے لیے سچ تھا۔

بطور انسان یسوع کی ہستی میں انسانیت کی نجات موت کے ذریعے محفوظ کی گئی۔ انسانی روح اور جسم کی موت، اگرچہ کوئی بھی موت انسان کے لیے قدرتی نہیں بلکہ وراثتی وجوہات سے اٹل تھی۔ یسوع مسیح نے دونوں اموات اپنی مرضی سے تجربہ کیں۔ تاہم پہلے آدم کا جسم اگر غیر انسانی آباء سے اخذ کیا گیا تو پھر اس کے لیے موت اٹل ہو جائے گی۔ پھر ہر کسی کے لیے موت نافرمانی کی سزا کے لیے نہیں بلکہ صرف ادھوری موت ہوگی۔ اسی طرح سے اگر نجات دہندہ کو انسانی جسم ملا تو اس ارتقائی نقطہ نظر سے اُسے بھی اسی طرح ادھوری موت آنی چاہیے، یہ متبادل نہیں ہو سکتی۔

نجات کے منصوبہ کے فیصلے کیمطابق دوسرے آدم کا جسم بالکل پہلے جیسا ہونا چاہیے کیونکہ وہ اسی سے پیدا ہوا اور اسے بھی موت آسکتی تھی۔ لیکن اسے ایسا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس مشابہت کے بغیر متبادل نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ بہت مختصر ضروریات آدم کے جسم کو حیوانی نسل سے ممکنہ طور پر خارج کر دیتی ہیں۔ اگر یہ ضروریات پوری نہیں کی جاتیں تو انسانی جسم اور روح کی نجات ممکن نہیں تھی۔ یہ منطق مجبور کرتی ہے اور انسان کے ارتقائی آغاز کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑتی۔

ضرور انسان کو شروع ہی سے جسم مہیا تھا، کہ جب اسے گرا دیا گیا تو نجات دہندہ خود انسان بن کر اسے واپس کر سکتا تھا۔ کیونکہ ہمارا متبادل حقیقتاً ایک انسان بھی تھا اور اس کو موت بھی ضروری نہ تھی۔ اس کے برعکس اس کی موت انسان کے لیے متبادل نہ تھی۔

اس لیے یہ کہنا پڑتا ہے کہ کس مقام پر ارتقائی انسانی سلسلے نے انسان کی شناخت کو ابھارا۔ جب تک کہ نجات دہندہ اس طرح کا روح اور جسم اختیار کر کے ایک حقیقی نمائندہ نہ ہوا۔ جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ نجات دہندہ خود خدا تھا۔ جس نے اس کائنات کو خلق کیا تو کیا یہ مانا جا سکتا ہے، کہ وہ ایسی شکل اختیار کرے جو انسان سے کم تر ہو۔ آیئے کنگ جیمز کے انوکھے الفاظ دیکھتے ہیں (۱۔تواریخ 22:5) ''اور داؤد نے کہا کہ میرا بیٹا سلیمان لڑکا اور ناتجربہ کار ہے اور ضرور ہے کہ وہ گھر جو خداوند کے لیے بنایا جائے نہایت عظیم الشان ہو اور سب ملکوں میں اس کا نام اور شہرت ہو۔ سو میں اس کے لیے تیاری کرونگا۔ چنانچہ داؤد نے اپنے مرنے سے پہلے بہت تیاری کی۔''

اصل میں ہمیں اپنے آپ کو یقیناً غیر حمائتی طور پر پہلے آدم سے پرکھنا چاہیے۔ اس کے جسم کی اہمیت یوں تھی کہ وہ تقریباً 1000 سال زندہ رہا۔ باوجود اس کے کہ وہ پہلے ہی ایک تباہ کن زوال جھیل رہا تھا جو اس کی پرانی شان و شوکت کو آہستہ آہستہ لوٹ رہا تھا۔ کوئی بھی لاکھوں سال پرانی، چھوٹے دماغ والی نصف بندر مخلوق، جیسے کہ مشہور ''لوسی'' (ایک بہت پرانی کھوپڑی) ایک آدم کا حوالہ نہ ہو سکتی تھی۔ خاص طور آدم کے بعد آنے والی اُس کی پہلی نسل کے نظریے سے جس نے شہری زندگی کو ترقی دی اور ساتویں نسل نے زراعت، دھات کاری، اور ہوا دار اور تار دار آلات بنا کر فنِ موسیقی کو ترقی دی۔ پہلے آدم کا ایک وفادار نمائندہ ہونے کے طور پر دوسرا آدم جو بلاشبہ پہلے ہی سے مکرم تھا ہمارے درمیان انسان بن کر رہا کیونکہ اُسے ابن آدم کا خطاب ملا تھا۔ اس نے انسانی تاریخ پر اپنے رُتبے کیوجہ سے

تبدیلی کی مہر ثبت کردی، اگر چہ جسمانی طور سے اس نے انھیں خدا سے ڈرایا۔

ہم جانتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا کیا۔ اس نے ایسا اس لیے کیا کہ ایک دن وہ خود ہمارے درمیان انسان کی شکل میں آئے۔ اس نے کوئی تشدد نہ کیا اور اپنی سب شان وشوکت جس کیطرف اسے واپس لوٹ جانا تھا۔ اور آسمان پر جا کر ہی اسے یہ شان و شوکت واپس پانا تھی۔ اس نے اپنا انسانی جسم ایک طرف نہیں رکھا کیونکہ اس کے بنا وہ بے مول تھا۔ وہ اسے ساتھ ہی لیا گیا، بے شک اس کو انسانی جسم ہمیشہ کے لیے ملا اسی طرح وہ آسمان پر چڑھا اور اسی طرح واپس آئے گا۔

انسانی جسم ایک منفرد ذریعہ ہے اور اس میں تقریباً ناقابل یقین شان وشوکت کا وعدہ ہے یہ خدا کی خصوصی تخلیق ہے، نہ کہ کسی ان دیکھے عمل کی ذیلی پیداوار۔ جیسا ہمیں ماننے کو کہا جارہا ہے۔

اشیاء کی ترکیب میں ہم انسانی جسم کو انتہائی ثانوی مقام تک گرانے کے جال میں آسانی سے پھنس گئے۔ اس سے یہ نتائج نکلے کہ اس کی بنیاد ارتقاء سے ہے یا تخلیق سے۔ ہمیں بتایا گیا کہ روح کی نجات اس کے نئے سرے سے پیدا ہونے میں ہے۔ جسم کی نجات کم اہم لگتی ہے جب انسانی جسم ٹھیک ٹھاک کام کرتا ہے۔ پھر بھی ہمیں اپنی زندگی کو روحانی یا جسمانی طور پر نہ صرف نئے آسمان پر بلکہ نئی زمین پر ہمیشہ کے لیے جاری رکھنا ہے۔ ایک زمین جو کبھی پرانی نہ ہوگی ایک ایسے جسم کا مطالبہ کرتی ہے جو کبھی پرانا نہ ہو۔

اصل میں یہ ہمارے اپنے جسم کی نجات ہے، جو بلحاظ ایمان کسی بھی دوسرے مذہب اور مسیحی مقام میں فرق ڈالتی ہے۔ یہ ایک طرح کا جی اٹھنا تھا، جو ایتھنز میں پولوس کے یونانی سامعین کے لیے ناقابل یقین ثابت ہوا۔ انھوں نے پوچھا ''کس نے ایسی بات سنی؟'' تاہم آج بھی ایسا لگتا ہے کہ بہت سے مسیحیوں نے ایسی بات نہیں سنی۔

منصوبہ نجات میں جسم کی انتہائی اہمیت

یہ جسم کی نجات ہے اور اس پر میں آنے والے ابواب میں بات کرنا چاہوں گا۔ مجھے پوری امید ہے کہ لوگ زیادہ بہتر مذہبی معلومات رکھتے ہیں۔ وہ اس مسئلے کو سمجھ جائیں گے اور جو میں نے کہا اس سے بھی زیادہ کریں گے۔ جب ایسا ہوگا تو میری پیش گوئی ہے کہ ہم اچانک تخلیق یا ارتقاء کی بحث میں ایک چھوڑے ہوئے رُخ کو پہچان لیں گے۔ وہ رخ جو صحائف کی نمائندگی کرتا ہے اور ہمارے ایمان کا دوسرا نصف حصہ ہے۔ جسم کی نجات اتنی ہی اہم ہے جتنی روح کی۔ لیکن نظریہ ارتقاء اس سے انکار کرتا ہے اور اسے صرف حیوانی جسم بتاتا ہے جس کی منزل جی اٹھنا نہیں بلکہ خاک ہو جانا ہے۔

اس بات پر اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ میں علم سے بہت دور ہوں اور میں اصل الفاظ کے منطقی جائزے کیطرف جھکا ہوا ہوں اور اس طرح ان کی روح کو تباہ کر رہا ہوں لیکن میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جب تک ہمیں نوشتوں سے بحث کا حوالہ نہ ملے ہمیں الفاظ کو اپنے آغاز کی طرح ان کے ظاہر سے ہی دیکھنا ہے۔ دوسری صورت میں ہمیں اس بہانے کو چھوڑنا پڑے گا کہ سب معاملات میں ہمارے سوچنے کا معیار بائبل ہے جہاں الہام ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

ہم اپنی عقل سے کوئی انجیلی نظریہ نہیں بنا سکتے جو کہ بائبل کے مطابق پورا اترتا ہو۔ اگر ہم پریشان کن الفاظ کی معنویت نہیں دیکھتے

تو ہم کسی تحریر کو روحانی انداز سے یا شاعری کی طرح پڑھنے کی مشق کرتے ہیں۔ہم صحائف میں حکایات کی شناخت ہمیشہ اسی طرح کرتے ہیں۔شاعری کو شاعری کے طور پر ہی رکھا گیا جیسا کہ زبوروں میں،تماثیل میں اور عام بول چال کی اصطلاحات میں۔مثلاً ''طلوع آفتاب'' کی واضح طور پر اور آسانی سے شناخت کی جاسکتی ہے۔پیدائش کے پہلے ابواب شاعری کے طور پر نہیں لکھے گئے،ماسوائے پیدائش 4:23 کے جسے اُس کی اصلی حالت میں رکھا گیا ہے۔اسی طرح سے زبوروں کی تحریر رکھی گئی ہے جو ایک اشارہ ہے کہ یہ تحریر شاعری نہیں ہے۔

اس لیے میں کلام کے الفاظ کو سنجیدگی سے لینے کے لیے کوئی معذارت نہیں کروں گا۔اور اس حیران کن کتاب کو پچاس سال سے زائد پڑھنے کے بعد میں اس بات کا قائل ہوں کہ کوئی بھی جو اسے پڑھے گا اس کی سچائی پر حیران نہیں ہوگا جس نے غلطیوں کے خلاف سچ کی باڑ لگا دی ہے۔اِدھر اُدھر ترجمے کے مسائل کے باوجود (کبھی کبھی تشریح پر اٹھتے ہوئے سوالوں کے مسائل) میں نہیں مانتا کہ کسی بھی پیرے میں جس سے میں نے مقالہ تعمیر کیا اس طرح کی کوئی بے یقینی پائی جاتی ہو۔

مثال کے طور کوئی آدم میں سے حوا کی تشکیل کی قدر پر بھی اعتراض کرسکتا ہے لیکن اگر بحث کے طور پر وہ وقتی طور پر اس امکان کو مان بھی جائے تو بھی میرا خیال ہے وہ جلد ہی غور کریگا کہ زیادہ ضروری کیا ہے؟ اس کی ضروریات یا نجات کے دانش مندانہ منصوبے کا تحفظ۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر موجودہ انجیلی نظریات نے خطاب نہیں کیا اور اس کیوجہ کلام کے الفاظ کو سنجیدگی سے جوڑنے میں ناکامی ہے۔

ہم نے دیر تک واضح اور انتہائی ترقی یافتہ روحانی نظریات کا لطف اٹھایا ہے۔اب وقت ہے کہ ایک متوازن جسمانی نظریہ پیدا کیا جائے۔جب ایسا ہوگا تو میرا خیال ہے کہ موجودہ مقدمے کے بنیادی مسائل بہت نمایاں ہو جائیں گے۔ اگر انسانی جسم بھلے ہی ایک تخلیص شدہ حیوانی جسم ہو تو بھی منصوبہ نجات نے انسانی جسم کے بارے میں جو کچھ کہا ہے بے معنی ہو جاتا ہے۔انسان کے جسم کی بنیاد ارتقاء سے روح کی براہ راست مقدس تخلیق مان کر ہم انسان کی انسانیت کو تباہ کر چکے ہیں۔اس طرح پہلے آدم کے بعد آنے والے سبھوں کے لیے دی گئی مددگار اور متبادل قربانی بھی کچھ سمجھ نہیں آتی۔

☆☆☆

پہلا حصہ

انسانی جسم کا مخصوص نمونہ

مذہب کے متعلق کسی بھی اوسط سائنس دان کی غفلت
بالکل برابر نہیں ماسوائے سائنسی معاملاتِ غفلت کے

بنی نوع انسان کے لیے بنایا گیا

کوئی جسم = کوئی نہیں

ایک خاصے معروف ماہر آثارِ حیات جو کہ انسانی ارتقاء پر یقین رکھنے والے امریکیوں میں سے کافی ممتاز تھا، نے 1952 میں لکھا: ''انسان کی آمد کا کوئی اندازہ نہ تھا اُس کا کوئی منصوبہ نہ تھا اور نہ ہی کوئی آسمانی مقصد۔ وہ ایک طویل، لاشعوری، غیر ذاتی اور مادی عمل کی منفرد پیداوار ہے جو اس کے دماغ میں نہ تھا۔'' اُسے منصوبہ کر کے نہیں بنایا گیا۔

یہی خیال پروفیسر جارج گے لارڈ سمپسن کا تھا، لیکن سمپسن غلط تھا۔ اس دنیا میں انسانی جسم کا ظہور کوئی حادثہ نہ تھا، نوشتہ کہتا ہے کہ انسان کو جان بوجھ کر سوچا گیا اور خدا کے تصور میں تخلیق کیا گیا۔ اس مقدس مشاورت کے بعد جس میں خدا نے کہا:

> ''آؤ ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی مانند بنائیں، اور وہ سمندر کی مچھلیوں اور آسمان کے پرندوں اور چوپایوں اور کل روئے زمین اور سب کیڑے مکوڑوں پر جو زمین پر رینگتے ہیں حکومت کرے۔ اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ خدا کی صورت پر اُس نے اس کو پیدا کیا''۔ (پیدائش 1:26-27)

اس طرح انسان کے تعارف کا انجیلی نظریہ بہت حد تک اُسے منصوبے کا نتیجہ بتاتا ہے۔

انسان کا مادی نظریہ اتنا محدود کیوں ہے؟

برٹرینڈ رسل (1872-1970) ایک انگریز ریاضی دان اور فلاسفر اپنے بہت سے دوسرے ہم عصروں کی طرح سمپسن کے بھیانک حیاتی نظریہ کو واضح طور پر انسانی منزل بتاتا ہے: ''زمانوں کی تمام تر محنت، عقیدت، وجدان اور انسانی خصلت کا عروج شمسی نظام کی موت کیساتھ ہی مٹ جائیگا۔ کوئی فلسفہ ان عقائد کو رد نہیں کر سکتا۔''

یہ ایک براہ راست اور یکساں مادیت کا منطقی نتیجہ ہے جو انسان کو لاکھوں جسمانی عوامل میں سے ایک عمل کے طور پر دیکھتا ہے جسے اشیا کی ترکیب میں نہ زیادہ اہمیت ہے نہ کم۔ یہ سب ایک خاص حادثے کی ذیلی پیداوار ہیں۔

کائنات اپنے سرد ہونے کا عمل جاری رکھے گی جیسا کہ یہ کروڑوں سالوں سے کر رہی ہے حتیٰ کہ اس کو اس کے اجزاء کے ساتھ ہی فراموش کر دیا جائے گا۔ اسے اسطرح بھلا دیا جائے گا، جیسے شعور نے کبھی اسے سوچا ہی نہ ہو۔ یہ سب ختم ہو جائیگا جیسے کوئی دیا سلائی لمحہ بھر میں آگ لگا کر یوں ختم کر دیتی ہے جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ صرف سردی اور خاموشی باقی رہ جائے گی۔

1965 کے نوبل انعام یافتہ اور عالمی شہرت یافتہ فرانسیسی سائنس دان جیکوئز مانوڈ کی اہلیت کے بغیر ہی اس نظریے کو تسلیم کر لیا گیا جس نے اس معاملے کو ان تلخ شرائط کیساتھ بیان کیا۔

آخر کار انسان جان گیا کہ وہ اس وسیع کائنات میں تنہا ہے جس میں وہ اتفاقاً ابھر آیا۔ اور اس کے پاس اس منجمد کائنات میں تنہائی کے شدید احساس کے سوا کچھ نہ بچا۔ انسانی بقاء کی دلسوز اداسی، تنہائی اور بے معنویت فلسفیانہ آزمائش کے آخر پر واقع ہوتی ہے۔ یہ مایوسی کا فلسفہ ہے اس طرح یہ ایک ارتقائی دنیا کا نظریہ ہے جسے تسلسل سے بنایا گیا اور منطقی نتیجے کو پہنچا دیا گیا۔

گریشم میکلن نے صحیح مشاہدہ کیا کہ سوچ کا کوئی بھی انداز ترقی پا کر اپنے حتمی نتیجے کو پہنچ سکتا ہے اگر اس کی منطق ظالمانہ ہے، ان علماء کا نتیجہ اپنے ہی حق میں بولتا ہے۔ ذہین وفطین لوگوں کی طرف سے دیئے گئے ایسے تاثرات ہر اس فلسفے کو غلط قرار دیتے ہیں۔ جو کہ انسان کو غیر اہم بتاتے ہیں۔ ارتقائی دنیا میں افراد کی اپنے اعمال اور فنون کے باوجود کوئی ذاتی حیثیت نہیں۔ وہ ایک شخص کے طور پر بالکل رد کر دیا گیا۔

اس المیہ نظریے کے مطابق انسان صرف ایک جسم، ایک چیز اور ایک جاندار ہے وہ کسی مشین سے زیادہ اہم نہیں ہے جو جلد ہی خراب ہو جائیگی اور کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دی جائیگی۔

مسیحی لوگ ایک منفرد انداز میں اس طرح کے انسان کو رد کرتے ہیں۔ ہم نے انسان کی روحانی ترقی پر زیادہ زور دیا اور جسم کو کم اہمیت دی اور اس طرح اُسے کمزور کیا ہے۔ ہم نے انسان کو ایک اہم فرشتہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایک روحانی انسان جو جسم پانے کے لیے واقع ہوا۔ اس جسم کو ہم باخوشی نظر انداز کر دیں گے۔ اس اثر سے روح اور جسم الگ الگ ہو جاتے ہیں جنہیں آج تک الگ نہیں کیا جا سکا۔ بہت سے لوگ اس بات کو اہمیت نہیں دیتے کہ جسم کہاں سے آیا ہے۔ انھوں نے انسانی جسم کی بنیاد کو نظر انداز کر دیا جو یہ مانتے تھے کہ انسان فطرت سے ہی روحانی پہلو رکھتا ہے۔ کافی حد تک ہم نے ''دشمن'' کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ صرف جسم کا تفکر کر کے ہم نے مشترکہ طور پر انسان کو بطور انسان فنا کر دیا ہے۔

پیدائش سے لیکر مکاشفہ تک جسم کی انتہائی اہمیت کو ہم اپنے ایمان کا حصہ بنانے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ یہ کسی بھی قسم کے جسم کی ملکیت کی بات نہیں کیونکہ جسم تو تمام جانور اور پودے بھی رکھتے ہیں بلکہ انسانی جسم کی ہے جو کہ ایک لاثانی روح کا لاثانی گھر ہے۔ اور یہ دونوں خدا ہی کی تخلیق ہیں۔

یہ جسم شخصی طور پر ہماری شناخت کا آدھا حصہ ہے اس دنیا کو اس کی بقاء اور تسلسل کے لیے بنایا گیا جیسے کہ یسعیاہ 5:18 میں ''کیونکہ خداوند جس نے آسمان پیدا کیے وہی خدا ہے اُسی نے زمین بنائی اور تیار کی اسی نے اسے قائم کیا، اُس نے اسے عبث پیدا نہیں کیا بلکہ اس کو آبادی کے لیے آراستہ کیا۔'' اس میں حیرانی نہیں کہ علما فلکیات نے زمین کو بیرونی خلاء کے اندھیروں میں ایک نگینے کے طور پر دیکھا اور وہ اس سے بہت متاثر ہوئے۔ انھیں یہ ایک خوبصورت گھر کی مانند لگی جیسے کہ دور سے دیکھنے پر ہمیشہ لگتا ہے اور قریب سے جائزہ لینے پر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

قرون وسطیٰ کے سینٹ وکٹر کے ماہر دین ہف (1096-1141) نے اشیاء کے قریبی باہمی تعلق کو اس واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ ''روح کو خدا کے لیے بنایا گیا، جسم کو روح کے لیے اور دنیا کو جسم کے لیے: اس لیے روح خدا کی، جسم روح کا اور دنیا جسم کی تابع

ہوسکتی ہے''۔

اب معانی کے فلسفے کا خاکہ موجود ہے جسم روح کے ذریعے خدا اور جسمانی دنیا کے درمیان باہمی تعلق تشکیل دیتا ہے۔اس نتیجے کو مکمل کرنے کے لیے ہف اگر مزید یہ کہتا تو ہمیں سمجھ آجاتی یعنی'' کائنات اس دنیا کے لیے ہے''جس طرح آغاز سے ظاہر ہوئی۔مکاشفہ کی کتاب 4:11 میں اس کی وجہ بتاتی ہے۔''کیونکہ تو ہی نے سب چیزیں پیدا کیں اور وہ تیری ہی مرضی سے تھیں اور پیدا ہوئیں''۔

یہ بات زیادہ دلچسپ ہے کہ لفظ''تمام اشیاء'' کا مطلب صرف ہر چیز نہیں بلکہ محاورتاً کائنات ہے۔جسے یونانی (ٹا پانٹا) بھی اہمیت دیتا ہے۔کائنات اور انسان جس کے لیے اسے تخلیق کیا گیا خدا کی خوشی کے لیے بنائے گئے اور اب بھی اس کی خوشی سے ہی موجود ہیں، باوجود اس کے انسان اس کیساتھ کیا کر رہا ہے۔

تاہم یہ موجودہ ترتیب عارضی ہے اسے مقررہ وقت میں ایک نئی کائنات کیساتھ بدلا جانا ہے نہ صرف نئے آسمان کے ذریعے بلکہ نئی زمین کے ذریعے بھی یہ تبدیلی مستقل ہے۔کلام خدا ہمیں اس حقیقت کی مکمل یقین دہانی کرواتا ہے۔

اگر جوہر انسانی کی فطرت صرف روحانی نہیں بلکہ جسمانی بھی ہے تو انسانی جسم کے تسلسل کو نئے آسمان اور نئی زمین کے وعدے کیساتھ بامعانی بنایا جاسکتا ہے۔اس وعدے کیساتھ ہمیں یقین ہے کی وہاں ہمارے لیے ایک نیا گھر مخصوص ہے اور ہماری روح کے لیے نیا جسم''جوابدی ہوگا''۔(2 کرنتھیوں 5:1)

اس نئی کائنات میں ہم روحانی مخلوق ہیں جو ہمارا ابدی گھر ہے اس طرح ہم انسان کا مستقبل ایک روحانی مخلوق کے طور پر دیکھتے ہیں۔روحانیت ایک بے اثر تفکر بن جاتا ہے پھر بھی کلام ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیں اس دنیا کو اس ابدی کائنات کا عکس سمجھنا چاہیے جس کے ساتھ اسے تبدیل کیا جانا ہے اور یہ ابدی کائنات کسی ایسی چیز پہ مشتمل ہے جس کا نام زمین ہے۔جو ہمارے نئے جسموں کے لیے موزوں ہوگی۔ہم بادلوں پر اڑنے والے بھوت نہیں ہوں گے۔فرشتوں کے برعکس ہم اجسام کیساتھ حقیقی لوگ ہوں گے۔اسی طرح جیسے ہمارا یسوع جسم کیساتھ جی اٹھا۔اور اس نے اس بات سے مکمل انکار کیا کہ اس کا جسم کسی کا سایہ ہے۔

انسانوں کو جسم کی ضرورت کیوں ہے؟

انسان کے لیے جسم کیوں ضروری ہے؟

فرشتے جسم کے بغیر بھی اچھی طرح کام کرتے ہیں پھر ہم کیوں نہیں کرسکتے ہیں؟

انسان کا جسم ہونے کی بہت سی وجوہات ہیں۔اگرچہ یہ واضح ہے کہ خدا فرشتے پیدا کرسکتا ہے جن کی موجودگی بنا جسم کے بھی حقیقت ہے۔اس لیے خدا کو ضرورت نہ تھی کہ وہ انسان کی اس طرح تخلیق کرے کہ اس کا جسم بھی ہو، پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟میرے نزدیک اس کی پانچ وجوہات ہیں۔

ا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ خدا نے ایک کائنات تخلیق کی جو جسمانی ہے ایسا کرنے کے لیے اس کے پاس بھی کوئی وجہ ہوگی۔لیکن میرا خیال ہے یہ اس کے مقصد کے لیے موزوں تھا، ہم ایک قدم آگے جا کر کہہ سکتے ہیں کہ ازل سے ہی اس کا ارادہ تھا کہ وہ اس پر کوئی انچارج

مقرر کر دے یہ نہ صرف زمین کا بلکہ ہر چیز کا انچارج تھا۔ یہ انسان تھا جو زمین کیساتھ اپنی ذمہ داری شروع کر رہا تھا لیکن جسم کے بغیر ہم کوئی ذمہ داری کیسے لے سکتے ہیں۔ ہم جو کچھ کرتے وہ دکھائی نہ دیتا۔ اس وجہ سے خدا نے انسان کو جسم سے سنوارا۔

ایک جسم جس میں ہاتھ، آنکھیں، کان، پاؤں، دماغ اور بہت کچھ تھا۔ اب بھی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہ اس ذمہ داری کو کامیابی سے نبھائے، کیونکہ وہ اپنے منشور کی تعمیل کرنے یا نہ کرنے پر آزاد تھا۔ لیکن یہ واضح تھا کہ جسمانی دنیا پر کسی بھی قسم کے راج کے لیے جسمانی ساز و سامان کی ضرورت تھی۔ بلاشبہ اس جسمانی دنیا میں کام کرنے کے لیے جب فرشتوں کو بھی پکارا گیا تو انھیں بھی عارضی تجسیم کی ضرورت پڑی۔ شاید ہمیشہ نہیں لیکن کچھ خاص موقعوں پر، اسے ہم بعد میں دیکھیں گے۔

مختصراً یہ کہ انسان اس جسمانی دنیا پر صرف اپنی جسمانی خصوصیات کے تحت ہی عمل پیرا ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اس ذمے داری کو پورا کرنے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کے پاس ایک اعلیٰ نمونے کا غیر معمولی جسم ہے۔ واضح ہے کہ جب میرا ارادہ ہوتا ہے تبھی میرے ہاتھ حرکت کرتے ہیں۔ اصل میں ہم نہیں جانتے کہ یہ کیسے ہوتا ہے لیکن یہ ہمارے ارادے کا ہی عمل ہے۔ اور اس قابلیت کے ساتھ ہم اچھے یا برے مادی کاموں کو سلیقے سے کر لیتے ہیں اور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جسم ارادے اور دنیا کے درمیان ایک ثالث ہے۔

مثال کے طور پر میں صرف ارادے سے گھڑی کی سوئیوں کو بہار میں ایک گھنٹہ آگے یا خزاں میں ایک گھنٹہ پیچھے نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ اسطرح سے ہوتا ہے کہ میرے پاؤں مجھے گھڑی تک لے جاتے ہیں اور میرے ہاتھ روشن دن بچانے کے لیے اس ترتیب کو تبدیل کرنے کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ بے شک ہم جسمانی دنیا پر خلاء کو تسخیر کرنے تک عمل کر سکتے ہیں۔ اور یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ہمارے پاس ہمارا جسم ایک ذاتی اور موثر آلے کے طور پر ہے اور یہ بہت اچھی وجہ ہے کہ ہمیں جسم دیئے گے۔

۲۔ اس مادی دنیا کی حکومت کو تمام کائنات یا کم از کم نئی کائنات تک لیجانے کے لیے ہمیں کسی نہ کسی طرح اپنی تعداد کو بڑھانا ہے۔ یہ اضافہ صرف دو طرح سے حاصل کیا جا سکتا ہے: براہ راست تخلیق سے یا افزائش نسل سے۔

فرض کیا اسے تخلیق کے ذریعے کیا جاتا ہے، فرشتے الگ تخلیق ہیں۔ تھامس ایکوینس کے مشاہدے کے مطابق ان میں سے ہر ایک الگ تخلیق اور الگ نسل ہے۔ ہر کوئی صرف اپنی نمائندگی کرتا ہے ان کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے۔ کوئی فرشتہ کسی دوسرے فرشتے کا باپ نہیں ہے۔ وہ شادی کر کے اور بچے پیدا کر کے نسل نہیں بڑھاتے۔

لہٰذا خدا کو ایک الگ مخلوق تخلیق کرنا پڑی جو ان چھوٹے چھوٹے کاموں کو کرتے ہوئے اس دنیا پر حکومت کرے اور آگے بڑھے۔

لیکن اب ایک مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے، الٰہی منصوبے میں عاملین کو بھلے وہ صرف ارواح ہوں یا مجسوم اخلاقی آزادی کے ساتھ پیدا کیا گیا تھا۔ یہ بات حقیقت سے عیاں ہے کہ وہ فرشتے روبوٹ نہیں ہیں وہ کچھ کام آزادی سے کرتے ہیں تو کچھ میں اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ فرشتوں کی کچھ تعداد نافرمان تھی اور انھیں گرا دیا گیا اور ان کی ناکامی کی سزا دی گئی لیکن پھر سوال اٹھتا ہے کہ اگر ان کو سزا دی جا سکتی ہے تو کیا ان کی شفاعت بھی ہو سکتی ہے؟

ہم جتنی دور تک بھی دیکھ سکتے ہیں ان کی شفاعت نہیں ہو سکتی، کیوں نہیں؟ اس لیے کہ اگر ہم کلام الٰہی کو انسانوں یا فرشتوں کی نجات

کے معاملے میں راہ نما مانتے ہیں ۔تو پھر نجات کے لیے ایک متبادل نجات دہندہ چاہیے اور نجات دہندہ اپنی شکل اور فطرت میں ان اشیاء جیسا ہی ہونا چاہیے جن کی نجات ہونی چاہیے ۔لیکن اگر ہر ایک فرشتہ اپنی تخلیقی حقیقت سے ایک الگ نسل ہے تو پھر یوں لگتا ہے کہ صرف ایک نجات دہندہ نہیں بلکہ ہزاروں یا شاید لاکھوں نجات دہندہ چاہییں یعنی ہر ایک فرشتے کے لیے الگ الگ۔

کوئی ''پہلا فرشتہ'' نہیں ہوسکتا جس کی گراوٹ میں سب کو ملوث کیا گیا تا کہ ان سب کو متحد کر کے ایک خاندان کے افراد کے طور پر نجات دی جا سکے کیونکہ ان کی تعداد کسی واحد باپ فرشتہ کی نسل سے نہیں بڑھی جیسے کہ واحد ''باپ آدم'' کو حوالے سے ۔نجات کا منصوبہ جس طرح انسانوں کے لیے کام کرتا ہے اُسی اصول سے فرشتوں کے لیے کام نہیں کر سکتا ۔جیسا کہ ملاکی نبی نے لکھا ''کیا ہم سب کا ایک ہی باپ نہیں'' ملاکی 2:10 اور جیسے پولوس پھر اعمال 17:26 میں تصدیق کرتا ہے، ''اور اس نے ایک ہی اصل سے آدمیوں کی ہر ایک قوم تمام روئے زمین پر رہنے کے لیے پیدا کی۔'' ایک اکلوتا نجات دہندہ جو کہ دوسرے آدم کی نمائندگی کرتا ہے انسان کی تمام نسلوں کا نجات دہندہ ہوسکتا ہے لیکن فرشتوں کے حوالے سے ایسی کوئی صورتحال ممکن نہیں ۔

منصوبہ نجات کی روح اور کسی دوسرے کے لیے متبادل پیشوا کو صرف ایک ہی طرح کی نسل پر لاگو کیا جا سکتا ہے ۔فرشتوں کی نجات کے لیے جو کہ ایک خاندان تشکیل نہیں دیتے اتنے ہی نجات دہندہ چاہییں جتنے فرشتے زمین پر گرائے گے ہیں ۔لہٰذا مادی کائنات کی مقررہ حکومت کو اخلاقی عاملین کے بغیر تشکیل دینا تھا جو کہ خطا کار تھے اور انھیں ایک نجات دہندہ درکار تھا ۔تو پھر ایک ہی قابل فہم طریقہ رہ جاتا تھا کہ ان کی تعداد میں اضافہ براہ راست تخلیق سے نہیں بلکہ ایک ہی نسلی سردار آدم کی تولید سے ہو ۔تولید کے لیے جسم ہونا ضروری ہے اس لیے اگر انسان اخلاقی طور پر آزاد تھا تو وہ قابل نجات بھی تھا ۔اور قابل نجات ہونے کے لیے ضروری تھا کہ اس کی افزائش تولید سے ہو اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کا جسم ہو۔

۳۔ ایک تیسرا تصور بھی ہے ۔کلام سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ فرشتے بڑھتے ہیں ۔وہ اپنا آغاز دودھ پیتے فرشتوں سے بالغ فرشتوں تک نہیں کرتے کیونکہ وہ ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جو ہماری خلاء اور وقت کی دنیاؤں سے باہر ہے ۔اس لیے وہ ہماری طرح نہ تو جسامت میں بڑھتے ہیں اور نہ ہی وقت کے ساتھ بالغ ہوتے ہیں۔

فرشتے صرف مقام رکھتے ہیں جگہ نہیں گھیرتے ۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر چہ ان کا مقام ایک جیسا ہے پھر بھی کوئی سے دو فرشتے ایک دوسرے سے تعلق نہیں رکھ سکتے اور اس طرح سے ان کی شناخت ہمیں پریشان کرتی ہے ۔چونکہ وہ جگہ نہیں گھیرتے اس لیے ایک مقام تک جانے کے لیے وہ ایک دوسرے کے آڑے نہیں آتے ان کا گذر فوراً ہو جاتا ہے ۔یہ صورتحال کسی سائنس دان کے لیے بھی نا قابل تصور ہے ۔جدید مقداری نظریے کے مطابق توانائی کا مرکز کچھ اجزاء بظاہر اسی انداز میں مقام بدلتے دکھائی دیتے ہیں ۔ان اجزاء کی سمتیں نہیں ہیں لہٰذا انھیں اُن مقامات کے درمیان جو وہ گھیرتے ہیں گزرنا نہیں پڑتا ۔توانائی کو ایک سطح سے دوسری سطح تک جانے کے لیے وقت نہیں لگتا کیونکہ یہ اجزاء جگہ نہیں گھیرتے (حرکت کے علاوہ اس بات کو کسی اور انداز سے پیش کرنا مشکل ہے)۔

لہٰذا نہ تو فرشتے نومولود ہوتے ہیں، نہ شیر خوار، نہ بالغ اور نہ بوڑھے ۔اُن کی ابدی موجودگی کے تحت ہمیں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ

انھیں بالغ حالت میں ہی تخلیق کی گیا ہے۔بالغ ہونے کووقت لگتا ہے اور بلوغت کا عمل عمر پر منحصر ہے۔ان میں تعمیرِ کردار جیسی کوئی چیز نہیں اگر چہ کچھ فرشتوں کو اچانک بدکرداری کی وجہ سے نیچے پھینک دیا گیا۔

بے شک یہ خدا کی مرضی تھی کہ اس کائنات کے حکمران کے طور پر انسان کا کردار یہ ہو کہ وہ عمل بلوغت کے ذریعے افزائش کرے۔ یہ ہمارا جسمانی دنیا سے اور سب انسانوں کا آپس میں ایک جسمانی تعلق ہے جس کے نتیجے میں مقدسین تکمیل پائی۔اس باہمی تعلق کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے پاس ایک بالغ جسم اور بالغ روح ہو۔

عمل بلوغت کے لیے اس دنیا سے باہمی تعلق بہت ضروری ہے۔حتیٰ کہ مسیح کو بھی اس عمل کے لیے بلایا گیا اور بالغ ہونے پر اس کو اس دنیا سے نکالا نہیں گیا۔اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم دوسرے مسیحیوں کے ساتھ نہ صرف روحانی بلکہ جسمانی تعلق کو بھی فراموش نہ کریں۔ اگر چہ کبھی کبھی حالات مشروط ہو جاتے ہیں پھر بھی یہ اچھی بات نہیں کہ انسان تنہا رہے۔

مختصر یہ کہ ہمارے تعلقات دوسری اشیاء سے بھی ہیں اور لوگوں سے بھی،ضروری ہے کہ یہ تعلقات جسمانی بھی ہوں اور روحانی بھی۔ جب ہم لوگوں سے ربط کی بات کرتے ہیں تو غیر محسوس طور پر ہم اس کے عملی اظہار کی اہمیت کو تسلیم کر لیتے ہیں۔تجسیم کے بغیر بظاہر ہم اس طرح مکمل نہیں بن سکتے جیسے خدا نے منصوبہ بنایا،حتیٰ کہ خداوند یسوع مسیح خود بھی اوتار لے کر ہی ''مکمل'' ہوا۔یہاں پر تکمیل کا مطلب بلوغت ہے۔

انسانی اتصال سے مکمل علیحدگی کی صورت میں کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ اپنی پیدا کردہ اولاد کو شیر خوارگی میں ہی چھوڑ دیا جاتا ہے اور جانوروں کو اپنا لیا جاتا ہے۔اگر یہ علیحدگی لمبے عرصے تک چلے تو انسانیت کی کوئی ترقی نہیں،اس طرح کے بچے اپنی ذات کی ترقی میں اس وقت تک غیر انسانی رہتے ہیں جب تک وہ دوسرے انسان کیساتھ آپس میں مربوط نہ ہوں۔

اس طرح سے مکمل انسان مادی دنیا میں اپنی جسمانی شمولیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔انسانوں کی اس طرح کی علیحدگی خطرناک عذاب ہے۔یہ اتنا نقصان دہ ہے کہ تمام اقوام اسے لاقانونیت قرار دیتی ہیں۔اگر چہ بدقسمتی سے اس عمل کو عزت دی جاتی ہے۔

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مقدسین کی کاملیت کے لیے جسمانی تعمیل ضروری ہے۔

۴۔ پھر ایک چوتھا خیال بھی ہے۔جسم کی عطا ایک عملی ضرورت ہے۔ہمیں اپنی حسوں (بصارت،سماعت،ذائقہ،بو،احساس) کے ذریعے سے ہی اپنے جسمانی ماحول کا شعور ہے اور بلاشبہ گھومنے پھرنے اور سلجھاؤ کی قابلیتیں بھی اسی مد میں آتی ہیں۔ہمارے ہاتھ، پاؤں اور زبان ہمارے دماغ کے ذریعے ہمارے تابع ہیں۔ نیوروفزیالوجی (اعصابی جسمانی ساخت کا علم) سے یہ بات واضح ہے کہ ارادے اور دنیا کے درمیان ہمارا دماغ ہی ایک جسمانی ربط ہے۔

انسان حقیقی دماغ کے بغیر اپنے شعور کو نہ اس دنیا میں اور نہ ہی کسی اگلی دنیا میں قائم رکھ سکتا ہے۔ بے شک اس کی کوئی واضح گواہی نہ سائنس کے پاس ہے اور نہ کلام کے پاس۔فرشتے ایسا کر سکتے ہیں کیونکہ انھیں اسی انداز سے بنایا گیا لیکن انسان اس طرح سے نہیں بنایا گیا۔شعور قائم رکھنے کے لیے جسمانی دماغ کی ضرورت پر مضبوط دلائل میں سے ایک کلام مقدس کا وہ پر زور وعدہ ہے جس کے تحت ہمیں نیا

جسم اور نیا لباس دیا جائے گا۔ اگر جسم کے بغیر ہی ہم ایک موثر اور کامل فرد ہوتے اور سب کام کر سکتے پھر جسم کی کیا ضرورت تھی۔ اور خداوند کے زندہ کیے ہوئے جسم کی بھی کیا ضرورت ہے؟ اگر وہ بھی ایک حقیقی انسان کے طور پر جسم کے بغیر باقی رہ سکتا ہے۔

سچ ہے کہ اسے ایک الگ اصول کے تحت چلایا جائے گا (اس کو ہم بعد میں دیکھیں گے) لیکن یہ ایک جسمانی بقاء ہوگی جس کا ہم لطف اٹھائیں گے۔ جس طرح یسوع نے اپنے جی اٹھنے کے بعد اپنے شاگردوں پر یوں بیان کرنا شروع کیا کہ اسکا جسم ہڈیوں اور گوشت کا بنا ہے، اسی طرح ہمارا بھی گوشت اور ہڈیوں کا ہی ہوگا۔ وہ کوئی بھوت نہیں تھا اور نہ ہی ہم ہونگے کیونکہ ہم اسی کی طرح سے ہونگے اور ہمارا بھی ایک جسم ہوگا ''اُس کے جلالی بدن کی طرح'' (فلپیوں 3:20,21)۔ یہ جسم نئے آسمان اور نئی زمین کے درمیان ہمارا شعوری رابطہ اور ہماری انفرادی آگاہی کا ذریعہ ہوگا، جس طرح کہ اس موجودہ کائنات میں ہے۔

۵۔ ہماری ذاتی شناخت یعنی پہچان کے معاملے پر ایک پانچویں وجہ بھی ہے۔ ہمارا کوئی تصور نہیں کہ فرشتے ایک دوسرے کو کیسے پہچانتے ہوں گے۔ نئے یروشلیم کی کسی گلی میں ملتے ہوئے ایک فرشتہ دوسرے کو کیسے پہچانتا ہوگا جب تک کہ ان کے پاس شکل جسامت یا قابل دید اطوار کی عمومی شناخت نہ ہوگی۔

ہم اپنی شناخت درجنوں طریقوں سے قائم رکھتے ہیں جیسے کہ: چہرے کے خدوخال، جسم کی بناوٹ، جسامت، اطوار، چال، آواز، رنگ وغیرہ۔ آپ بہت سی دوسری خصوصیات کے بارے میں بھی سوچ سکتے ہیں، مشترک جُز تجسیم ہے۔ شناخت کے یہ سب ذریعے جسمانی ہیں: حتیٰ کہ آواز بھی۔ کیونکہ ہماری آواز نہ ہوتی اگر ہمارے آلاتِ آواز پھیپھڑے، گلا، زبان، اور دانت وغیرہ نہ ہوتے۔ ہم کسی دوسرے شخص کو نہ دیکھ سکتے، نہ سن سکتے اور نہ محسوس کر سکتے لیکن ہمارے پاس دیکھنے سننے اور محسوس کرنے کے ذرائع ہیں۔

اگرچہ یہ تبدیل شدہ تھا پھر بھی یسوع نے اپنی انفرادی شناخت بتانے کے لیے زندہ کیا ہوا جسم ہی استعمال کیا۔ ہم جسمانی شعور رکھتے ہیں اور اپنے ''جسمانی اعمال'' کے مطابق سزا یا جزا پائیں گے یہ سوچنا ذرا مشکل ہے کہ ہم اچانک بنا جسم کے نمودار ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کو پہچاننے کے قابل نہ ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ انفرادی شناخت کے تحفظ کے لیے جسم کا ہونا بے حد ضروری ہے۔

خدا کو انسانی جسم کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟

ہم پانچ وجوہات جان چکے ہیں کہ خدا کو اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے ہمارا جسم بنانا ضروری تھا۔ مختصر طور ہم تین وجوہات دیکھیں گے کہ ہمارے اور خدا کے لیے کیوں ضروری تھا کہ وہ بھی ایسا ہی جسم اختیار کرے۔

۱۔ خدا پہلے خود مجسم ہوا کیونکہ انسان کو ایک نجات دہندہ کی ضرورت تھی اور ایک نجات دہندہ کو انسان کے بدلے جسمانی موت کا مزہ چکھنا تھا۔ ایسے نجات دہندہ کو بے انتہا عظیم خوبیوں کا حامل ہونا چاہیے تھا۔ اگر اس کی قربانی بہت سے افراد کی نجات کے لیے کافی تھی۔ ایک انسان ''اگرچہ وہ کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو'' ایک سے زیادہ گنہگاروں کی نجات کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔ ایک سادہ سے اصول کے تحت آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت اور جان کے بدلے جان ہے۔ اکلوتی انسانی زندگی کی قربانی لاکھوں انسانوں کی نجات کے لیے انتہائی ناکافی تھی صرف خدا ہی خود کو قربان کر سکتا تھا۔

لوتھر اس معاملے کو بہت سادگی سے بیان کرتا ہے ''خدا مر نہیں سکتا'' ایک خالص غیر جسمانی روح ہوتے ہوئے خدا انسانی موت کا تجربہ نہیں کر سکتا تھا۔ سوائے اس کے وہ خود انسانی جسم اختیار کرتا۔ یہ کافی نہیں تھا کہ خدا صرف ایک مکمل انسان کو تخلیق کرتا اور پھر اسے ہمارا نجات دہندہ بنا کر بھیج دیتا۔ اگر چہ وہ خود کو کسی ایک فرد کے گناہوں کے لیے قربان کر دیتا مگر اس طرح سے وہ لاتعداد انسانوں کے گناہوں کا خمیازہ نہ ادا کر پاتا۔

اس لیے خدا خود یسوع مسیح کی شکل میں انسان بن کر آیا وہ بالکل اپنے باپ کی طرح تھا جس نے مافوق الفطرتی طریقے سے ایک عورت سے جنم لیا اس لیے وہ ایک انسان کی طرح ہی تھا۔ اس لیے خدا خود انسان بن کر ہمارے درمیان رہا تا کہ وہ صلیب پر ہمارے گناہوں کو اپنے جسم پر جھیل سکے اور انسان کے طور پر ہماری موت کا مزہ بھی لے۔ اس طرح سے اُس کی موت قابلِ قدر اور ہر انسان کے لیے کافی تھی۔

یہ ایک بنیادی وجہ تھی کہ خدا نے انسان کے لیے ایک انسان کا جسم لیا کہ خدا مسیح بن کر انسانی موت کو چکھ سکے۔ لہٰذا یہ بات واجب ہے جو کلام مقدس نے کہی کہ خدا نے ہمارے لیے اپنی جان دے دی اور کلیسیا کو ''اپنے خون'' سے خرید لیا۔

۲۔ لیکن ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ خدا خود کو انسان پر ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس سے بہتر کیا تھا کہ وہ انسان بن کر انسانی کمزوریوں جیسے کہ بھوک، پیاس، تھکان، زخم اور انسانی جذبات جو اس کے زوال کا سبب بنتے ہیں کا شکار ہو۔

اور وہ انسانوں کے درمیان انسان بن کر آیا۔ اور تین سالہ تبلیغ کے دوران اطلاعاتی اور شخصی طور پر ظاہر ہوا۔ فلپ نے اس سے پوچھا کہ ہمیں باپ کو دکھا تو اس نے کہا ''فلپ کیا اتنی دیر تک میں تمہارے درمیان نہیں رہا، اور تم نے مجھے پھر بھی نہ پہچانا؟ جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا'' یوحنا (14:9)۔ جیسا کہ ایک عظیم بشپ لیو نے 449ء میں کہا، ''پوشیدہ ظاہر ہو گیا''۔

۳۔ اور حتمی طور پر تجسیم کی ایک اہم وجہ روحانیت ہے جو انسان کو فرشتوں کی طرح دباؤ، خوف، صدمے، پابندیوں اور ترغیبات سے نا آشنا کر دیتی ہے۔ خدا نے خود ان چیزوں کا تجربہ کیا۔ پھر خدا اگر انسانی ترغیبات کی فطرت کو نہ جان پاتا، تو پھر وہ انسانی اعمال کا ایک اعلیٰ منصف کیسے بن پاتا؟

اسی وجہ سے باپ نے تمام فیصلے بیٹے کو سونپ دیئے کیونکہ ''وہ ابنِ آدم ہے''۔ کیا خدا نے مسیح بن کر انسان بننے کا تجربہ حاصل نہیں کیا؟ وہ انسانی گناہ کا مکمل انصاف نہیں کر سکتا تھا؟ کیا وہ ہمارے گناہوں کی ترغیبات کے مطالب سے بالکل ناواقف تھا؟ لیکن مسیح بن کر وہ سب جان گیا۔

ایک واقعہ کی ایک اعلیٰ مثال دیکھیے۔ مصلوب لوگوں کو اگر وہ قابلِ رحم ہوتے تو انھیں رسمی طور پر لوبان اور سرکے کا پیالہ پیش کیا جاتا۔ الفریڈ ایڈرشیم کے مطابق یہ مشروب سکون آور ہوتا تھا اور اسے یروشلیم کی خواتین کی ایک تنظیم تیار کرتی تھی۔ عام طور اسے صلیب پر لٹکانے سے پہلے پیش کیا جاتا۔ بظاہر یہ تصلیب کے درد اور صدمے کے خلاف علامتی سکون تھا۔ اور بہت سے لوگ اس جان کنی اور جسمانی موت کے عالم میں ان عورتوں کے اس رحم پر شکریہ ادا کرتے ہوں گے۔

خداوند یسوع یقیناً اس رحم بھری پیش کش سے آگاہ ہوگا پھر بھی بطور انسان اسے اس مشروب کو چکھنا تھا کہ اسے کیا پیش کیا جا رہا ہے اور اسے چکھ کر وہ یقیناً جان گیا ہوگا کیونکہ بظاہر اس کا ذائقہ کڑوا تھا۔ ان کرب ناک لمحات میں بھی اس کا ذائقہ جان کر اس نے اس تسکین سے مزاحمت کی اور انکار کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ بعد میں اس نے اس سرکے کو قبول کر لیا جو اس کو پیش کیا گیا لیکن یہ سرکہ مسکن نہیں تھا اور صلیب پر ابھی کچھ باتیں کہنے کے لیے اسے اس کی ضرورت بھی تھی۔ اس کے جسم پر کوڑوں کے زخموں سے رستے ہوئے مائع نے اس کے جسم میں پانی کی اس حد تک کمی کر دی تھی کہ غالباً وہ بول بھی نہ سکتا تھا۔ پچھلے مسکن مشروب کی ترغیب نے اسے تقریباً بے بس کر دیا تھا۔

انسان کا فیصلہ کسی ایسے انسان کے ہاتھوں میں دینا جو کہ ابدی نسل سے ابنِ خدا ہو اور جسم کے لحاظ سے ابنِ انسان، الٰہی فیصلے کے عین مطابق تھا اور اس کا انسانی حالت میں لالچ میں آنا بالکل ناممکن تھا کیونکہ اسکی فطرت الٰہی تھی۔

تجسیم حال اور مستقبل کے معانی دیتی ہے

ہم پانچ وجوہات کا پھر سے جائزہ لیتے ہیں کہ انسان کو جسم سے کیوں نوازا گیا؟ اس مادی دنیا میں جسم ہونے کی وجہ سے ہی ہم:

۱۔ مادی دنیا کے بہترین منتظم بن گئے۔

۲۔ بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کے لیے تعداد میں بڑھ گئے۔

۳۔ باہمی عمل سے جسم اور روح دونوں میں بالغ ہو گئے۔

۴۔ خود پر اور دنیا پر شعور حاصل کر گئے۔

۵۔ موت کے بعد اپنی ذاتی شناخت کو بحال کر لیں گے۔

اور مختصر طور پر ہم تین اسباب دیکھتے ہیں کہ خدا نے خود کیوں جسم لیا۔ اسے جسم کی ضرورت تھی تا کہ وہ:

۱۔ انسان کی نجات کے لیے خود کو قربان کر سکے۔

۲۔ خود کو اپنے پورے حُسن کے ساتھ منکشف کر سکے۔

۳۔ روزِ حساب انسان کا کامل منصف بن سکے۔

ابواب میں موجود ان نکات میں سے کچھ کو تفصیل سے دیکھنے کے لیے پھر موقع ملے گا میرا مقصد ہر ممکن طریقے سے اس حقیقت کو نمایاں کرنا ہے کہ انسان کو جسم حادثاتی طور سے نہیں ملا بلکہ اس کو ایسا بنایا گیا۔ اور یہ کہ ہر انسان کے لیے اس کا جسم اتنا ہی ضروری عنصر ہے جتنی اس کی روح۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جسم کا نہ ہونا ''کچھ نہ ہونا'' کی طرح ہے، اور لاکھوں نفوس کی موجودگی کے بغیر یہ وسیع کائنات ضائع ہو چکی اور ضائع ہو رہی بے مقصد قوت کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

یہ انسان کی تجسیم ہی ہے جو موجودہ کائنات کو معانی دیتی ہے اور اس کے بعد آنے والی نئی کائنات کو بھی معانی دے گی۔

☆☆☆

انسانی جسم۔آخری آدم اورانسانی روح کے لیے بطور آلہ اظہار

کسی عقل مند شخص کے لیے اس حیوانی دنیا میں انسانی جسم، بھلے ہی وہ بیماری اور غلط استعمال کی وجہ سے نامکمل حالت میں ہے، ایک حیران کن مشین کی طرح سے ہے۔یہ ایک منفرد طور پر تیار کردہ آلہ ہے جو انسانی روح کے مزاج کا اظہار ہے۔ماہرین ارتقاء بھی اس بات کو تسلیم کریں گے کہ انسانی اور حیوانی روح کے درمیان ایک بنا پُل کی خلیج حائل ہے۔کسی کھلے ذہن کے لیے یہ ایک زبردست گواہی ہے۔

انسانی جسم اور روح کی طاقت

انسانی جسم کی مہارتوں کو سمجھنے کے لیے آپکو بہت قریب سے ایک ماہر پیانو جیسے کہ سائیکوسکی کو دیکھنا پڑے گا،جس کی انگلیاں کی بورڈ پر ایک دھن بناتے ہوئے ایک سیکنڈ میں بیس کیز دباتی ہیں جس کے اٹھاسی متبادل ہیں۔

صرف موسیقی کی تخلیق کو ہی روح کا عمل نہ سمجھیں بلکہ ایک بڑے پیانو کو بھی نفیس تکنیکی مہارتوں اور ان کی فنکارانہ آرائش کے ساتھ دیکھیئے۔

پھر اس کو نشریاتی ذرائع کی ترقی کے ساتھ جوڑیے جو اس کارکردگی کو رنگ اور حرکات کے ساتھ انگلیوں کو قریب سے اور اتنا واضح دکھا سکتے ہیں کہ جلد کی بناوٹ بھی نظر آئے بھلے یہ عکس ہزاروں میل دور سے چلایا گیا ہو۔پھر پہچانیے کہ دل دماغ اور ہاتھوں کا امتزاج انسان میں کس طرح تکمیل پاتا ہے۔

کارکردگی کے بارے میں سوچیے۔پیانو بجانے والے کی آنکھ کی بورڈ کو دیکھے بنا کیز کو جانچتی ہے جبکہ اس کے کان وقت پر چھوٹے کی نگرانی کرتے ہیں اور اسکا دماغ صفحے پر موجود علامتوں کی ترجمانی کرتا ہے،اور اسکے دونوں ہاتھوں کو بنا غلطی کیے مناسب مقامات پر چلاتا ہے،مکمل ادائیگی،حقیقی تخلیق،ذرائع پیداوار کی فراہمی،صوتی لہروں کی ریڈیائی لہروں میں تبدیلی اور پھر ان لہروں کو اصل آوازں میں تبدیل کر کے بھیجتا اور وصول کرتا۔یہ تمام کامیابیاں اس جسمانی دنیا میں انسانی روح اور جسم کے مابین مکمل طور پر باہمی تعلق پہ انحصار کرتی ہیں ۔اس سلسلے میں کسی بھی ربط کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔

حتیٰ کہ اس عمل میں موسیقی اور آلات موسیقی کی ایجاد بھی شامل ہے۔ہر ایک کو مکمل باہمی رابطہ درکار ہے۔ایک حیرت انگیز کارکردگی کے لیے انسانی جسم اور روح کی غیر معمولی صلاحیتوں کو کامیابی حاصل کرنے کے لیے ملکر کام کرنا پڑا۔اداکار اور سامع دونوں کے اعصابی نظام میں آگے پیچھے ظاہر ہونے والے پیغامات کا شمار اربوں تک جاتا ہے اور پھر بھی یہ نظام حقیقتاً تقریباً بنا غلطی کیے کام کرسکتا ہے۔

دل،دماغ اور ہاتھ ایک مکمل رابطے کا باعث ہیں جسے ہم اکثر بلا حیرت قبول کر لیتے ہیں۔کیوں؟ کیونکہ یہ بہت حد تک مختصر ہے! انسان نے ابھی تک کوئی مشین ایسی نہیں بنائی جو ایسی صلاحیتیں رکھتی ہو۔یہ مکمل فنکارانہ اور تکنیکی کامیابی فرشتوں کے لیے حتیٰ کہ خود

خدا کے لیے بھی ناممکن ہوگی جب تک وہ مجسم نہ ہو۔ کیا یہ کہنا نامعقول ہوگا کہ ''اگر چہ خدا گا سکتا ہے، پھر بھی وہ انسانی ہاتھوں کے بغیر اس دھن کو لکھ نہیں سکتا''۔ یہ انگلی تھی جس نے دس احکام لکھے اور ہاتھ تھا جس نے بیل شازر کی دیوار پر لکھا....

اس سلسلے میں جارج ایلیٹ کے الفاظ ایک حوالہ ہیں۔ اس نے اپنی نظم ''سٹراڈی واریئس'' میں لکھا ہے:

انسانی ہاتھوں کے بغیر خدا اُس کو مہارت نہیں دے سکتا۔

انٹونیو کے بغیر وہ انٹونیو سٹراڈیوری کا وائیلن نہیں بنا سکتا تھا۔

شاید یہ کہنا زیادہ ٹھیک ہوگا کہ ''وہ نہیں بنا پایا جب تک کہ وہ نہ بنا سکا (یعنی جب تک خدا نے سٹراڈیوری جیسا ماہر پیانو پیدا نہیں کیا تب تک وہ پیانو نہیں بنا سکا)'' کیونکہ یہ خدا کا انتخاب تھا کہ اُس نے ایسی چیزیں ہمارے لئے چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ اسے انسان کی فراغت میں کسی محدود ضرورت کے تحت نافذ نہیں کیا گیا بلکہ شاید اس لیے کہ خدا ہماری صحبت چاہتا ہے۔

انسانی جسم کی تکنیکی، فنی اور ورزشی حرکات اس قدر غیر معمولی ہیں کہ انسان کی سوچ رک جاتی ہے اور وہ اسے ایک معجزہ سمجھتا ہے۔ انسان اس طرح کے حصول میں مکمل کھویا ہوا ہے۔ جسم کے بغیر دماغ اور دماغ کے بغیر جسمانی عوامل ممکن نہیں۔ یہ کہنا یقیناً نامعقول ہوگا، ''ایک حیوانی جسم بھی غالباً کافی قریب آ سکتا ہے اگر اسے مناسب تربیت دی جائے۔ انسانی جسم حیوانی جسم سے زیادہ کچھ نہیں ہے نسبتاً انسانی روح ایک حیوانی روح ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں اور بالکل ایک جیسی سطحوں پر کام کرتے ہیں''۔

یہ بات واضح ہے کہ کسی موسیقار کے خصائل پیانو اور پیانو بجانے والے کے بغیر ظاہر نہیں ہوں گے! اور نہ ہی پیانو بجانے والے کا فن اور اُسکے آلہِ فن کی تکمیل بنا تخلیقی صلاحیت کے واضح ہوگی، اس طرح کے کمال ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ انسان کسی دوسرے علاقے میں چلا جائے گا، یا چاند پر چلا جائے گا اور عددی درستگی سے واپس بھی آ جائے گا، ایسے خیالات کسی جہالت خانے میں بنائے جاتے ہیں۔ انسان کی تخلیقی روح اور واضح مہارت ملکر تقریباً معجزے کرتے ہیں اور جانوروں کے برعکس انسان کامیابی کے لیے خوشگوار شعور رکھتا ہے۔

ہر قابل تصور تبدیلی اور امتزاج میں انسانی جسم اور روح اپنی لامحدود صلاحیتوں میں ایک جیسے پائے گے ہیں۔ جب مسیحی لوگ روح کی نئی پیدائش کی بات کرتے ہیں اور جسم کی نجات کی بات نہیں کرتے تو وہ صرف آدھے انسان کی نجات کی بات کرتے ہیں، جو کہ ہرگز انسان کی نجات نہیں ہے۔

انسانی صلاحیتوں کی اس مثال کو لامحدود طور سے بڑھایا جا سکتا ہے۔ انسان پرندے کی طرح سے آسانی اور مہارت سے نہیں اڑ سکتا، نہ چیتے کی طرح سے 70 میل فی گھنٹہ دوڑ سکتا ہے، نہ ڈولفن کی طرح شان اور رفتار سے تیر سکتا ہے، نہ کینگرو اور ہرن کی طرح چھلانگیں لگا سکتا ہے۔ نہ بندر اور گلہری کی طرح سے ہوا میں کرتب دکھا سکتا ہے، نہ ہی پہاڑی بکریوں اور بھیڑوں کی طرح سے چٹانوں پر چڑھ سکتا ہے۔ یہ مخصوص صلاحیتیں جانوروں کی بقاء کے لیے ضروری ہیں وہ اکثر انسانی افعال آسانی سے سرانجام دیتے ہیں۔ لیکن ماسوائے چند موقعوں کے وہ کام نہیں کر سکتے جو انسان اپنی تخلیقی روح اور منفرد جسم کے امتزاج سے کر لیتا ہے۔

انسان کی صلاحیتیں تقریباً لامحدود ہیں اور وہ بقاء کی ضرورتوں سے بھی آزاد ہے۔ بیشک انسان میں ایسی روح ہے کہ اپنی

مہارت کو اس وقت واضح کرتا ہے جب اسکی بقاء ممکن نہ ہو۔ آرائشیں جو انسان کو اور اسکی دنیا کو خوبصورت بناتی ہیں اس خوشی کے ظہور کا عکس ہیں، جسے خود خدا نے اپنی تخلیق سے نمایاں کیا۔ وہ خوبصورتی کی وضاحت کرتا ہے جس سے انسان کا وہ مشکل راستہ ہموار ہو جاتا ہے جس پر وہ اپنی گری ہوئی فطرت کے تحت چل رہا ہے۔

یقیناً اپنے جسم کے بغیر انسان فرشتوں سے زیادہ تخلیقی نہ ہوتا۔ اس لحاظ سے صرف انسان اور خدا ہی تخلیقی ہیں۔ خدا اس لیے کہ وہ ''خدا'' ہے اور انسان اس لیے کہ وہ ''انسان'' ہے۔ جو انسانی جسم اور انسانی روح رکھتا ہے اور انہی دو چیزوں کی خدا نے تمنا کی اور ان کو تخلیق کیا۔

انسان اپنے دماغ اور ذہن کی تخلیق سے کسی چیز کو دو زاویوں سے دیکھنے کی ہُنر مندی رکھتا ہے۔ وہ اپنے صریح اور صاف دستور العمل سے محنت کر کے چیزوں کو آسانی سے وضع کر سکتا ہے۔ اس کا وسیع اور ہمہ گیر اعصابی نظام اس کی جسمانی صلاحیت کو بڑھاتا ہے۔ اور وہ مشکل سے مشکل کام بھی اپنے ہُنر سے آسانی سے کر لیتا ہے۔ دراصل انسان کی صلاحیتیں جانوروں سے کہیں زیادہ ہیں جیسے کہ سوئی میں دھاگہ ڈالنا اور یہ کام کوئی پڑھا لکھا چیمپینزی بھی نہیں کر سکتا۔

انسان، جسم اور روح کا اِس قدر غیر معمولی امتزاج ہے کہ وہ حیوانی دنیا میں کوئی نئی چیز بھی بنا سکتا ہے۔ وہ جانداروں کے بیچ کسی تسلسل یا معمول کے تحت صرف اپنی مقداری تخلیص کے ساتھ ہی اچانک نمودار نہیں ہو گیا۔ یہ آراستگی اس قدر خوبیوں کی حامل ہے کہ وہ کسی تصوراتی انقلابی عمل سے حقیقی تسلسل کو ختم کر کے کچھ نیا بھی بنا سکتا ہے۔ ماہر جینیات رِچرڈ گولڈشیمد کے خیال میں انسان کے اس اچانک ظہور کو بزمِ ارتقاء کی اچانک چھلانگ کہنا چاہیے۔ جارج جی سمپسن نے محسوس کیا کہ یہ اصطلاح تخلیق کے مافوق الفطرت تصور کے قریب تر ہے۔ اس نے اسے ''مقداری ارتقاء'' کہنے کی بجائے فزکس (طبیعات) سے اتفاق کرتے ہوئے زیادہ باعزت نسب قرار دیا۔

آج یہ اصطلاح رائج نہیں ہے اور اس کی جگہ سٹیفن جے گولڈ کے مشہور محاورے پنکچوایٹڈ ایکویلبریم (معیاری مساوات) نے لے لی ہے۔ نظریہ ارتقاء جس نے چھوٹے وقفوں میں ترقی پائی اور دنیا کو ہلا کر رکھ دیا، کے مطابق باترتیب مراحل میں اچانک ایک ڈرامائی ترک تسلسل نمودار ہو گیا۔ یہ اصطلاحات گلاب کے پھول کی طرح سے ہیں جو لوگوں کو اسی طرح بھینی خوشبو دیتی رہیں۔ فوسلز (ڈھانچوں) سے یہ فرق کرنا بہت مشکل ہو گا کہ کونسی نسل ارتقاء سے بنی اور کونسی تخلیق سے۔

یہ نئی اصطلاحات پرانی پرانی اصطلاحوں سے مختلف ہو کر ظاہر ہوئیں۔ اِنھوں نے عوام کے لیے نئی وضاحتیں پیش کیں جبکہ حقیقی نقطہ نظر سے اُن میں کوئی وضاحتی قدر نہیں تھی۔ وہ نئی وضاحتیں نہیں بلکہ پرانی تفاصیل ہی تھیں۔ ان کے پاس انسان کے اچانک ظہور کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ صرف اس بات پر متفق تھے کہ انسان کی آمد تسلسل سے ہٹ کر ہے۔

پروفیسر سوزین لنجر (جو کہ مسیحی نقطہ نظر کا حامی نہیں تھا) انسان کی واحد کامیابی ''زبان'' کو اس طرح بیان کرتا ہے: ''زبان انسانی دماغ کی انتہائی مخفی اور اہم پیداوار ہے۔ کسی حیوان کی آگاہی یا غصے یا پیار کی پکار اور انسان کے چھوٹے سے لفظ کے درمیان ایک پورے دن کی تخلیق موجود ہے''۔

ہیمفرے جانسن نے بھی کچھ اسی طرح لکھا ہے: ''ایک گوریلے اور ڈیزی (گل بہاری) کی نسبت انسان اور گوریلے کے درمیان واضح فرق ہے''۔ ایسے بیانات بہت سے ذرائع سے بڑھائے جا سکتے تھے۔

انسانی جسم کے ارتقاء کے بہت پرانے حامی جے منسک نے بیان کیا کہ ''حیوانی انسان بمشکل ہی اپنے آپ کوئی خاندان بنا سکتے ہیں جبکہ نفسیاتی انسان کے لیے ایک واضح سلطنت بنائی جا سکتی ہے''۔ اور کچھ سال پہلے جیمز اور نے بیان کیا، ''تمہیں کائنات کی نمائندگی کرنی ہے جس میں انسان کو ایک طرف اور باقی سب کچھ دوسری طرف رکھنا ہوگا''۔

یہ صحیح ہے کہ انسان فطرت کی الگ سے نمائندگی کرتا ہے۔ اور فسکے کے اعتراف کے برعکس انسان کی علیحدگی نہ صرف اس کے جسم سے مربوط ہے بلکہ اس کے ذہن سے بھی۔ کیونکہ بغیر جسم کے روح کمزور ہوگی اور اس طرح کا جسم بغیر روح کے اشیاء کے ارتقائی اندازے میں ریاضیاتی غلطی ہوگی۔

ہر انسانی روح اپنے انسانی جسم کے مطابق ہے:

روح خدا کی براہ راست تخلیق ہے یہ نظریہ بہت پرانا ہے اور خدا کا کلام اس کا زبردست حامی ہے۔ تقریباً تمام ماہر الٰہیات پروٹسٹنٹ اور رومن کاتھولک کم از کم آدم کے معاملے میں اس نظریے پر متفق ہیں۔ ایک بہت بڑی اکثریت ایک قدم آگے جا کر یہ کہتی ہے کہ ہر فرد کے لیے الگ روح اب بھی تخلیق کی جا رہی ہے اور اسے انسانی جسم میں اس وقت داخل کیا جاتا ہے جب وہ پیٹ میں اپنی نشوونما کے ابتدائی مرحلے میں ہوتا ہے اور جدید ترین خیال یہ ہے کہ یہ روح اس میں اس وقت ڈالی جاتی ہے جب وہ پہلی سانس لیتا ہے۔

تھامس ایکوینس (1226-1274) جو کہ قرون وسطیٰ کے مسیحی دور کا بہت بڑا نام ہے یہ دلیل دیتا ہے کہ خالق ہر روح کو مخصوص جسم کے لیے مخصوص طریقے سے بناتا ہے۔ اور اس طرح سے جسم اور روح کو عمومی انداز سے ہی نہیں بلکہ خصوصی انداز سے ایک دوسرے کے مطابق بنایا جاتا ہے اور بہت سے جدید پروٹسٹنٹ اور کاتھولک ماہر الٰہیات اسی نظریے کے حامی ہیں کیونکہ یہ واضح طور سے کلام سے منعکس ہے۔

اگر خدا حاکمِ اعلیٰ ہے اور اگر اس نے اپنے نجات یافتہ بچوں کو زندگی کے کسی کام پر مقرر کیا ہے اور اگر ہم میں سے ہر کوئی جسم اور روح سے مرکب ہے، پھر یہ اس ضرورت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ زندگی اور جسم کی جینیاتی قابلیت روح میں اس طرح ڈھل جاتی ہے جس طرح کہ اسے خدا نے متعین کیا ہے جیسے کہ روح کی فطرت ہے جسے خدا نے خلق کیا ہے۔

کسی منصوبے پر کام کرنے کے لیے کام اور قابلیت کو ایک دوسرے کے مطابق ہونا چاہیے۔ جیسے کہ اے ایچ سٹرانگ اپنی نظاماتی علم الٰہیہ میں لکھتا ہے (ڈبلیو گلیڈن کا قول): ''وراثت کا مطلب ہے کہ خدا ہم میں کام کر رہا ہے اور ماحول کا مطلب ہے کہ وہ ہمارے ارد گرد کام کر رہا ہے''۔ خدا ہمیں اس کام کے لیے نہیں بلاتا جس کے لیے اس نے ہمیں جسمانی اور روحانی طور سے تیار نہ کیا ہو۔

قدیم کتاب عہدِ نفتالی میں ہمیں یہ مشاہدہ ملتا ہے: ''جس طرح کمہار جانتا ہے کہ برتن کی گنجائش کتنی ہے اور پھر اس کے مطابق مٹی لاتا ہے اسی طرح خدا بھی جسم کو روح کے مطابق بناتا ہے اور جسم کی گنجائش کے مطابق اس میں روح ڈالتا ہے جس طرح کمہار جانتا

ہے کہ برتن کو کس مقصد کے لیے استعمال کرنا ہے اسی طرح خدا بھی جانتا ہے کہ اس میں کتنی قابلیت ہے (2:2-4)''۔

روح کا جسم کے مطابق ہونا بہت قدیم تصور ہے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیونکہ ہم سب یہی جانتے ہیں کہ ہماری روح ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق خدا سے ہے۔ پہلے یہ فرض کیا جاتا تھا کہ روح خود بخود موجود ہوتی ہے اور خدا کی موجودگی میں خود ہی آجاتی ہے۔ آگے بڑھتے ہوئے جونہی ہم ان ابواب کا مطالعہ کریں گے تو ہم دیکھیں گے کہ یہ معاملہ اس طرح سے ہرگز نہیں ہے۔

میں یہ مانتا ہوں کہ آدم کا جسم اُس کی روح سے پہلے تخلیق کیا گیا۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ روح کو ایک ایسے جسم میں ڈال دیا گیا جو اتفاقاً بن گیا ہو۔ جسم اور روح کو ایک ہی انفرادی مقصد کے تحت بنایا گیا ہے۔ یقیناً ایک جسم روح کے بغیر موجود رہ سکتا ہے جیسے کہ آدم کا جسم زمین پر پڑا تھا اور خدا کی سانس کا منتظر تھا۔ اور جس طرح ہمارے جسم بھی ہماری جان نکلنے کے چند گھنٹے بعد تک پڑے ہوتے ہیں۔ ہر جُز کی ایک دوسرے سے آزاد ہونے کی صلاحیت مجھے اس تمثیل کی طرف لے جاتی ہے کہ انسانی جسم ایک گاڑی ہے اور انسانی روح اس کو چلانے کے لیے ہے۔

جب انسان جانوروں کے لیے کوئی گھر تعمیر کرتا ہے تو وہ اُسے ان کی فطرت کے مطابق بناتا ہے وہ اس بات کا خیال نہیں کرتا کہ وہ ان کیساتھ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ سانپوں کو دشمنی کے لیے ابھار رہا ہے تو وہ ان کے لیے ایسا گھر بنائے گا جن سے وہ نکل نہ سکیں: اپنے مویشیوں کے لیے وہ ایسا بڑا گھر بناتا ہے جس سے وہ آسانی سے باہر نکل سکیں۔ گھوڑوں کیلیے باہر کا راستہ انتہائی احتیاط سے بنانا چاہیے کیونکہ وہ فطرتاً خانہ بدوش مخلوق ہیں۔ اپنے کتے کیلیے انسان ایک ایسا گھر بنائے گا جو کسی حد تک انسانی گھر جیسا ہی ہو کیونکہ کتا بھی غالباً اپنے دوران زندگی میں یہی کچھ کرتا ہے۔

اس طرح وہ کسی مخلوق کے لیے ویسا ہی گھر بناتا ہے جو اُس کی فطرت کے مطابق ہو اور اسکے اپنے گھر سے ملتا جلتا ہو۔ وہ اپنا گھر کیسا بناتا ہے؟ وہ اسے بھی اپنی فطرت اور مقاصد کے مطابق ہی تعمیر کرتا ہے، کسی حد تک وہ اپنی بیوی اور اپنے خاندان کی فطرت کو بھی مطمئن کرے گا لیکن بنیادی طور پر اگر ایسا کرنا اس کے بس میں ہے تو۔ معمار اُسے ایک ایسی گاڑی کی طرح ہی بنائے گا جو اس کا شخصی اظہار کر سکے۔

اب خدا کیا کرے گا، اگر وہ اپنے لیے موزوں گھر بنانے کا فیصلہ کرتا ہے اور ایسا گھر جو مقررہ وقت تک اسکا گھر ہو، جو تینتس سال تک اسکی خدمت کر سکے، جس میں وہ اپنے کردار کا اظہار کر سکے اور جس کا وہ شب و روز سوتے، جاگتے، چلتے پھرتے، پیدا ہوتے اور مرتے ہوئے ایک مکمل مستقل اور مستعد مالک ہو۔ یہ گھر اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ اس میں قدر اور مناسبت سے رہ سکے۔ یہ ایک ایسا گھر ہو گا جو ان رہائشی مطالبات کا بوجھ اٹھا سکے گا جو وہ اس میں رہ کے کرے گا۔ یہ خوبصورت ہو گا کیونکہ خدا خوبصورتی سے پیار کرتا ہے اسی لیے اس نے فطرت میں بہت سی خوبصورت اشیاء پیدا کیں۔

اس کے علاوہ یہ گھر اس قدر لچکدار ہونا چاہیے کہ یہ تمام انسانی مزاجوں کا تصور پیش کر سکے، خوشی ہو یا مایوسی، کراہنا ہو یا حیران کن خوشی کا شور۔ اس گھر کو غم، غصہ، لعن طعن اور دکھ کو اشارے یا آواز کے لہجے سے باخبر کرنے کا اہل ہونا چاہیے۔ کیونکہ جسم کسی طور بھی

آگاہ کر دینے والی قوتوں کے بغیر نہیں ہے۔ اسے اس قدر شاہانہ ہونا چاہیے کہ موزوں وقت پر فطرتی تال میل سے عداوت بھی کر سکے اور اسے شان و شوکت سے قبول بھی کر سکے۔

آخری اور ضروری بات کہ اس گھر کو ایسا ہونا چاہیے کہ یہ خود بہ خود تباہ نہ ہو سکے تاہم اسے دانستہ مناسب وقت پر قربان کیا جا سکے۔

''خدا کا گوشت'' انسانی تجسم کی حتمی تکمیل

بے شک یہ سب تجسیم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ان سب خصوصیات کو آخری آدم کے جسم میں بھر دیا گیا اور اسی کی تیاری کے لیے ''پہلے آدم'' کے جسم کو تخلیق کیا گیا۔ اور ان خوبیوں کو سب سے پہلے انسان پر بھی لاگو کیا گیا اور سب سے آخری انسان پر بھی لاگو کیا جائے گا۔ جیسے ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ اگر یہ مکمل طور پر قابل تصور نہیں ہے تو پھر ''آخری آدم'' اس عنوان کا حقدار نہیں اور نہ ہی وہ پہلے آدم کا متبادل ہے اور نہ یہ کہ وہ انسان کے نجات یافتہ خاندان کا سربراہ بن سکے۔

ارسطو نے لکھا ''انسان کی فطرت اس میں نہیں کہ وہ کیا پیدا ہوا بلکہ اس میں ہے کہ وہ کس لیے پیدا ہوا''۔ اگر میں اسے مسیحی اصطلاح کے مطابق تبدیل کر سکوں تو اسے اس طرح لکھا جا سکتا ہے، ''انسان کا جسم اس لیے نہیں کہ وہ ''اب' کیا پیدا ہوا بلکہ اس لیے ہے کہ وہ ''پھر' کیا بنایا جائے گا''۔

طرطولین کے پاس ایک حیرت ناک گزرگاہ ہے جس میں وہ خالق کو مٹی پر جھکتے ہوئے اور اسے شوق سے انسان کا جسم بناتے ہوئے بیان کرتا ہے۔ ''یہ سچائی زیادہ اہم ہے کہ مخلوق کو کس طرح سے بنایا گیا اس لیے اکثر وہ اعزاز وصول کرتا ہے اور اکثر وہ خدا کے ہاتھ محسوس کرتا ہے جب وہ اسے چھوتا ہے دھکیلتا ہے کھینچتا ہے اور اسے ایک شکل میں ڈھالتا ہے۔ فرض کریں خدا مکمل طور پر اس میں داخل ہو گیا اور جذب ہو گیا اپنے ہاتھوں اور آنکھوں کے ساتھ اپنی محنت، مقصد، حکمت اور دور اندیشی کیساتھ اور ان سب سے بڑھ کر محبت کے ساتھ جو اس مخلوق کی خصوصیات پر حکمران تھی''۔ طرطولین نے نتیجہ نکالا:

> انسان کو تشکیل دیتے ہوئے خدا کے ذہن میں مسیح تھا جسے ایک دن انسان بننا تھا، کیونکہ کلام ہی مٹی تھا اور کلام ہی گوشت جیسے کہ مٹی خالق کے ہاتھوں میں۔ جیسے خدا نے بیٹے کو پہلے سے ہی کہا تھا'' آؤ ہم انسان کو اپنی مانند اور اپنا عکس بنائیں''۔ اس لیے خدا نے انسان کو بنایا جو کہ وہ مخلوق کہلائی جسے خدا نے اپنی شبیہہ کے مطابق ڈھالا، یا پھر دوسرے لفظوں میں خدا نے انسان کو مسیح کا عکس بنایا۔ میرے خیال میں اُس لمحے اُس مٹی کو جسے مسیح کی شکل دی گئی جسم بننا تھا، نہ صرف خدا کا کام تھا بلکہ انسان کی نجات کے لیے اس کے وعدے کی تکمیل بھی تھی۔

انسانی روح کے لیے ایسا گھر سلیمان کی ہیکل کی طرح تھا، نہ کہ پہلے سے موجود کسی مندر کی طرح۔ اسی طرح آدم کا جسم پہلے سے موجود کسی جانور جیسا نہ تھا۔ اسے مخصوص اور ''بے حد شاندار'' ہونا تھا جیسا کہ (احبار 1-22:5) میں کنگ جیمز کا ترجمہ باریکی سے بیان کرتا ہے۔ اور بنیاد سے ہی بے شک اسے شاندار ہونا تھا فرض کریں پہلا انسانی جسم محکوم اور گناہ آلودہ ہونے کے باوجود اپنی قوتوں کی وجہ سے تقریباً ایک ہزار سال تک خراب نہیں ہوا۔ وہ جسم جس میں تقریباً تینتیس سال مقیم ہونا تھا آدم کا حقیقی جسم تھا، اور یہ بھی بہت ''شاندار'' تھا۔

الٰہی ماہرِ تعمیر نے اسے اپنے لیے بنایا تھا اس لیے ہمیں پُر یقین رہنا چاہیے کہ وہ جسم جس میں ہم پوری زندگی رہتے ہیں کوئی لڑھکتا ہوا گھر نہیں ہے۔ اس کے جسم نے شاندار سہارا دیا، جب اس نے اپنی زندگی انسانوں کے درمیان گزاری، اور اس نے پورے طور سے وہ ذرائع مہیا کیے جن سے اس نے اپنی مقدس فطرت کا اظہار کیا۔ جسم میں اُس (خداوند یسوع مسیح) کی موجودگی اس قدر شاندار تھی کہ بعض اوقات اس کے بے حس دشمنوں کو بھی اس کے جلال سے ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑا اور انھوں نے محض اس سے بدسلوکی کی کیونکہ اس نے ارادۃً اپنی شان کو چھپایا اور انھیں ایسا کرنے کی اجازت دی۔

یہ جسم گناہ سے پاک تھا اور خدا خود اس میں رہتا تھا اس طرح انسانی تاریخ میں اعلیٰ جسم نمودار ہوا تو لوگوں نے اس کی بلا شرم و ہچکچاہٹ عبادت کی۔ یہ تھی ''اُس'' کے جسم کی شان، کہ گناہ آلود اور ناکام ہونے کے باوجود ہم آدم کو صرف اس لیے مانتے ہیں کہ خدا نے اسے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔

نظریہ ارتقاء ہمیں ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کا موازنہ ہم ''آخری آدم'' سے کر سکیں۔

☆☆☆

افزائشِ نسل کے لیے بنائے گئے
انسان سے ایک عورت اخذ ہوئی

مسیحی نقطہ نظر سے آدم میں سے حوا کی تشکیل اہمیت علمِ الٰہی کی زبردست حقیقت تھی۔ ارتقائی نقطہ نظر سے یہ ناممکن اور ناسمجھ تصور کے سوا کچھ بھی نہیں۔ خود خالق کے نقطہ نظر سے ان کا کوئی متبادل ہی نہیں تھا۔

یہ بات قاری کو حیرت میں ڈال سکتی ہے کہ اگر حوا کوئی الگ مخلوق تھی اور اسے آدم میں سے نہیں بنایا گیا تو حوا پھر آدم کی نجات میں شریک نہیں ہوسکتی اور نہ ہی ''اس کے بعد اترنے والوں کی''۔ اس بات پر زور دینا ضروری ہے کیونکہ اس کا لقب ''سب زندوں کی ماں'' منصوبہ نجات میں اتنا ہی قطعی ہے جتنا آدم کا لقب ''سب مرنے والوں کا باپ''۔ اس کے اسباب بعد میں واضح کیے جائیں گے۔

الٰہی اور حیاتاتی نقطہ نظر کے حالات کچھ بھی ہوں، میں انہیں مانتا ہوں اس لیے پہلے سے قائم شدہ حقیقت سے نکلے بغیر مجھے اس خلاصے کے ساتھ آگے بڑھنے دیجیے کیونکہ بائبل کی تاریخ سائنسی حقیقت اور سچ کے نزول کے درمیان انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔

پیدائش (1:26,27)

اور خدا نے کہا ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی مانند بنائیں اور وہ سمندر کی مچھلیوں اور آسمان کے پرندوں اور چوپایوں اور کل روئے زمین اور سب کیڑے مکوڑوں پر جو زمین پر رینگتے ہیں حکومت کرے۔

اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا، خدا کی صورت پر اُس نے اُن کو، نر اور ناری پیدا کیا۔

پیدائش (2:18)

اور خداوند خدا نے کہا کہ انسان اکیلا اچھا نہیں ہم اس کے لیے ایک مددگار اس کی مانند بنائیں۔

پیدائش (2:21,22)

تب خداوند خدا نے انسان پر گہری نیند بھیجی اور جب وہ سو گیا اُس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کی جگہ گوشت بھر دیا اور خداوند خدا نے اس پسلی سے جو اُس نے انسان سے نکالی تھی ایک عورت بنائی، اور اسے انسان کے پاس لایا۔

جب پہلے آدم کو تخلیق کیا گیا اور دنیا میں متعارف کروایا گیا تو ہوسکتا ہے تب انسان نما بہت سی مخلوقات موجود ہوں جو کہ آدم کی بناوٹ سے پہلے کی تخلیقی سرگرمی کا نتیجہ ہوں۔ ہوسکتا ہے ان میں سے کچھ مخلوقات کو آدم کے سامنے اس کے زبردست ساتھیوں کے طور پر پیش کیا گیا ہو۔

ان میں سے حقیقتاً کوئی بھی ایسا نہ تھا جو انسان پیدا ہوا ہوتا اور آدم کو قبول ہوتا۔ یہ ایک نظامِ فطرت ہے جسے خالق نے خود قائم

کیا،کوئی بھی جنس کسی دوسری جنس سے محبت نہیں کرتی جب تک وہ اس کی مانند نہ ہو۔اس لیے بہت ملتے جلتے امیدوار بھی انسان ثابت نہ ہوئے۔اس طرح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہی لوگ جو آدم میں موثر تھے انسانی صحبت کے لیے قابلِ قبول تھے اور مستقبل میں انہی کو آدم کے خاندان کے ارکان کے طور پر شمار کیا گیا۔انسانی خاندان کے سربراہ کے طور پر آدم سے خدا نے جو بھی عہد باندھا اس کا اطلاق صرف نسلِ آدم پر ہی ہوتا ہے۔تمام تر رحمتیں اور لعنتیں نسلِ آدم کے لیے ہی تھیں،اگرچہ ان رحمتوں اور لعنتوں کی گونج تمام فطرت میں تھی۔

حوا: براہ راست تخلیق سے نہیں آدم میں سے بنائی گئی

دماغ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اب یہ مشاہدات حوا پر بھی لاگو ہوتے ہیں جس کا خاندانِ آدم سے ایک منفرد تعلق ہے۔تعریف کے لحاظ سے پسی شیز جانداروں کا ایک ایسا گروہ ہے جو جنسی عمل کے ذریعے جنسی عمل کے قابل بچے پیدا کر سکیں۔عام طور سے اس طرح کے گروہ کو خاندان کہا جاتا ہے جس کے تمام افراد ایک ہی والدین سے پیدا ہوئے ہوں،نقطہ ارتقاء اور نظریہ تحقیق دونوں کے حامی اس بات سے متفق ہیں۔

جیسا کہ ہم دوسرے باب میں بھی دیکھ چکے ہیں کہ فرشتے انسان کی طرح عملِ تولید سے نہیں بڑھتے بلکہ خدا کی تخلیقی سرگرمی کا نتیجہ ہیں۔وہ انسانوں کی مانند شادیاں نہیں کرتے،وہ کوئی واحد صنف تشکیل نہیں دیتے بلکہ ہر ایک اپنے آپ میں ایک صنف ہوتا ہے اور ان کے درمیان خاندانی تعلقات بھی نہیں ہیں۔ان میں نہ کوئی جدِ امجد ہے نہ کوئی واحد نمائندہ اور نہ ہی کوئی ''پہلا فرشتہ'' جس کے بعد سب فرشتے آئے ہوں۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں منصوبہ نجات کے لیے ایک نجات دہندہ درکار ہے، جو خاندان کا سربراہ ہو۔بائبل ہمیں اس بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیتی کہ فرشتوں کی جماعت کس طرح نجات پائے گی،اگر یہ نجات ممکن بھی ہو تو ہمارے پاس اس کا کوئی نمونہ نہیں ۔ منطقی طور پر ایسا لگتا ہے کہ ہر فرشتے کے لیے ایک الگ نجات دہندہ ہوگا یعنی لاکھوں فرشتوں کے لیے لاکھوں نجات دہندے۔

یہ بات ذہن میں رکھیں کہ براہ راست تخلیق الگ الگ نسلیں پیدا کرتی ہے جبکہ عمل تولید خاندان پیدا کرتا ہے۔اس لیے یہ واضح ہے کہ آدم کو تخلیق کیا گیا اور اس کے بعد آنے والے اس کی سربراہی میں ترتیب وار عمل تولید سے آئے۔اس نزول سے نسلاً سب اس کے رشتے دار ہیں۔

پھر حوا کے ساتھ کیا کیا گیا،وہ آدم کی طرح کس طرح الگ تخلیق ہوئی جبکہ اس کا تعلق آدم سے نہ تھا۔اور پھر جسمانی خصوصیات کی بنا پر بھی وہ ایک الگ صنف تھی۔بنیاد کی ان شرائط کے تحت آدم اور حوا بھی باقاعدہ فرشتے ہیں،یعنی لاتعلق اور الگ صنف۔اس لیے ان کے بعد آنے والے سب خالص نسل ہونے کی بجائے دوگلی جماعت ہوں گے۔

اگر حوا ایک الگ تخلیق ہے تو پھر آدم اپنے خاندان کا سربراہ کیسے بنتا ہے؟ دراصل ہمارے دو سربراہ ہوئے؟ اور کیا پھر دو اور سربراہ نہیں ہونے چاہییں،''دوسرا آدم'' اور ''دوسری حوا''؟ یاد کیجیے کہ ہم ایک حقیقی صورتحال کی بات کر رہے ہیں،یعنی صنفی تاریخ کے خاص لمحے کی۔نتائج کا منطقی تصور کر کے ہم ایسے لمحے کی صحیح اہمیت کا بہتر اندازہ کر سکتے ہیں۔

نجات صرف ان کی ہوسکتی ہے جو آدم کی نسل اور اُس کے بیج سے ہیں۔ نجات یافتہ ہمیشہ اسی نسل کے ہیں۔ اگر انسانی ارتقاء کا عمل سچ ہے تو نہ ہی ارتقائی انسان نجات کا اہل ہے اور نہ ہی اس کی ہم عصر اصناف۔

لیکن افزائشِ نسل کے لیے ایک مددگار ساتھی درکار تھا۔ اگر ایسا ساتھی آدم کی نسل سے ہی ہے، تو حوا بھی ''آدم' میں سے ہی ہے اور اس لیے نجات کی اہل ہے۔ یہ اُس حقیقت کے مطابق ہے جیسے پولوس نے کہا ''اور بنی نوع انسان کی ہر ایک قوم کو روئے زمین پر ایک ہی اصل سے پیدا کیا گیا'' (اعمال 17:26)۔ غور کریں یہاں ''ایک میں سے'' کہا گیا ہے ''ایک جوڑے سے'' نہیں۔

دو الگ تخلیقات کے بغیر پھر ہمارے والدین کس قاعدے سے جوڑا بناتے ہیں۔ صحیح انسانی شناخت کا راز ''آدم میں'' ہی ہے خواہ اچھا ہو یا بُرا اور اس میں حوا بھی شامل ہے۔ چونکہ حوا بھی آدم میں سے ہی ہے اس لیے یہ واضح ہے کہ نہ ہی اُسے الگ تخلیق کیا گیا اور نہ ہی اُسے الگ اخذ کیا گیا بلکہ اُسے آدم میں سے اُس کی اپنی بنیاد کے لیے نکالا گیا۔

آدم: الٰہی جراحت سے پہلے اور بعد

آدم کی نیند کے دوران اس کے جسم کا حصہ لینا اور حوا کا جسم بنانا بے حسی میں الٰہی سرجری کا عمل تھا: وہاں پر ''گوشت کا بھرنا'' آدم میں ہوئی کمی کو پورا کرنا تھا لیکن آپریشن کے بعد اب اس کا جسم بہت مختلف تھا، اس کے جسمانی فعل میں ایک انقلابی تبدیلی آچکی تھی۔

الٰہی سرجری میں حوا کی بناوٹ ممکن تھی اگر پسلی کے ساتھ کچھ نہ کیا جائے بلکہ ایک ایسی ساخت بنائی جائے جو آدم کے جسم جیسی ہی ہو کیونکہ لفظ ''رِب'' (پسلی) کا مطلب ساتھ والا رکن بھی ہے۔

جب وہ جاگا تو اسے حوا پیش کی گئی، آدم کو فوراً پتا چل گیا کہ اس کے گوشت اور ہڈیوں میں سے ایک نئی مخلوق خلق کی گئی ہے، ایک ایسی مخلوق جو پہلے اس کے جسم کا حصہ تھی اور اب ''دوسرا نصف حصہ'' ہے۔

کیونکہ اُس کی (حوا) تشکیل سے پہلے آدم ایک مکمل شخص اور ایک مکمل انسان تھا۔ اب اس کے جسم کے ایک حصے سے حوا کو بنالیا گیا تھا اگرچہ اب بھی وہ ایک مکمل شخص تھا، مگر صرف نصف انسان: اس سے پیدائش 2:24 کے الفاظ کی سمجھ آجاتی ہے کہ وہ ملکر ''ایک گوشت (ایک جسم)'' ہوں گے، عبرانی میں لفظ فلیش (گوشت) کے لیے بسر (Basar) استعمال ہوا ہے جس کا پرانے عہدنامے میں سوائے جسم کے کوئی اور معانی نہیں۔ یہ کم تر فطرت کی طرف اشارہ نہیں ہے جیسا کہ بعض اوقات نئے عہدنامے میں ہے۔

آدم کے تصور سے یوں لگتا ہے کہ وہ خود ہی نر تھا اور خود ہی مادہ مگر اس کا اطلاق نا قابل قبول ہے۔ لیکن یہ خیال آتا ہے کہ کم و بیش ایک حد تک ہمارے سمیت آدم اور حوا کی سب اولاد پر یہ بات صادق آتی ہے۔ پھر دماغ میں آتا ہے کہ اس سے تو ''صنف' کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے اگر یہ کوئی بیماری کی حالت نہیں ہے تو پھر ایسی سوچ صرف دماغ کا خلل ہے۔

اب انسان ایک باقاعدہ انسان ہے جو کہ آدم سے حوا کو الگ کرنے کے بعد نتیجتاً آیا، دو باقاعدہ اجسام میں خدا نے دو الگ الگ جنسیں رکھیں۔ جس میں عام حالات کے تحت ایسا کوئی خلل نہیں۔ آدم جیسا بھی خلق ہوا ایک مکمل تخلیق تھی۔ نر اور مادہ دونوں اصولوں کو عملی اور فعلی طور پر اس میں انتہائی ترتیب سے یکجا کیا گیا۔ جب یہ اعضاء اور ان کے مادے جو وہ پیدا کرتے ہیں الگ الگ کیے گئے تو

انھیں مناسب طور سے دو مکمل الگ اجسام میں رکھا گیا۔ ایسا صرف تب ہوتا ہے جب کسی فرد میں میکانیکی نشوونما میں خلل پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اس سے پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ساختوں کی خلافِ معمول یکجائی جسے خدا نے علیحدگی کے لیے بنایا صرف حیاتیاتی خلل تک محدود ہے۔

ایسا خلل آدم میں نر اور مادہ کا اجتماع ہرگز نہیں، اس کی بجائے یہ ایک خلل ہے جو اجتماع کے وقت الٰہی ارادے کے برعکس واقع ہوا۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ آدم کے غیر منقسم جسم میں یعنی حوا کی تشکیل سے پہلے ایک ہی جاندار میں دو طرح کے عناصر پیدا ہو گئے ہوں، جیسا کہ آج بھی کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ عناصر کا اجتماع جو نتائج پیدا کرتا ہے وہ ان کے الگ الگ نتائج سے مختلف ہوتے ہیں۔

ہوسکتا ہے بنیاد سے ہی آدم میں نر اور مادہ دونوں خصوصیات ہوں کیونکہ آدم ایک ایسی مخلوق تھی جس کی جسمانی ساخت خدا کی ذاتی فطرت کا عکس تھی لیکن خدا تو روحانی تھا۔ جس میں اشیاء کی کوئی تقسیم نہیں تھی جنہیں ہم اب مدِ مقابل دیکھتے ہیں۔ کلام خدا ہمیں یہ بتاتا ہے کہ خدا نے خود کو ماں اور باپ دونوں کے روپ میں پیش کیا۔

اس کے علاوہ یہ ایک مستند حقیقت ہے کہ پہلے پہل کچھ وقت تک ایمبریو (بچے کی ابتدائی خام حالت) کی جنسی طور پر کوئی پہچان نہیں ہوتی اور اس میں کسی بھی سمت میں (نر و مادہ) نشوونما پانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ پھر ہارمون غالب آجاتے ہیں اور جسم کی بناوٹ کو ایک طرف یا پھر دوسری طرف لیجاتے ہیں۔ اگر یہ دلیل دی جائے کہ x اور y کروموسومز کا طے ہوتا ہے کہ انھوں نے کس طرف جانا ہے تو پھر دو اہل عوامل کی پہچان ضروری ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہر نر جسم کے ہر خلیے میں x اور y دونوں کروموسومز ہوتے ہیں اس لیے وہ بندوق کے گھوڑے کی طرح کسی بھی سمت جاسکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ x اور y کروموسوم ہی فیصلہ کن نہیں ہیں: بلکہ کچھ دوسرے عوامل بھی ہیں جو اس موقع پر دونوں طرف کام کرتے ہیں۔

اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بڑھتا ہوا ایمبریو اپنے ساختی اختلافات کی بنا پر پہلے ہی اظہار میں نر یا مادہ جسم کا یقین نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ کچھ واضح اختلافات بہت دیر بعد نشوونما پاتے ہیں۔ کبھی کبھی اس کے لیے پیڈومورفیز (جنسی اعضا کی تشکیل) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے کیونکہ یہ ایمبریو کی نشوونما کا وہ مرحلہ ہے جس میں وہ عام حالات میں کافی دیر تک قائم رہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جسمانی اعتبار سے آدم پیڈیومورفک تھا کیونکہ اُسے ایمبریو کے طور پر نہیں بلکہ بالغ کے طور پر تخلیق کیا گیا۔ میں اس کے جسم کی بات کر رہا ہوں جس سے الگ کر کے حوا کو بنایا گیا نہ کہ اس کی اخلاقی اور ذہنی نشوونما کی۔

لیکن مجھے ایک گزشتہ مشاہدے کو دہرانے دیجیے۔ ہم سب انفرادی طور پر وہیں سے آغاز کرتے ہیں جہاں سے آدم کا آغاز ہوا۔ صرف ایک فرق ہے۔ وہ ہے پیدائش کا وقت جب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ بچہ نر ہے یا مادہ۔ پھر بھی دونوں سن بلوغت میں کچھ خدوخال نکالتے ہیں جن سے ان کا مخالف صنف ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ بڑھاپے میں بعض اوقات یہ خدوخال اس طرح دکھائی دیتے ہیں:

عورتوں میں چہرے پر بال گنجا پن اور آواز کا بھاری ہونا جبکہ کئی موقعوں پر مردوں کی عورتوں کی طرح چھاتیاں نکل آتی ہیں جسے گائنی کومیسٹا کہا جاتا ہے۔

الٰہی سرجری کے بعد اگر ہم نے آدم کو دیکھا ہوتا تو ہم اس میں اور آج کے نر میں فرق نہ کر پاتے، بھلے ہی ہم اُسے چیر پھاڑ لیتے۔ لیکن اگر ہم اسے اُس طرح دیکھتے جیسے خدا نے اسے پہلے بنایا تھا تو ہمیں واضح فرق نظر آتے۔ اگر ہمارے برعکس اُسے بالغ حالت میں تخلیق کیا گیا پھر بھی اس کا آغاز ویسا ہی تھا جیسا ہمارا۔ وہ جنسی طور پر غیر جانب دار تھا اور کسی بھی رُخ نشوونما پا سکتا تھا۔

آدم نر و مادہ ہر دو خصوصیات کا حامل تھا یہ تصور کچھ یہودی مبصرین نے قبل از مسیح میں دیا اور کچھ مسیحی مبصرین نے اُنھی کے زیر اثر بعد میں دیا۔ غیر مذہبی روایات ایسے تصور کی واضح شہادت ہے اگر چہ یہودی روایات کے برعکس وہ حماقتوں سے بھرے ہوتے ہیں اور حقیقت سے کوسوں دور ہیں۔

سب انسانوں کے ''آدم میں' ہونے کی الٰہی اہمیت:

بائبل کے مطابق یہ ایک عملی انجماد کا مجموعہ ہے کہ ان اہم مراحل میں کیا واقع ہوا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم سب یہ بات جانیں۔ لیکن کوئی بھی ان سب باتوں کی معنویت کو تباہ کیے بغیر تاریخ کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ خورد بینی آزمائشوں کی تاریخ اگر چہ بہت سادہ ہے۔ یہ سادگی فطرت کو روشن کرتی ہے مگر دنیا کو پریشان۔ لفظ بچے کے لیے ہوتے ہیں اور افکار بڑوں کے لیے۔ تمام تر اقسام اور شرائط کے ساتھ انہیں اپنی سطح کے مطابق سمجھا جاتا ہے۔

تاریخ بے حد قدیم ہے آدم جیسی مخلوق کے ظہور کی وضاحت کرنے کے لیے کسی ارتقائی عمل سے فریاد کرنا اگر انتہائی بے ہودہ نہیں تو غیر اہم ضرور ہے۔ دوہری حقیقت کی بنیاد اور پھر دو الگ الگ اجناس کی تقسیم کا نظریہ۔ ماہرین ارتقاء جانتے ہیں کہ یہ انسانی ظہور سے لاکھوں سال قبل ہوا اور انسان نے اسے ورثہ میں پایا۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان اور اس کی نجات کے مذہبی حیاتیاتی پہلو کی پہچان بہت ضروری ہے۔ آدم میں سے حوا کی تشکیل ایک انتہائی پیچیدہ جسمانی بندھن ہے جو نا صرف تجسس خیز ہے بلکہ منصوبہ نجات کو سمجھنے کے لیے بہت ضروری بھی۔

آدم کی تخلیق صرف ایک تخلیقی عمل ہو سکتا ہے۔ ہر دوسرا انسان بشمول حوا کے انسانی خاندان کے اسی مرکزی سربراہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ اگر حوا ''آدم' میں سے نہ تھی اور اُسے آدم میں سے نہیں بنایا گیا تو پھر آدم اس کا جینیاتی سربراہ نہیں اور نہ ہی خداوند یسوع مسیح اس کا نجات دہندہ ہو سکتا ہے۔

اس بنیادی حقیقت کی پہچان سے انکار کرنا مسیحی مذہب کی بنیاد کے انتہائی منطقی وقوع کی جڑ کاٹنے کے مترادف ہے۔

☆☆☆

ابدیت: انسانی منزل

حیاتیاتی اور الٰہی تصورات

اِس حیران کُن انسانی جسم کی ایک اور وضع ہے جو کہ موجودہ انسانی جسم کے مطالعے سے دریافت نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک سچائی ہے جسے ظاہر ہونا چاہیے۔ پیدائش میں ایک پیراہمیں ایک نئی مخلوق کے بارے میں انتہائی اہم معلومات دیتا ہے جسے خدا نے اپنی شبیہہ پر بنایا اور ایک باغ میں ایک بابرکت گھر دیا، جوخوبصورت درختوں سے بھرپور تھا۔ اس باغ کے درمیان میں دو اہم درخت تھے یعنی زندگی کا درخت اور اچھائی اور بُرائی کے علم کا درخت جس کے بارے میں خدا نے اسے خبردار بھی کیا۔

> اور خداوند خدا نے انسان کو باغِ عدن میں رکھا کہ اس کی باغبانی اور نگہبانی کرے۔ اور خداوند خدا نے انسان کو حکم دے کر کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل کھا سکتا ہے۔ لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا نہ کھانا کیونکہ جس دن تو اس کا کھائے گا تو ضرور مرے گا۔ پیدائش (2:15,16,17)

البتہ اس کی بیوی نے اس کا پھل کھالیا جب آدم اور اس کی بیوی نے منع شدہ پھل کھالیا تو محض انھوں نے اپنی زندگیوں کو مختصر ہی نہیں کیا بلکہ وہ وقت سے پہلے مر گئے۔ اُنھیں اُن کے اجسام میں مکمل نئے اور بیرونی عنصر یعنی موت کے ساتھ متعارف کروایا گیا۔

کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر وہ یہ پھل نہ کھاتے تو وہ اس جسم میں ہمیشہ کے لیے زندہ رہ سکتے تھے؟ پیدائش 3:22 میں اسکا جواب ہے ''ہاں''۔ لیکن اس اقرار کو اہلیت درکار ہے کیونکہ اس طرح وہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہ سکتے تھے۔ اس لیے کلام مقدس کے مطابق ہمارے جسم کسی دوسری شخصی حالت میں ہیں۔ اس حالت کا حصول ایک انقلابی تبدیلی بلکہ ایک طرح کی پیوند کاری ہے، اور جسمانی بقاء لازوال مقام پر ہے۔

اس طرح جسمانی ابدیت کی دو سطحیں ہیں ایک یہ کہ جسم کو مرنے کی ضرورت نہیں اگرچہ اسے ارادۃً موت کے لیے بنایا گیا: دوسری یہ کہ حالات کچھ بھی ہوں جسم مر نہیں سکتا۔

پیدائش 3:22-24 کا متن ہے:

> اور خداوند خدا نے کہا کہ دیکھو آدمی نیک و بد کی پہچان میں ہماری مانند ہو گیا، اور اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور شجرِ حیات سے بھی کچھ لیکر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے، اس لیے خداوند خدا نے اس کو باغِ عدن سے باہر کر دیا۔ تا کہ اس زمین کی جس سے وہ لیا گیا تھا اس کی کھیتی کرے اور اس نے آدمی کو باہر نکال دیا اور باغِ عدن کے مشرق میں اس نے کاروبیم کو شعلہ زن اور برق فشاں تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے رکھا کہ شجرِ حیات کی راہ کی نگہبانی کرے۔

اس سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ اگر چہ منع کیا ہوا پھل پہلے ہی آدم اور حوا کے اجسام میں مہلک اثر کر چکا تھا، پھر بھی یہ نقصان اور بڑھ سکتا تھا اگر وہ باغ میں ہی رہتے اور شجرِ حیات تک پہنچ جاتے۔ کیونکہ شجرِ حیات سے کھانے کے بعد وہ اپنی حاصل کردہ موت سے تندرست ہو جاتے اور ہمیشہ زندہ رہتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جسم تو صحت یاب ہو جائیں مگر ان کی بدعنوان روحیں نہیں۔ مکاشفہ 22:2 میں شجرِ حیات کا ذکر پھر ملتا ہے اور ہمیں پتا چلتا ہے کہ اس کے پتے شفا کے لیے تھے۔ یہ احتیاط روحانی زندگی کی صحت کے بچاؤ کے لیے نہیں ہو سکتی (جیسا کہ کچھ لوگوں نے سوچا ہو گا) یقیناً یہ کوئی بڑا خطرہ ہو گا کہ ہم اپنی موجودہ حالت میں ارواح کے ساتھ پیدا کیے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی ہمارا جسم قابلِ نجات ہے۔ یہ ضرور روحانی صحت کے بغیر جسمانی صحت کا خطرہ ہو گا، اس وجہ سے ہنگامی صورتحال پیدا ہوئی۔

پیدائش 3:22 میں یہ ہنگامی صورتحال واضح ہو جاتی ہے، مقدس مصنف ان واقعات کو اور اس پُر زور بے دخلی کو دیکھ کر چونک اٹھا ہو گا۔ آیت 23,24 دونوں میں باہر نکال دینے کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

اس طرح جسمانی طور سے دو ابدی مخلوقات اب فانی ہو چکی تھیں، اور ان کا فنا ہونا ان کی زوال پذیر روح کے اثرات کے خلاف ایک حفاظتی عمل تھا۔ اب موت صرف سزا ہی نہیں بلکہ علاج بھی تھی: جسمانی موت کا سُست عمل روح کی تجدید ہے۔ آخر میں موت نے ان کو ''گنہگار جسم'' سے چھٹکارہ دلا دیا، اور ہمیں بھی یوں ہی چھٹکارہ ملے گا۔

عارضی ابدیت: ایک حیاتیاتی انجیلی حقیقت

جدید حیاتیاتی علم کی روشنی میں، کیا واقع ہی ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی بھی طرح کا جسم اس طرح سے تعمیر ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہے اور کبھی تباہ نہ ہو؟ اس کا حیران کُن جواب ہے، ''ہاں''۔ یہ مکمل طور پر ممکن ہے! آیئے اس تقریباً ناقابلِ یقین حقیقت کو زیادہ قریب سے دیکھتے ہیں، اور اس دعویٰ کے لیے ثبوت پیش کرتے ہیں۔ جسم میں غیر اختتام پذیر زندگی کی صلاحیت، اگر حادثے نہ ہوں، تو وراثتی ہے۔

ایک اور کتاب میں مصنف نے اس موضوع پر تصوراتی لحاظ سے بحث کی ہے یہاں پر اس کو مختصر طور پر دیکھنا ہی کافی ہو گا تا کہ پڑھنے والا اس واقع کی حقیقت کو سمجھ جائے اور یہ بھی سمجھ جائے کہ موجودہ حالت میں اسے کیسے لاگو کرنا ہے۔

اس بات کو سمجھنا بہت ضروری ہے کیونکہ جسمانی ابدیت کا مطلب یہ نہیں کہ جسم اپنی اس تنظیم کے ساتھ مر نہیں سکتا، ایک لافانی مخلوق کو مارا جا سکتا ہے۔ ایک فانی اور لافانی مخلوق میں بنیادی فرق یہ ہے کہ فانی مخلوق مقررہ وقت میں مر جائے گی، جبکہ لافانی مخلوق صرف مار دینے سے مر سکتی ہے۔ لیکن مرنے کی ضرورت نہیں اگر زندگی کے یقینی حالات باقی رہیں۔

البتہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں ''یہ وہ نہیں ہے جو میں لفظ ابدیت سے سمجھتا ہوں''۔ بلکہ یہ بیان اس طرح ٹھیک ہے کیونکہ عام طور پر ابدیت کا لفظ جسم کے لیے نہیں بلکہ روح کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک ماہر حیاتیات کے مطابق جسمانی ابدیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ موت اٹل نہیں ہے نہ ہی زندہ رہنے کا قدرتی انجام ہے اور نہ ہی کسی جاندار کی منزل بلکہ زندگی کی ملکیت کے لیے یہ خالصتاً ایک بیرونی عنصر

ہے۔

بائبل کے مطابق یہ ایک نچلے درجے کی جسمانی ابدیت ہے یہ ایک عارضی ابدیت ہے جو یقینی شرائط پر منحصر ہے، یہ اس طرح اعلیٰ ابدیت سے کم تر ہے جو کامل اور لاتبدیل ہے۔ابدیت کا اعلیٰ درجہ حیاتیات سے نہیں الٰہیات سے تعلق رکھتا ہے۔

اس کی وضاحت کرنے کے لیے ان جانداروں کا خاص حوالہ مددگار ہوگا، جو جسمانی ابدیت کے نچلے درجے کی مثال دیتا ہے۔اور پھر یہ ظاہر کرتا ہے کہ کامل ابدیت اس نچلے درجے سے کیسے مختلف ہے۔

اس دنیا میں کروڑوں مخلوقات ہیں جو بیالوجی (حیاتیات) کے مطابق ابدی ہیں۔ جہاں تک علم ہے یہ مخلوقات طبعی موت نہیں مرتیں، جب وہ ایک یقینی جسامت کو پہنچتی ہیں (تقریباً ان کی شروع کی جسامت سے دوگنا) وہ سادگی سے دو حصوں میں بٹ جاتی ہیں اور خوشی خوشی اپنی راہ لیتی ہیں۔لہٰذا دو افراد موت نہیں چکھ رہے نہ ہی اپنے پیچھے کوئی میت چھوڑتے ہیں، وہ اُن کے اپنے والدین ہیں: ''باپ'' ایک بیٹا پیدا نہیں کرسکتا لیکن اس کے دو بیٹے بن جاتے ہیں۔اس عمل میں پیدائش ملوث نہیں یہ صرف ایک جاندار کی سادہ تقسیم ہے جو تقسیم ہوکر دو بن جاتے ہیں، یہ عمل بنا ختم ہوئے چلتا رہتا ہے۔ یہ یک خلوی مخلوقات ہیں اور ماہر حیاتیات انہیں اچھی طرح جانتے ہیں جیسے کہ ایمبا اور پیرامیشیا اور کچھ دوسری اقسام۔

چونکہ ہر ایک دو میں تقسیم ہوجاتا ہے اور پھر دوگنی جسامت تک بڑھ جاتا ہے اور پھر سے ٹوٹ جاتا ہے اس لیے وہ جلد ہی زمین کو برباد کرسکتے تھے، کیونکہ ان کو حادثات نہیں آتے نہ ہی کوئی جسمانی زخم آتے ہیں اور نہ ہی کسی دوسرے جاندار کا شکار بنتے ہیں۔لیکن وہ وراثتی اسباب سے نہیں مرتے اور اس حوالے سے ماہر حیاتیات انھیں انتہائی لافانی سمجھتے ہیں۔اس دنیا میں کروڑوں مخلوقات ہیں جو بنا حادثاتی موت کے تماشے کے زندہ ہیں۔

اب یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے ''ہاں یہ سب ٹھیک ہے، لیکن وہ انتہائی سادہ اور یک خلوی جاندار زندگی کے ننھے قطرے ہیں اور وہ بڑے جانداروں جیسے کہ انسان سے بہت مختلف ہیں''۔بالکل صحیح، پھر بھی نہ ہی ایمبا اور نہ ہی پیرامیشیم اتنے سادہ ہیں جتنے دکھائی دیتے ہیں۔

ان چھوٹی مخلوقات کا سو سال سے زائد مطالعہ ہو چکا ہے۔ان کے رویوں کے مشہور محققین میں سے ایک ایچ ایس جینگز تھا جس نے 1910 میں اپنی دریافتوں پر ایک کتاب شائع کی۔وہ ان کا کچھ سالوں تک مشاہدہ کرتا رہا جبکہ اس کی آنکھ خوردبین سے گھنٹوں چپکی رہتی، اس کے نتائج قابلِ غور ہیں۔اس نے دریافت کیا کہ ایمبا نے چال چلن کے انتہائی ترقی یافتہ آثار ظاہر کیے ہیں۔وہ لکھتا ہے کہ اگر ایمبا کو ایک کتے جتنا بڑا کرلیا جائے تو اس کے چال چلن میں غصہ، ارادہ، مایوسی، ہچکچاہٹ، توجہ حتیٰ کہ ذہانت بھی نظر آئے گی۔

50 سال پہلے ایک اور مشاہدہ بین جے بائڈ بیسٹ نے جینگز کے نتائج کی مکمل تصدیق کے۔اس نے اس فہرست میں جذبات کا بھی اضافہ کیا جیسے کہ اکتاہٹ، بغاوت، حتیٰ کہ ''پہچان کی آگاہی بھی'' (جو کہ موثر طور پر سادہ شعور ہے)۔

اس طرح کی لافانی مخلوقات بلاشبہ قابلِ غور انفرادیت ظاہر کرتی ہیں جسے ذاتی شناخت کہا جاتا ہے، اور پھر بھی وہ ایک غیر معینہ

زندگی جی رہے ہیں۔ اور یاد رکھیے کہ ہم ان جانداروں کی زندگی کی بات کر رہے ہیں جو اپنی یک خلوی فطرت اور خوردبینی جسامت کے باوجود زندہ ہیں۔ ہمیں ان کی جسامت سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے، کیونکہ نکولس میل برانچ نے واضح کیا کہ جب اس نے پہلی بار خوردبین میں سے دیکھا تو یہ ''جسامت کا اختتام'' تھا، آخر زندگی کتنی بڑی ہے؟

ہم آسانی سے ایک نقطہ پر پہنچ سکتے ہیں جو بہت سے لوگوں کو حیرت میں ڈال سکتا ہے: یعنی اسقدر حساس مخلوق اور پھر بھی لافانی... اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کی جسمانی ابدیت ''زندگی کی حقیقت'' ہے جیسے کہ پروفیسر ایچ جے مُولر انتہائی سادگی سے کہتا ہے، ''طبعی موت پروٹوپلازم کے وراثتی اصول کا اظہار نہیں''۔ جولین ہگزلے نے اس کی پھر تصدیق کی جب اُس نے لکھا ''کام کرنے والا پروٹوپلازم خود بخود فانی نہیں ہے''۔

لفظ پروٹوپلازم کا سادہ سا مطلب ہے زندگی کا سامان، اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ پروٹوپلازم غیر فانی طور پر نمودار ہوا ہے، تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایسی اقسام کو مرنے کی ضرورت نہیں۔ بیرونی فانی واردات سے محفوظ ہونے کی وجہ سے یہ مخلوقات سادہ طور سے نہیں مرتیں، بلکہ وہ ہمیشہ کے لیے تقسیم ہوتی اور بڑھتی رہتی ہیں۔ صرف حادثاتی موت ہی انھیں زمین کو برباد کرنے سے روکتی ہے۔ وہ بوڑھے ہو کر نہیں مرتے جیسا کہ ایک خاص وقت میں ہم اور ہم سے ملتے جلتے ہمارے پالتو جانور، اور وہ طبعی موت بھی نہیں مرتے۔

آدم کے معاملے میں بلاشبہ خدا نے اُسے ایک ایسا جسم بخشا جس میں ایسے تسلسل کی صلاحیت تھی جس کا کوئی اختتام نہ ہو۔ تجدید اور مرمت کے عوامل ہمیشہ ہو سکتے تھے۔ یہ واضح ہے کہ وہ مر سکتا تھا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ مر گیا اگرچہ ایک ہزار سال سے پہلے نہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہے کہ وہ کبھی نہ مرا ہوتا اگر اس نے گناہ نہ کیا ہوتا۔ اگر یہ بات سچ نہیں تو نافرمانی کی سزا اس کے لیے کوئی سزا نہ ہوتی۔ سزا کی دھمکی کے بغیر کوئی نافرمانی کی حوصلہ شکنی نہیں کر سکتا بھلے ہی وہ نافرمانی کسی بھی طرح کی ہو۔

ایسا تجویز کیا جاتا ہے کہ یہ دھمکی خود بخود موت نہیں بلکہ قبل از وقت موت تھی۔ لیکن یہ وضاحت مکمل غیر تسلی بخش ہے کیونکہ آخری آدم کی موت بھی قبل از وقت تھی، کچھ اور نہیں۔ قبل از وقت کی دی ہوئی زندگی مددگار زندگی نہیں یہ محض مختصر کی ہوئی زندگی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آخری آدم بھی پہلے آدم کی طرح غیر اختتام پذیر زندگی کی صلاحیت کے ساتھ بنایا گیا۔ یہ بات ہمیں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کرتی ہے کہ پہلے آدم کی بھی یہی حالت ہوگی۔ آدم کی موت قبل از وقت نہ تھی بلکہ خود ہی تھی۔ ''ایک آدم کا گناہ دنیا میں داخل ہوا اور گناہ کے ذریعے سے موت...'' (رومیوں 5:12)، اور اس طرح حاصل کردہ موت آدم سے پیدا ہوئے سب کا مقدر بن گئی۔

آدم اور حوا کو ایسے اجسام کیساتھ تخلیق کیا جانا تھا جن میں غیر اختتام پذیر تسلسل ہو، ان اجسام کو بڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اسطرح خود انسانی جسم کے نجات دہندہ کو بھی مرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جبکہ وہ سب سے پہلے تخلیق کردہ اجسام کا تماشہ تھا۔

اس لیے انتہائی سمجھداری سے ہمیں ابدیت کو پھر سے بیان کرنا ہے کیونکہ یہ پہلے آدم کے جسم پر بھی لاگو ہوتی ہے اور آخری آدم کے جسم پر بھی۔ پہلے آدم میں عارضی ابدیت تھی ایک ایسی ابدیت جس کا انحصار یعنی شرائط کی تکمیل پر تھا، لیکن ایک حقیقی ابدیت حیاتیاتی لحاظ سے ہے۔ یہ عارضی حالت اپنے احساس کے ساتھ زوال میں کھو گئی، لیکن ایک کنواری سے پیدا ہوئے مسیح میں اسے بحال کیا گیا۔

یہ حادثاتی واقعہ فرمانبرداری پر منحصر ہے، یہ اس حقیقت پر بھی منحصر ہے کہ ہمارے اجسام عاجز ایبا کی طرح زخمی ہونے کے قابل ہیں اور ہم مہلک طور پر زخمی ہو سکتے ہیں، ہم فانی زخموں سے غیر متاثر نہیں ہیں۔ زندگی کے یہ عوامل نا قابلِ مرمت نقصان تھے، جو آدم میں ہمیشہ کے لیے جاری رکھے جا سکتے تھے۔

آدم اور حوا دونوں مر سکتے تھے اور مقررہ مدت میں وہ مر گئے: لیکن اگر وہ فرمانبردار رہے ہوتے، تو یہ معیادی واقعہ کبھی واقع نہ ہوتا۔ ان کی موت اس لحاظ سے ایک حادثہ نہ تھی جیسے ایبا کے لیے۔ یہ ارادۃً نافرمانی کی سزا تھی، ایک ایسی سزا جس نے ان کی تنظیم میں ایک اندرونی نیا نقص متعارف کروایا۔ یہ وراثتی اسباب سے مر گئے کیونکہ ایک مہلک نتائج کا پھل کھانے سے ان کی زندگی کی مشینری کو نقصان پہنچا اور یہ ان کے بعد آنے والے سب لوگوں کی، ماسوائے ''ایک'' کے وراثت بن گئی۔

مکمل ابدیت: ایک الٰہی حقیقت

ایک عارضی ابدیت جس کا حوالہ ہم نچلے درجے کی ابدیت سے دے چکے ہیں بائبل اور بائیولوجی دونوں کا تصور ہے۔ لیکن ایک اور اعلیٰ درجے کی قسم بھی ہے۔ یہ ایک ایسی ابدیت کا حصول ہے جس میں ہمیں زیادہ شاندار اور مکمل طور پر نا قابل مجروح حالت میں، مُردوں میں سے زندہ کیا جائے گا۔ ابدیت کی یہ اعلیٰ قسم قطعی ہے۔ ہمیں ایسی حالت میں رکھا جائے گا جہاں نہ مرنے کی ضرورت ہو گی نہ مرنے کی قابلیت! موت ایک ماضی ہو گا۔ البتہ یہ پہلے کی طرح حیاتیاتی نہیں بلکہ الٰہی نظریہ ہے تاہم یہ صرف مُردوں میں سے زندہ کیے ہوئے جسم پر لاگو ہوتی ہے۔ ہمارے پاس ایک اصلی جسم ہو گا جیسا کہ خداوند یسوع مسیح کا زندہ کیا ہوا جسم۔

چرچ فادران نے ان معاملات پہ بڑے پیمانے پر بحث کی ہے، جیسے کہ اینٹی اوک کے تھیوفلس (c.115-c.181) نے کی:

> لیکن کوئی ہم سے یہ کہے گا، ''کیا انسان فطرتاً فانی بنایا گیا؟'' یقیناً نہیں، پھر وہ لافانی تھا؟ ہم اس کی بھی تصدیق نہیں کرتے۔ لیکن کوئی یہ پوچھے گا، ''کیا پھر وہ کچھ بھی نہیں تھا؟'' یہ بھی کوئی بات نہ ہوئی، فطرتاً وہ نہ فانی تھا اور نہ ہی لافانی کیونکہ اگر خدا نے اسے ابتدا ہی سے لافانی بنایا، تو پھر اس نے اسے خدا بنایا ہو گا۔ اگر اس نے اسے فانی بنایا تھا تو پھر موت کا سبب خدا ہے۔ نہ وہ فانی تھا نہ ہی لافانی بلکہ خدا نے اُسے ایسا بنایا تھا جس میں دونوں خصوصیات تھیں، تاکہ اگر خدا کا حکم مان کر ابدیت کی طرف رجحان کرے تو خدا اسے انعام میں ابدیت دے اور وہ خدا بن جائے۔ دوسری طرف اگر وہ خدا کی حکم عدولی کر کے موت کی طرف مُڑنا چاہے تو وہ اپنے لیے خود موت کا باعث بنے۔

صدیوں بعد اگسٹس (340-430) نے اشیاء کو گہرائی سے سوچا اور ضرب المثل کا موثر طور پر استعمال کرتے ہوئے اس نے آدم کی تخلیق کی فطرت کے بارے میں لکھا:

> ''مرنا'' آدم کے لیے ناممکن نہیں تھا مگر ''نہ مرنا'' ممکن تھا۔

بعد میں اُس نے اس معاملے پر اور روشنی ڈالی اور محسوس کیا کہ ایک اعلیٰ درجے کی ابدیت انسان کی منتظر ہے جب ہم اسے حاصل

کرلیں گے،تو ''نہ مرنا' نہ صرف ممکن ہوگا بلکہ 'مرنا' انتہائی ناممکن ہوگا۔

یہ مقصد خدا کے سب لوگوں کے لیے ہے۔کیونکہ ہر شے کو تیار کرنے والا خدا خود ہے۔

ابدیت :ایک حیاتیاتی حقیقت اور ایک الٰہیاتی ضرورت

مختصر یہ کہ آدم کا جسم غیر اختتام پذیر تسلسل کی صلاحیت کے ساتھ بنایا گیا۔ماہر حیاتیات یوں کہیں گے کہ اس کی زندگی اس بات پر محیط نہیں تھی کہ وہ کچھ یقینی ہدایات کی تعمیل کرے۔

عارضی ابدیت کی یہ صلاحیت اس لحاظ سے ضروری تھی کہ نافرمانی کی صورت میں بھی بنی نوع انسان قابل نجات ہو اور نجات دہندہ اس حالت میں ہو کہ وہ ہماری جگہ موت چکھ سکے۔اس مقصد کے لیے نجات دہندہ کا جسم ہونا چاہیے۔

(۱) آدم کے جسم کا نمائندہ اور انسان کی مانند

(۲) کسی وراثتی سبب سے موت کے ماتحت نہ ہو

دوسری وجہ پہلی وجہ سے زیادہ ضروری تھی۔نجات دہندہ کو دونوں شرائط پوری کرنی ہیں۔پہلی یہ کہ خدا کے ارادے کے مطابق وہ انسان کا صحیح نمائندہ ہو،اور دوسری یہ کہ وہ خود کو ایک ایسی موت کے لیے پیش کر سکے جو کہ محض قبل از وقت نہ ہو بلکہ دوسروں کے بدلے میں ہو۔پہلے آدم کے جسم کے ساتھ یہ صورتحال پہلے سے مقرر کردہ تھی۔

منجی کی موت ضروری متبادل ہونی چاہیے،نہ کہ صرف قبل از وقت۔قبل از وقت موت ایک طرح سے ایسی موت ہے جیسے کسی محاذ پر کسی فوجی کی شہادت،یا کوئی خودکشی یا پھر جوانی میں کار حادثہ۔ہر طرح کی موت ''قبل از وقت متوقع ہے''۔الٰہی نظریے میں متبادل موت میں ''قبل از وقت موت'' کا کوئی عنصر نہیں۔کوئی ایسا شخص جسے متبادل کے طور پر مرنا ہو تندرستی میں کبھی موت کی توقع نہیں کرسکتا۔

یہ متبادل موت کے لیے سچ ہے کیونکہ اسے صرف لافانی مخلوق پر لاگو کیا جاسکتا ہے جس کے مرنے کا وقت متوقع نہ ہو۔قبل از وقت موت مقررہ وقت میں اٹل ہے اس لیے اس کا نفاذ فانی مخلوقات پر ہوتا ہے۔ایسی موت کا مطلب زندگی کا اختصار ہے۔متبادل موت اختصار نہیں بلکہ انقطاع ہے (دانی ایل 19:26) یہ ایک ایسی زندگی کا التوا ہے جسے ہمیشہ جاری رکھا جاسکتا تھا لیکن ارادۃً کسی اور کے لیے ختم کردی گئی۔

چونکہ آخری آدم کیلیے موت کسی بھی طرح اٹل نہیں تھی تو یہ پہلے آدم کے لیے بھی اٹل نہیں ہوسکتی۔وگرنہ آخری آدم پہلے آدم کا، جسے خدا نے پیدا کیا صحیح نمائندہ نہیں تھا۔موت کا نفاذ ضروری تھا تا کہ وہ متبادل کے طور پر مر سکے:اس نفاذ کا تعلق بیرونی ذمہ داری سے تھا تا کہ اندرونی پروگرام سے متبادل موت کبھی بھی قبل از وقت موت نہیں ہے ،یہ آزمائش کے مکمل مختلف درجے ہیں۔

نظریہ ارتقاء ان دونوں آدموں کا جوابدہ نہیں ہوسکتا۔نظریہ ارتقاء بتاتا ہے کہ تمام اعلی درجے کے جاندار مقررہ زندگی کے ساتھ بنائے گئے ہیں اور ان اصناف کی فطرت کے مطابق ایک خاص وقت میں ان کی موت طے ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ارتقاء کے عمل کا جاری رہنا ضروری ہے اگر انہیں مقابلہ نہ کرنا پڑے اور پرانی اقسام کی جگہ نہ لینی پڑے تو نئی اور زیادہ ترقی یافتہ اقسام کی ابتدائی حالت میں بقاء کے

راستے ہر دم کھلے رہنے چاہییں ۔صرف کرداری ارتقاء کے عوامل کو مان کر ہی اس حساس ترقی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔موت کے بغیر تبادلے کی اور تبادلے کے بغیر ارتقائی ترقی کی کوئی حیثیت نہیں۔

ارتقاء انسان کے ظہور کی جوابدہ نہیں ہو سکتی۔کیونکہ صرف انسان ہی ایسی تنظیم رکھتا ہے کہ وہ زندگی کے تسلسل کی ضمانت دے سکے اگر وہ فرمانبرداری کی مقررہ شرائط کو پورا کرتا ہے۔

☆☆☆

فانی بنائے گئے انسان کی نجات

موت: زندگی کی طبعی یا غیر طبعی حقیقت

اگر یہ سوال کیا جائے کہ آدم کی نافرمانی پر اسے کس قسم کی موت دی گئی تو گرجا گھروں کی اعلیٰ نشستوں پر براجمان لوگوں میں سے تقریباً ہر کوئی کہے گا، روحانی موت۔ قائلین علم الٰہیات اس بات پر متفق ہیں کہ جسمانی موت بھی آدم کی نافرمانی کی وجہ سے ہی متعارف کروائی گئی لیکن اکثر لوگ زوال کے جسمانی پہلوؤں کو کم اہم سمجھتے ہیں، اگر چہ انسان کی جسمانی موت اتنی ہی قدرتی ہے جتنی ماندہ فطرت کے لیے۔ سزا کے طور پر دی گئی موت خود بخود نہیں تھی بلکہ قبل از وقت تھی یہ ایک ایسی موت تھی جو جلد متوقع تھی۔

مسیحی مصنفین کا ایک ایسا گروہ بھی ہے جن کا رجحان الٰہیات کی نسبت سائنس کی طرف زیادہ ہے۔ وہ پیدائش کو ان معنوں میں لے جاتے ہیں کہ جسمانی موت انسانی گناہ کی سزا ہے جس کا اطلاق نہ صرف انسان پر ہوتا ہے بلکہ حیوانی اور نباتاتی دنیا پر بھی۔

قائلین ارتقاء موت کو سزا کے عنصر سے مربوط نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ موت ہر زندہ چیز کے لیے مشترک ہے اور اس کا تعلق انسان کی نافرمانی سے ہرگز نہیں ہے۔

صحیح کون ہے؟

جسمانی موت کائناتی کیوں ہے؟

بلحاظ ساخت اصل سبب کیا ہے؟

کیا دوسرے جانداروں کی موت بھی اسی وجہ سے آتی ہے جس طرح سے انسان میں؟

اس باب میں ان چار سوالات پر بات کی جائے گی اور انہیں مختصر طور پر مگر سائنسی تحقیقات کے بنیادی زاویوں سے دیکھا جائے گا۔

کیا موت زندگی کا ناگزیر حصہ ہے؟

یونانیوں کے نزدیک جوانی میں مرنا اور اسے ممکن حد تک التواء میں ڈالنا، مثالی تھا۔ اس سے بالاتر وہ بڑھاپے میں مرنا ناپسند کرتے تھے اور ایسا ہی ہم بھی کرتے ہیں۔

زیادہ تر لوگ جب بڑھاپے کو پہنچتے ہیں تو موت کی نسبت خراب صحت اور بڑھاپے سے زیادہ ڈرتے ہیں جو کہ ان کی پیش رو ہے۔ انسان کے برعکس جانوروں کی بڑی اکثریت نہ تو اس لمبے اور سست زوال کی پیش بینی کرتی ہے اور نہ ہی تجربہ، بلکہ اپنا جوش اور اطمینان انجام کے آخر تک بحال رکھتے ہیں چند ایک گھریلو جانور بوڑھے ہو کر مرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے وحشی پن کی نسبت زیادہ زندہ رہے ہیں۔ یہ صورتحال غیر طبعی ہے۔

عام جانوروں کی بقاء کے معاملات یوں ہیں کہ ان میں قوت حیات اور طاقت کے زوال کا فائدہ ان کے مقابلے پر اترتے ہوئے دوسرے جاندار اٹھا لیتے ہیں اور نتیجتاً ایک جاندار یا دوسرا مر جاتا ہے، انسان کو اس سُست رو موت سے استثنیٰ حاصل ہے۔ اس حقیقت پر ہمیں بعد میں تبصرہ کرنے کا موقع ملے گا۔ فی الحال مجھے اطلاقات سے ہٹ کر مجھے جسمانی موت کو زندگی کی حقیقت کے طور پر دیکھنا ہے۔

اس بحث کے دوران یہ بات مستقل ذہن میں رکھیے کہ موت زندہ رہنے کا ناگزیر نتیجہ نہیں ہے زندگی کی کچھ زیریں اقسام (ماسوائے پودوں کی اقسام جیسے کہ درخت وغیرہ) اپنے جوش میں زوال کے بغیر ہی ہزاروں سال تک باقی رہ سکتے ہیں۔ جاپان میں اب کچھ درختوں کا علم ہوا ہے جو سات ہزار سال تک پرانے ہو سکتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ہماری دنیا کے بہت سے ایبا کا تعلق آدم کی دنیا سے ہو۔ ان کے علاوہ کچھ خلیے جیسے کینسر کے خلیے ہمیشگی کے آثار رکھتے ہیں۔ زندگی اور موت خود بخود ایک دوسرے کے ہمجولی نہیں۔

موت کی تعریف:

مناسب یہ ہے کہ ہم موت کی تعریف سے شروع کریں مگر یہاں ہمیں مشکل آپڑتی ہے۔ پہلی بات یہ کہ موت کی ٹھیک ٹھیک تعریف کرنا مشکل ہے، جب تک ہم پہلے زندگی کی تعریف نہ کرلیں۔ جو کہ ابھی تک ہمارے پاس نہیں ہے۔ کوئی خیال کرے گا کہ زندگی کی تعریف کرنا بہت آسان ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ لوگوں کا ایک گروہ مانتا ہے کہ جاندار اور بے جان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

وہ اس سنجیدگی میں اتنی دور چلے گئے کہ کہتے ہیں، اگر خلیات زندہ ہیں پھر ان کے اجزاء بھی زندہ ہیں، اور اگر اجزاء زندہ ہیں تو پھر اس چیز کے ایٹم بھی زندہ ہیں جس سے وہ بنی ہے۔ اگر ایٹم زندہ ہیں تو اس کے ذرات بھی زندہ ہونے چاہییں یعنی پروٹان، الیکٹران اور باقی سب بھی زندہ ہونے چاہییں۔ غیر جاندار کی جاندار میں تبدیلی کی یہ ٹوٹی ہوئی کڑی خالصتاً مادہ پرست فلسفیوں کی منزل کو بے رحمی سے اسی منطقی نتیجے کی طرف لے جاتی ہے۔

کسی نے غصے میں تجویز دی کہ کسی چیز کو ٹھوکر مار کر آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ زندہ ہے یا نہیں، اگر اس کا ردعمل پیش گوئی کے قابل ہے اور پس منظر کے بارے کافی معلومات دیتا ہے پھر آپ اس کو مردہ تصور کر سکتے ہیں۔ اگر یہ پیش گوئی کے بالکل قابل نہیں تو پھر آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ زندہ ہے۔ طبی جادوگری کے اس دور میں اس بات کو جانچنا انتہائی اہم ہو گیا کہ کوئی انسان مر گیا ہے یا گہرے سکتے میں چلا گیا ہے۔ حالیہ سالوں میں کئی بار ایسا ہوا کہ جب سرجن ان مُردوں کے گردے نکال رہے تھے جنہیں ڈاکٹروں نے مردہ قرار دے دیا تو وہ آپریشن ٹیبل پر اٹھ کر بیٹھ گئے اور پوچھنے لگے کہ وہ کس دنیا میں ہیں۔ مزید برآں موت کی تصدیق اب اور زیادہ مشکل ہو گئی ہے جب کہ زندگی کو مصنوعی طور پر قائم رکھنے کے ذرائع بھی موجود ہیں۔ کیرن کوئلن کا معاملہ اس سچائی کی تکلیف دہ وضاحت ہے۔

1975 میں کیرن نے جب وہ 13 سے 19 سال کی عمر میں تھی، مہلک شراب اور سکون آور چیزیں کھالیں۔ اُسے ان چیزوں کا شعور نہیں تھا۔ (جیسے کہ 1981 کا معاملہ) وہ احساس سے عاری ہے، بے حس و حرکت ہے، گھٹنوں پر جھکی ہے، کھال میں لپٹا ہوا ڈھانچہ ہے، کاک ٹیل سے اس حد تک صحت یاب ہو چکی ہے کہ سانس کے آلے کے بغیر زندہ ہے۔ کسی کو یہ یقین نہیں ہے کہ وہ کبھی شعوری طور پر

بھی صحت یاب ہوگی۔اس اثناء میں اس ظالمانہ علاج کا بل تین ملین ڈالر سے بھی بڑھ گیا ہے،اگر یہ تیاری ذاتی ہوسکتی تو موت کو نہیں بلکہ زندگی کو رد کردیتی جو کہ انسانی زندگی میں ایک نئی چیز ہے۔ایسا لگتا ہے کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں یا شاید ہمت نہیں کہ وہ اس شمع کو بجھادے،اور انسانی کھوٹ کی المیہ مثال کو انجام تک پہنچادے۔کیرن کوئلن کے معاملے میں آپ زندگی تعریف کیسے کریں گے اور موت کی تعریف کیسے کریں گے۔

لیکن حالیہ سالوں میں موت کی تعریف کرنے میں کچھ سنجیدہ کوششیں کی گئی ہیں۔1968 میں ہارورڈ میڈیکل سکول نے ایک بیان کی صورت میں اس کا جواب دینے کی کوشش کی جس کا موضوع تھا: ناقابل واپسی ''سکتے کی تعریف''اس میں چار بنیادی معیارات کی فہرست بنائی گئی ہے۔

۱۔ دردناک حالت میں بھی صوتی طور پر یا ردعمل کی دوسری کیفیت جیسے کہ کراہنا ،اعصابی کھچاؤ،اور تیز تنفس سے بھی بیرونی محرکین کے تحت مکمل بے حسی اور بے ردعملی۔

۲۔ کم ازکم ایک گھنٹے تک حرکت کا نہ ہونا اس میں نبض اور تنفس بھی شامل کیا جائے گا،مصنوعی تنفس کو بھی منقطع کر کے دیکھا جائے گا کہ تین منٹ کے دورانیے میں سانس لینے کی کوئی کوشش کی جاتی ہے۔

۳۔ لاشعوری ردِاعمال کی غیر موجودگی: آنکھ کی پُتلی کا رک جانا اور کوئی حرکت اور ردِعمل ظاہر نہ کرنا خواہ روشنی تیز ہی کیوں نہ ہے۔معالجاتی عمل میں چونکہ آنکھ کی پھیلی ہوئی پُتلی کا رُکنا واضح ہے لہٰذا ایسی حالت میں کوئی غیر یقینیت نہیں ہونی چاہیے۔

۴۔ دماغ کے ایک حصے کی خاموشی (فلیٹ این سیفلوگرام) یعنی 24 گھنٹے تک کسی قابل پیمائش تبدیلی کا نہ ہونا۔

ہر ایک معاملے میں مفروضہ یہ بنتا ہے کہ ہائپوتھرمیا کی گواہی نہیں ملتی (90 ڈگری فارن ہائیٹ یا 32.2 ڈگری سینٹی گریڈ سے نیچے کا جسمانی درجہ حرارت)اور مرکزی عصبی نظام یوں افسردہ ہوجاتا ہے جیسے کسی سکون آور نشیلی دوا کو استعمال سے۔

کیرن کوئلن کے معاملے میں موت کی یہ تعریف پوری نہیں اترتی۔کیونکہ اس کی سانس بنا مصنوعی معاونت کے جاری تھی۔کیرن خالصتاً جسمانی حدود کے تحت زندہ نظر آرہی تھی۔ان محدود معاملات سے الگ جو غیر متوقع طور پر نمودار ہوتے ہیں۔بلاشُبہ ہمیں موت کی تعریف کرتے ہوئے مشکل پیش آرہی ہے پھر بھی موت ایک حقیقت ہے اور لاکھوں جانداروں کو آتی ہے۔

اب وقت نہیں ہے کہ ہم ان اختلافات میں پڑیں:

نیکروسس (خلیات کی جُزوی موت نہ کہ پورے جاندار کی)

مکینیکل موت (ڈاکٹر کا بتانا کہ مریض مرگیا ہے)

قانونی موت (طبی سرکاری افسر معاملات واضح کرتا ہے،تابوت بنانے والے اور وصیت بنانیوالے کو کام میں لاتا ہے)

بائیولوجیکل موت (بتاتی ہے کہ جسم پہلے ہی الگ ہوچکا ہے اور اس کو زندہ کرنے کے بہادرانہ اقدامات بیکار ہیں)

معاملہ اور پیچیدہ ہو جاتا ہے جب ہم موت کو جانوروں اور انسانوں کے حوالے سے دیکھتے ہیں کہ یہ کوئی عمل ہے یا واقعہ۔ اگر حادثہ نہ ہو تو پھر بھی یہ بات غیر یقینی ہے کہ یہ ایک واقعہ ہی ہے۔ خدا نے آدم کو بتایا "وہ یقیناً مرے گا"۔ ہمیں اس حقیقت کا اشارہ ملتا ہے کہ مرنا ایک عمل ہے اور بہت سے اب یقین رکھتے ہیں کہ ہم پیدائش کے لمحے سے ہی مر رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے جانوروں کے بارے میں بھی یہی سچ ہو اگر چہ وہ خالصتاً جسمانی اسباب سے مرتے ہیں نہ کہ گناہ سے، اضافہ آبادی پر قابو پانے کے لیے یہ ایک طریقہ کار ہے جو کہ حیوانی دورِ حیات پر مقرر ہے۔

انسان کا نقطہ انجام ہمیشہ سے ہے یہاں تک کے وہ سُست روی سے بڑھتا گیا اور ایک دن اچانک موت نے اُسے ہڑپ لیا اور اسکی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

جانوروں کے لیے موت کے فوائد:

ماہرین ارتقاء اس بات کو مانتے ہیں کہ موت زندگی کی ضروری شرط نہیں، بلکہ اسے فطرتاً ایجاد کیا گیا اور محفوظ کیا گیا ہے کیونکہ یہ ضروری بھی ہے اور مفید بھی۔ درج ذیل بنیادی وجوہات کی بنا پر اسے ضروری سمجھا جاتا ہے:

۱۔ کسی جنس کا اضافہ آبادی روکنا۔

۲۔ نظام پر بوجھ کو کم مفید اصناف ہٹا کر مزید ارتقائی ترقی کا راستہ کھلا چھوڑنا۔

۳۔ بیمار، خراب اور کم جوشیلے اراکین کو آبادی سے نکالنا تا کہ وہ اپنی نسل ہمیشہ تک جاری نہ رکھ سکیں، اور باقی ماندہ جوش کو محفوظ کرنا۔

۴۔ اونچے درجے کے شکاریوں کو خوراک مہیا کرنا جو کہ گوشت خوری سے اعلیٰ طاقت کے حامل ہوتے ہیں، اس طرح کی طاقت کی بلند تر سطح زندگی کی اعلیٰ قسم تصور کی جاتی ہے۔

آیئے ان کو ذرا زیادہ وضاحت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

(۱) اضافہِ آبادی کو روکنا

یہ واضح ہے کہ کچھ اصناف مثال کے طور پر خرگوش انتہائی تیزی سے بڑھتے ہیں بہ نسبت سٹوٹ کے جو کہ ایک یورپین نیولا ہے۔ فطرت کی اقتصادیات میں یہ بات منطقی ہے کہ دنیا اگر ایک ہی صنف سے بھر جائے گی تو مخصوص حالات میں اس صنف کی مخصوص بیماری سے مہلک طور پر متاثر ہوگی اور اسکا مکمل صفایا ہو جائے گا۔ نظام زندگی بڑے پیمانے پر منتشر ہو جائے گا یا پھر بہتات سے بڑھنے والی صنف تمام سبز خوراک کو کھا جائے گی اور جن دوسری مخلوات کے زندہ رہنے کے لیے یہ ضروری ہے وہ باقی نہ رہیں گی۔ جنگلات کے اگاؤ میں اگر ایک ہی طرح کے درخت لگائے جائیں تو یہ نادانی ہوسکتی ہے کیونکہ اس جنس کی بیماری کا خطرہ پورے علاقے کو گھیر لے گا، اور زمین کی اوپری سطح کو لوٹ لے گا۔

اسی طرح ایسا بھی نہیں کیا جائے گا کہ کسی مخالف وجہ سے نیولوں کو بلا روک ٹوک بڑھنے دیا جائے ۔وہ اپنی شکاری صلاحیت کی وجہ سے دوسری اصناف کوخطرے میں ڈال سکتے ہیں ۔

اس سے کیا ہوسکتا ہے، پروفیسر ایڈورڈ او ڈوسن سٹارفش (ستارہ مچھلی) کی موت کی مثال دیکر ایک چونکا دینے والی وضاحت پیش کرتا ہے ۔اس کی ایک قسم کی مادہ ایک سال میں ایک ملین انڈے دیتی ہے، اور صرف چند مربع گز علاقے میں ایسی پچاس مادائیں ہوسکتی ہیں اس لیے ہر سال تقریباً پچاس ملین انڈے دیئے جائیں گے ۔فرض کریں ان میں سے پچیس ملین مادائیں ہوں گی، ایک عام شرح سے یہ پچیس ملین مادائیں پچیس ٹریلین انڈے دیں گی ۔اس طرح پوری کائنات کے الیکٹرونز کی تعداد سے بڑھنے کے لیے ان مچھلیوں کو صرف 17 سال لگیں گے ۔

(۲) کم فائدہ مند اصناف کو دور کرنا

ماہرین ارتقاء کا نظریہ ہے کہ کسی بھی صنف میں ایسے افراد پیدا ہوں گے جن کی ساخت یا عادت ہلکی سی تبدیل ہوگی جن میں یہ صلاحیت ہوگی کہ وہ اپنی صنف کو حقیقی فائدہ دے سکیں ۔ایسے افراد کی تعداد بہت تھوڑی ہوگی کہ وہ اس فائدے کو بڑے پیمانے پر بانٹ سکیں ۔ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یہ فائدے کی صلاحیت دراصل ان کے لیے نقصان ہو جب تک کہ ان کی تعداد کافی نہ بڑھ جائے ۔

خوراک اور ملاپ کے لیے مقابلے کو بھی اہم تصور کیا جاتا ہے ۔اس طرح اگر پرانی نسل کے غالب ملاپ دور نہیں کیے جاتے تو نئی جنس اپنی منفرد اور مفید خوبیوں کے ساتھ اپنے آپ کو بچانے کیلیے قائم نہیں ہوگی ۔لیکن اگر پرانی نسل ایک حد تک بڑھتی ہو تو نئے آنے والوں کو بقاء اور بڑھوتری کا موقع مل جائے گا ۔

اگر ہم اس منظر کو کاروباری دنیا میں تبدیل کریں تو بالائی سطح کی نہیں بلکہ زیریں سطح کی حکمانہ ریٹائرمنٹ کی بنیاد نظر آتی ہے ۔دفتر کی اصطلاح کو آگے بڑھائیں تو اعلیٰ عملہ چھوٹے کارکنان کی ترقی کا راستہ روک کر کمپنی کو نقصان پہنچا سکتا ہے ۔

(۳) طاقت محفوظ کرنا

اس صورتحال کی عمدہ وضاحت کچھ سال پہلے کے شمالی کینیڈا سے کی جاسکتی ہے، جب انسان نے بھیڑیے کی آبادی کو ارادۃً یقینی سطح سے کم کیا تا کہ ہرن کی آبادی بڑھائی جا سکے ۔اس سے متضاد اثر بھی واقع ہوسکتا ہے، اس کی وجہ وہ مفید کردار ہے جو بھیڑیے ادا کرتے ہیں ۔جب شکاری بھیڑیوں کی تعداد کم کی جاتی ہے تو بلا شبہ ہرن کی آبادی بڑھتی ہے مگر اس اضافے میں کم صحت یاب اور بیمار ہرن بھی شامل ہو جاتے ہیں ۔جنہیں دوسری صورت میں بھیڑیے مار دیتے تھے ۔نتیجتاً ہرنوں کی بہبود اور قوت حیات کم ہو جاتی ہے اور وہ متوقع حد سے زیادہ تعداد میں مرنا شروع کر دیتے ہیں ۔ان کے ملن کم کامیاب ہوتے ہیں اور بچے کم صحت مند ۔بھیڑیے کی آبادی کو اُن کی اصل سطح پر چھوڑ کر ہرنوں کا ریوڑ زیادہ صحت مند ہوتا ہے، اور وہ شمالی موسم کی تبدیلی میں زندہ رہنے کو بہتر ثابت کرتا ہے ۔

(۴) خوراک مہیا کرنا

حیوانی دنیا میں، بقاء کسی حد تک افرادی قوت کی سطح پر انحصار کرتی ہے۔ گوشت خور جانور طاقت کی اعلیٰ سطحیں قائم کر سکتے ہیں، بہ نسبت سبزی خور جانوروں کے جو خوراک خراب کرنے میں بہت وقت لیتے ہیں۔

یہ ایک دستاویزی حقیقت ہے کہ اچھی حالت کا انسان گھوڑے کو بُری حالت میں لا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ گھوڑا انسان کی نسبت تیز دوڑ سکتا ہے اور سبزی خور ہونے کے ناطے زیادہ جلدی تھک جاتا ہے اور وہ چارے پر بھی رُکتا رہے گا۔ آدمی ہر وقت گھوڑے کو پکڑتا ہے اور اُسے دوبارہ دوڑنے پر مجبور کرتا ہے۔ آخر میں گھوڑے کی قوتیں ختم ہو جاتی ہیں اور وہ خود کو پکڑوا دیتا ہے۔ میدانی علاقوں میں انڈین گھوڑوں کو اسی طرح پکڑتے ہیں۔ اور اس طرح پکڑے ہوئے اگر آزاد بھی چھوڑ دیئے جائیں تو کم ہی بھاگتے ہیں۔

ایک آدمی کو کہا گیا کہ وہ رضا کارانہ طور پر دوڑ کر ملکہ ایلزبتھ کے لیے دوائی لینے جائے۔ اسے کوئی تیس چالیس میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اسی وقت ایک حادثہ ہوا اور ایک آدمی کو گھوڑے پر بھیجا گیا۔ گھوڑ سوار کی نسبت دوڑنے والے شخص نے ساٹھ میل سے زائد کا چکر کم وقت میں طے کیا، اور ملکہ نے خوش ہو کر اُسے انعام دیا۔ اُسے نئے کپڑے ملے کیونکہ اُس کے پرانے کپڑے سفر میں خراب ہو چکے تھے۔ یہ انعام ہر سال ملنے لگا۔ اور وعدہ کیا گیا کہ اس کی ہر نسل کے سربراہ کو یہ انعام دیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ جمہوریہ کروم ویل نے اس سلسلے کا اختتام کر دیا، یا شاید اُس کی نسل اب بھی وظیفہ لیتی ہو۔

یہ کہانی سچی ہو یا نہ ہو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ گوشت خوری سے طاقت تیزی سے بحال ہوتی ہے بہ نسبت سبزیوں کے۔ کیونکہ طاقت میں تبدیلی کا ایک مرحلہ پہلے ہی طے ہو جاتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق موت بذریعہ شکار، ارتقاء کا دورانیہ بڑھاتی ہے۔

حیوانی موت کا طریقہ کار

موت کے طریقہ کار کی وضاحت کے لیے ذرائع موجود ہیں۔ چند ایک کو قبولیت مل گئی ہے جبکہ چند ایک ابھی تک وقت کی آزمائش پہ کھڑے ہیں۔ ذیل میں کم و بیش چھ وضاحتیں ہیں کہ موت طبعی طور پر کیسے آتی ہے۔ یہ وجوہات شکار اور حادثے سے الگ ہیں۔

۱۔ جب جاندار بنجر ہو جاتا ہے تو ایک اندرونی نظام اُسے تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔

۲۔ سیل کی نشوونما اور ٹشوز کی مرمت کا بھی مشاہدہ کیا گیا ہے اس لیے یہ مانا جاتا ہے کہ کسی جاندار کا دورانِ حیات طے شدہ ہے۔

۳۔ تخریبی عوامل زندہ رہنے کی صلاحیت میں کمی لاتے ہیں اور جانور اس تناؤ تلے دب جاتے ہیں۔

۴۔ ڈی این اے کی نکالی غلطیاں بڑھ جاتی ہیں حتیٰ کہ ہلاکت آن پہنچتی ہے۔

۵۔ چونکہ نر لاکھوں سپرم خارج کرتا ہے اور صرف چند ایک ہی بیضوں سے ملاپ کے بعد بقاء جاری رکھتے ہیں۔ اُن لاکھوں کی منزل موت ہوتی ہے۔

۶۔ یک خلوی جاندار جو سادہ تقسیم سے بڑھتے ہیں اور طبعی موت سے محفوظ دکھائی دیتے ہیں۔ نتیجتاً پیدا کیے گئے

جاندار کسی سبب فانی ہوتے ہیں جو ان کے ساتھ ان کی پیدائش ہی سے مربوط ہوتا ہے۔

آیئے ان متبادلات کی مختصر وضاحت کرتے ہیں۔

خودبخود تباہی:

برینڈیز یونیورسٹی کے جیروم واڈن سکائی کے مطابق یہ خودبخود تباہی کا طریقہ بہت سے جانداروں میں پایا جاتا ہے جس کی ایک شاندار مثال آکٹوپس ہے۔ جب زرخیزی اختتام پر ہوتی ہے تو جاندار کچھ ہارمونک اثرات کی وجہ سے کھانا بند کر دیتا ہے اور وہ فاقے سے مر جاتا ہے۔ تجربے سے یہ بات پتا چلی کہ اس ہارمونک اثر کو دور کر کے جاندار بنجر ہونے کے باوجود کھانا جاری رکھتا ہے اور اس کی زندگی طویل ہو جاتی ہے۔

ارتقائی وضاحت یہ ہے کہ افراد کے برعکس جانداروں میں اگر زرخیزی باقی نہیں رہتی تو وہ اپنی نسل کو آگے نہیں بڑھا پاتے لیکن اپنی خوراک کے لیے مقابلہ جری رکھتے ہیں۔ خوراک کے اس ضیاع کو روکنے کے لیے فطرت نے جاندار کے اختتام کا طریقہ بنایا ہے۔ انسان ان چند مخلوقات میں سے ایک ہے جو بنجر ہو کر بھی نسبتاً دیر تک جیتا ہے۔

طے شدہ دورانِ حیات:

لیونارڈ ہیفلک نے سالوں کام کیا اور کچھ بہت ہی واضح تجرباتی طریقوں سے ثابت کر کے اگرچہ سب نہیں مگر بہت سے ماہرین حیاتیات کو مطمئن کیا کہ خلیات میں تقسیم ہونے اور بڑھنے کی صلاحیت محدود ہوتی ہے۔ اس طرح جاندار زخموں کو مندمل کرنے اور نشوونما کے تسلسل کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔

چونکہ نشوونما اور زندگی کا تسلسل تقریباً مترادف ہیں، ایک سیل جس میں صرف چند دفعہ ہی دو ہونے کی صلاحیت موجود ہے (ایک سیل کا دو ہونا، دو کا چار اور یہ عمل جاری رہنا) اسی لیے جاندار کو مخصوص دورانِ حیات کی اصطلاح دی گئی جس سے وہ بہت کم آگے بڑھتا ہے۔ مختلف اصناف میں سیل کی تقسیم یا ڈبل ہونے کی صلاحیت کی شرح مختلف ہوتی ہے۔

یہ دریافت نہ صرف جاندار کے دورانِ حیات کو محدود کرتی ہے بلکہ غالباً اسکی جسامت کو بھی۔ چونکہ کسی بھی جانور کے لیے بلحاظ جسامت حقیقی حدود ہیں، اس سے فطرت میں یقینی حکمت دکھائی دیتی ہے۔ کچھ سال پہلے جے بی ایس ہالڈین نے اس بارے میں ایک شاندار مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''صحیح جسامت کا ہونا'' صحت مند ہونے کی صلاحیت، جسے سیل کی نشوونما کی اعلیٰ سطح درکار ہے، اور جسامت میں نشوونما پر قابو پانے کے درمیان ایک بہترین توازن ہونا چاہیے۔ اس سے ایک جاندار کی زندگی کا دورانیہ موثر طور پر طے پاتا ہے۔

گھِس پٹ جانا:

عام طور پر لوگ گھس پٹ کر مرنے کو موت کا سبب سمجھتے ہیں اور یہ صحیح بھی لگتا ہے لیکن اس کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا جا سکتا کیونکہ

تجرباتی شواہد یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جسمانی یا نفسیاتی دباؤ کے تحت جانور زیادہ دیر تک زندہ رہتے ہیں بہ نسبت ان جانوروں کے جن پر ایسے دباؤ نہیں ہوتے۔ پروفیسر ریمنڈ پرل کے اعداد و شمار کے مطابق سخت کام کرنے والے جانور جیسے کہ ہاتھی اور گھوڑے خلافِ توقع قید میں ان جانوروں پر غالب آجاتے ہیں جو اپنے وحشی پن میں آزاد ہوں۔

تغیرات:

تغیرات یا ڈی این اے کی نقل سے ہونیوالی غلطیاں حیوانی خلیات میں مختلف اسباب سے منتقل ہو رہی ہیں جنہیں ابھی تک پوری طرح سمجھا نہیں گیا۔ اگر ان غلطیوں کی تعداد کسی سیل میں کافی ہو جائے تو وہ کام کرنا بند کر دے گا۔ کسی مخصوص عضو میں ایسے نہ کام کرنے والے خلیات کی تعداد اگر کافی ہو جائے تو عضو کے طور پر یہ ناکام ہو جائے گا۔ ایک مقام پر یہ غلطیاں جانور کو مکمل طور پر گھیر لیتی ہیں۔ جسے سالک انسٹیٹیوٹ کے ڈاکٹر ہنزلے اور گل نے ایک مناسب اصطلاح دی یعنی ''غلطیوں کی آفت''۔ یہ آفت جاندار کی مکمل ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔ موجودہ دور میں کسی جانور کی موت کے طریقہ کار کے طور پر زیادہ تر اسی بات کو مانا جاتا ہے۔

موت کی منزل:

سائینا یونیورسٹی کے پروفیسر بی باسیٹی کے مطابق ایک ہی نسل سے بڑھنے والے بہت سے جانداروں میں سپرمز کا بہت سا حصہ بیضے کے تولید میں حصہ لیے بغیر مر جاتا ہے اور اپنی تباہی سے آئندہ آنے والوں کے لیے پروٹین سے بھرپور ماحول پیش کرتا ہے۔ یہ بات گیسٹروپوڈ کی کچھ اصناف کے لیے صحیح ہے۔

کچھ ایسی ہی صورتحال ''کوڈفش'' میں بھی پائی جاتی ہے۔ مادہ تقریباً چھ ملین انڈے دیتی ہے جس میں سے چار یا پانچ ہی زندہ بچتے ہیں۔ یہ مانا جاتا ہے کہ یہ مردہ انڈے ان انڈوں کے لیے جنہیں تیزی سے نشوونما پانی ہوتی ہے انھیں پروٹین سے بھرپور ماحول مہیا کرتی ہیں۔

پیدا ہونا:

انیسویں صدی کے آخر میں اگسٹ ویزمین وہ پہلا شخص تھا جس نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ غیر جنسی تولید سے لافانی جانور پیدا ہوتے ہیں جبکہ جنسی طور پر پیدا ہونے والے کا جانور فانی ہوتے ہیں۔ یہ بات واضح نہیں کرتی کہ فطرت میں ایسا کیوں ہے لیکن یہ تجویز دی جاتی ہے کہ اگر کسی جانور کو ہمیشہ کے لیے زندہ رہنا ہے تو اسے پیدا ہونے سے گریز کرنا چاہیے۔

موت کی دو اقسام: جانوروں کے لیے طبعی اور انسان کے لیے غیر طبعی

بہت سے لوگ محسوس کرتے ہیں کہ جانوروں کی موت بھی انسان کے گرائے جانے (گناہ) کے سبب ہے۔ اس کے لیے وہ رومیوں 8:22 حوالہ دیتے ہیں۔ یہاں ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ تمام خلقت کراہتی ہے اور انسان نجات کا منتظر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''ساری خلقت'' کا محاورہ نئے عہدنامے میں واضح طور پر صرف انسانوں پر لاگو ہوتا ہے جانوروں پر نہیں۔

مرقس 16:15 میں یہی فقرہ اصل یونانی میں یقیناً یہ معانی نہیں دیتا کہ انجیل کی منادی جانوروں کو کرو، جیسے کہ اسیسی کے فرانس

نے پرندوں کو منادی کی۔ کلسیوں 1:15 میں دوبارہ یہی فقرہ یونانی میں ہے جس کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ خداوند یسوع مسیح کو سب جانوروں سے پہلے پیدا کیا گیا۔ کلسیوں 1:23 میں ایک بار پھر یہی فقرہ ہے کہ پولوس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انجیل کی منادی ہر جگہ جانوروں میں کی گئی ہے۔

اور آخر میں رومیوں 5:22 ہمیں موت کے داخلے کے بارے میں بتاتا ہے اور جیسے مارٹن لائل جانز حقیقتاً موت کے حملے کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کو جانوروں تک نہیں پھیلایا جا سکتا جیسا کہ کچھ لوگ کرتے ہیں، کیونکہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آیت کے مطابق موت سب گنہگاروں کے لیے ہے۔ موت کی آفاقیت اور انسان کے گناہ کی آفاقیت، انسان کے گناہ سے ثابت ہوتی ہے۔

اس تمام پیرے کے خلاصہ یہ ہے کہ سب انسان مریں گے کیونکہ سب گنہگار ہیں، حیوانی اور نباتاتی اس منظر میں نہیں ہیں۔ اگرچہ ایبا اور پیرامیشیا بھی جانور ہیں لیکن سوائے حادثے کے ان کو کوئی موت نہیں آتی۔ ایسی ننھی مخلوقات کا کوئی رُخ نہیں ہے: وہ زندہ ہیں۔ لہٰذا موت کا تصور آفاقی ہے اور انسان کے گناہ کی وجہ سے ہے مگر اس کو حقائق کی حمایت حاصل ہے اور نہ کلامِ خدا کی۔

یہ بات واضح ہے کہ فطرت میں موت سزا کے لیے نہیں بلکہ حتمی طور پر بقاء اور بہبود کے لیے ہے۔ اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ حیوانی اور نباتاتی موت انسان پر لاگو نہیں ہوتی اس پر شدت سے زور نہیں دیا جا سکتا، ان کے لیے موت طبعی ہے مگر انسان کے لیے نہیں۔

لیکن ہم ایبا اور پیرامیشیا (اور بدقسمتی سے کینسر سیلز) کے علم سے جانتے ہیں کہ موت خلیاتی زندگی کا موضوع نہیں ہے۔ ایک بار جب خلیات پیدا ہو جاتے ہیں تو بجز حادثوں کے ان میں غیر اختتام پذیر بقاء کی صلاحیت ہوتی ہے۔ زندگی کا طریقہ کار خود اگسشن کے تصورِ ابدیت کی وضاحت کرتا ہے، یعنی ایک ایسی چیز جسے مارنا ناممکن نہیں مگر اُسے مرنے کی ضرورت نہیں۔

انسانی موت اور حیوانی موت، موت کی دو انتہائی مختلف اقسام ہیں، جانوروں میں موت ضروری ہے اور نظامِ فطرت کے مفاد کے لیے طے شدہ ہے۔ کسی واحد صنف کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ بڑھتی رہے اور زمین کو بھر دے اگرچہ سب اصناف نے مجموعی طور پر اس حکم کی تعمیل کی ہے اور اِسے کامیابی سے بھر دیا ہے۔ انسان کے ساتھ یہ معاملہ مختلف ہے کیونکہ اگرچہ وہ ایک صنفِ واحد ہے۔ یہ ارادہ تھا کہ وہ زمین کو معمور کرے اور اس پر حکمرانی کرے لیکن اس کی ایک بہتر وجہ یہ بھی ہے کہ ہر فرد مرد یا عورت جب بالغ ہو جائے زمین سے ہٹایا جائے اور موت کو چکھے۔ تاکہ اضافہِ آبادی کو روکا جا سکے۔ بلحاظ ترجمہ اس طرح کا ہٹاؤ کسی دوسری صنف کے لیے طے نہیں ہوا۔ صرف انسان ہی اس خوشگوار منظر کے لیے بنایا گیا۔

اس طرح حیوانی موت انسانی موت کی طرح نہیں ہے اگرچہ دونوں میں یہ طریقہ کار بالکل مختلف ہے اور پھر بھی دونوں ایک ہی طرح کے قدرتی عمل میں زندہ رہتے ہیں۔ لیکن جانوروں کے لیے موت مقرر ہے جیسے کہ فطرت میں باقی سب کے لیے۔ لہٰذا ان کی موت طبعی ہے جبکہ انسان میں اگر لیے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آدم کی غیر طبعی موت جانوروں کے آباء کی جوابدہ نہیں ہے، اور نہ ہی ان کی موت آدم کے گرائے جانے کے باعث ہے۔

☆☆☆

دوسرا حصہ

انسانی روح: ایک منفرد تخلیق

ابدیت کے دوران ابدیت کو سمجھنے کے لیے عارضی نظام بنایا گیا کیا انسان عارضیت کی صحیح طور سے وضاحت کر سکتا ہے

انسانی روح+انسانی جسم=انسان

یعنی ایک+ایک=ایک

انسان کو جانوروں سے مختلف جسم کے ساتھ تخلیق کیا گیا، بھلے ہی ہم ایک جیسے ماحول میں رہتے ہیں لیکن انسان جانور سے بڑھ کر ہے۔اس کے پاس ایک مجسوم روح ہی نہیں، بلکہ یہ روح اور جسم کی منفرد تخلیق ہے۔

نتیجتاً جب ہم بائبل کی رو سے انسانی سیرت کا کوئی نظریہ تعمیر کرتے ہیں تو ہمیں اس کا تھوڑا سا ذکر پرانے عہدنامے میں ملتا ہے اور پھر پولوس یا اناجیلی تواریخ میں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہودی لوگ شدید مذہبی رجحان رکھتے ہیں، وہ کبھی ضروری نہیں سمجھتے کہ اپنے عقیدے کو نظریے میں ڈھالیں، انھوں نے تبصروں میں بہت کچھ لکھا اور ''تالموڈ'' نے تو سال ہا سال جگہ بنائی۔روائتی شرح پر اس کی بڑی کتاب کے باوجود اس میں بہت تھوڑا لکھا ہے جو پیدائش کی کتاب کے لحاظ سے علم الٰہی کا اہل ہو سکے۔ان کے مذہبی عقائد کی منتقلی کے سخت منطقی نظام کے باوجود لگتا ہے کہ انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔اگرچہ وہ اپنے اعمال ہی کو نظام میں ڈھالتے ہیں۔

اگرچہ زمانۂ کفر میں مسیحیت کے ابتدائی دنوں ہی سے لگاتار خالص ادیان بنتے رہے اور ایمان پر بیانات اور تعریفات ہوتی رہیں پھر بھی ہمیں ان تراکیب کا مواد پُرانے عہدنامے میں نہیں ملتا، البتہ نئے عہدنامے خصوصاً پولوس کے خطوط میں ملتا ہے۔درحقیقت الٰہی تراکیب میں عبرانیوں کی عدم دلچسپی اُن کے نوشتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ پرانے عہدنامے کے یہ نوشتے نئے عہدنامے میں اناجیل کے نام سے شامل ہوئے ہیں، کیونکہ کلوری تک قواعد وضوابط، رسومات اور اسرائیل سے لیے گئے ابرہام کے وعدے جن کا تعلق زمینی معاملات سے تھا سب ابھی تک قائم تھے۔کوئی یہ بھی دعویٰ کر سکتا کہ پرانا عہدنامہ اکثر نئے عہدنامے کی مضبوط حمایت کرتا ہے، لیکن کبھی کبھار پرانے عہدنامے کے واقعات ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں اور اس طرح اُن کی اثباتی حالت اتنی اچھی نہیں۔

یہ مختصر باب نئے عہدنامے کی تعمیر ہے، یہ تعمیر تسلی بخش بھی ہے اور انکشاف آمیز بھی۔بعد میں اس کو بارٹن پائن کی تحریروں کے حوالوں سے دیکھا جائے گا، جہاں پرانے اور نئے عہدنامے کے درمیان بشریات کے حوالے سے پرامن معاہدہ ہے، اور اسے صرف پرانے عہدنامے کی بنیاد پر ہی تعمیر نہیں کیا گیا۔

سیرتِ انسان کے اجزاء

ایک بحث ہمیشہ سے ہوتی آرہی ہے کہ انسان دو الگ الگ اجزاء سے یعنی جسم اور روح سے، یا تین اجزاء سے مرکب ہے جو واضح طور پر الگ بھی ہوتے ہیں۔پہلی ترکیب ثانوی تقسیم کی طرف اور دوسری ثلاثی تقسیم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

کبھی کبھار تین اجزاء ثلاثی تقسیم کی حمایت کرتے ہیں اور یہ حمایت انھیں عبرانیوں 4:12 سے بھی حاصل ہے۔تاہم اگر

کوئی اس پیرے میں انتہائی پرعلم اصرار کرتا ہے تو وہ چار اجزاء کی دلیل دیتا ہے یعنی روح، جان، جوڑ اور گودا: جو میرے خیال میں چار تقسیمی ہوگی۔ کچھ تراجم اس چار تقسیمی سے جوڑ اور گودے کو ایک جُز گن کے نہ صرف ثلاثی تقسیم بنا دیتے ہیں، بلکہ ثانوی بھی۔
جان یا روح غیر جسمانی ہیں اور جوڑ یا گودا جسمانی۔ اس لیے وہ دلیل دیتے ہیں کہ مصنف کہہ رہا ہے کہ پاک روح جسم اور روح کو قائم کرتا ہے۔

صورتحال اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے جب خدا یہودیوں سے خطاب کرتے ہوئے (عبرانیوں کے خط کے مطابق) کئی اصطلاحات استعمال کرتا ہے، جس میں سے ہر ایک انسانی سیرت کا ایک جُزو ہے۔ یعنی طاقت روح، جان، دل اور دماغ، میرے خیال میں یہ تقسیم خمسہ کہلا سکتی ہے۔

حقیقتاً ہمارے پاس ایک ہی پیرا بچتا ہے جو صریحاً ثلاثی تقسیم کے لیے لگتا ہے۔ (تھلسلکینیوں 5-1:2) بذریعہ نیا عہدنامہ تجویز کرتا ہے کہ انسان سادہ طور سے روح اور جسم سے مرکب ہے۔ اور عام بحث کے مقاصد سے کچھ لوگ یہی کہیں گے کہ انسان ایک مجسوم روح ہے یعنی تخلیق کردہ روح تولید کردہ جسم میں ہے۔ جب خدا کی دی ہوئی روح جسم میں داخل کی جاتی ہے تو زندگی ظاہر ہوتی ہے۔ تمام مساواتوں میں سے سادہ ترین مساوات یہ ہوگی روح + جسم = زندگی۔ اس طرح زندگی ایک نفس ہے اور خود میں ایک کامل انسان ہے۔ جسم اور روح آپ کے لیے ''آپ خود'' ہیں اور میرے لیے ''میں خود''۔

انسانی روح: تعریف بلحاظ بائبل

آیئے نئے عہدنامے میں خصوصاً پولوس کے خطوط میں کچھ شہادتیں دیکھتے ہیں جہاں عام رائے کے باوجود ہمیشہ انسان کے غیر جسمانی جُزو ''روح'' کی بات ہوتی ہے نہ کہ ''جان'' کی۔ جہاں کہیں ہم انسان کی دو اجزاء سے ترکیب کا حوالہ دیکھتے ہیں، یہ ہمیشہ جسم اور روح ہوتے ہیں جسم اور جان نہیں۔

یعقوب 2:26 بتاتا ہے کہ جسم بغیر روح کے مردہ ہے۔ اس مشاہدے میں جان کی روانگی کا کوئی اشارہ نہیں۔ یسوع نے اپنی روانگی میں اپنی جان نہیں اپنی روح باپ کے سپرد کی اور ایسا ہی استفنس نے بھی کیا (اعمال 7:59)

اسی طرح جب خداوند یسوع مسیح جی اٹھتے ہیں تو یہ جان نہیں بلکہ روح ہوتی ہے جو جسم میں آجاتی ہے۔ جیسے اس چھوٹی بچی کا معاملہ جسے خداوند یسوع مسیح نے زندہ کیا اور دو گواہان کا بھی۔ یہ بات حزقی ایل 37:5 اور 8:10 سے بھی ثابت ہوتی ہے جہاں روح کے لیے عبرانی لفظ کا ترجمہ کنگ جیمز ورژن نے ''سانس'' سے کیا، اگرچہ وہاں ایک زیادہ بہتر عبرانی لفظ موجود تھا جو سانس کے لیے استعمال ہوسکتا تھا یعنی نیشامہ (neshamah) یہ ایک ایسا لفظ ہے جو اصل متن میں بھی استعمال نہیں ہوا۔ حالانکہ اگر مصنف کا ارادہ ہوتا تو وہ استعمال کر سکتا تھا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ یوحنا روح کی نئی پیدائش کی بات کرتا ہے جان کی نہیں اور پولوس روح کو بچانے کی بات کرتا ہے جان کی نہیں۔ یہ روح ہوتی ہے نہ کہ جان جو کہ نوزائیدہ بچے کو خدا کی طرف سے عنایت ہوتی ہے۔ یہ روح تھی جان نہیں، جس نے عنیاہ اور سفیرا کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ روح ہے جان نہیں جو خواہش کرتی ہے اگرچہ جسم کمزور ہو، یہ روح ہے جسے حتمی طور پر کامل بنایا گیا ہے: اور

جب خدا کے پاس واپس لوٹنے کا قت آتا ہے تو انسان اسے بحال نہیں کرسکتا ہے۔

ان تمام پیروں میں اس کے برعکس کہ انھیں کیسے لکھا گیا ہے، یہ روح ہے جس کی بات ہوتی ہے نہ کہ جان کی۔ ہم آسانی سے جان کو بچانے کی بات کرتے ہے۔ جہاں جان کو کامل طور پر منصفانہ کہا جاتا ہے وہاں یہ بلحاظ بائبل بالکل نہیں ہے، جسے بعد میں دیکھا جائے گا۔ اگر کلام کے الفاظ پر غور کیا جائے تو وہ پیرے جہاں جان کی بجائے روح کا لفظ استعمال ہوا ہے، کافی تعداد میں نکل آتے ہیں۔ لہٰذا جسم اور روح دونوں کو صفائی کی ضرورت ہے۔ عارفانہ طور پر چرچ ایک جسم اور روح ہے، اور ہم خدا کے جلال کے لیے ایک جسم اور ایک روح میں پکارے جاتے ہیں۔

انسانی جان: تعریف بلحاظ الٰہیات

پھر جان کیا ہے؟ یہ تصویر میں کہاں سے داخل ہوتی ہے؟ یقیناً زندگی جسم اور روح کی ترکیب کا اختتام ہے۔ یہ ایک ہستی ہے، ایک حقیقت ہے جو دو اجزا کی ترکیب سے بنائی گئی، جیسے کہ سوڈیم اور کلورین گیس مل کر نمک بناتے ہیں یا جیسے نیلے اور زرد رنگ کو ملا کر سبز رنگ بنایا جاتا ہے۔ جب زندگی کے ان دو اجزا کو موت کے ذریعے علیحدہ کیا جاتا ہے، تو ایک جز و زمین کی طرف پلٹ جاتا ہے اور دوسرا آسمان کی طرف خدا کے پاس پھر سے اکٹھا ہونے کے لیے جب انسان کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ زندگی اتفاق کا نتیجہ ہے یہ ایک ہستی ہے جو کامل انسان کو سمجھتی ہے۔

اس نظریے کی حمایت پرانا عہد نامہ بھی کرتا ہے اور نیا بھی۔ جے مارٹن پائن نے ایک بہت ہی مفید کتاب لکھی جس کا موضوع تھا ''عہد نامہ قدیم کا علم الٰہیات''۔ ''انسانی فطرت'' نامی ایک باب میں وہ پرانے عہد نامے میں درج ذیل ترقی پذیر مساوات تجویز کرتا ہے۔

خاک + سانس = گوشت (ایک زندہ جاندار)

اور پھر... گوشت + روح = زندگی (ایک نفس)

اس تنظیم کی سادگی اونچے پیمانے پر اپنے آپ کو سفارش کرتی ہے کیونکہ یہ پرانے عہد نامے کے بظاہر متضاد پیروں اور مجازی طور پر نئے پیروں سے ملتی دکھائی دیتی ہے۔ عام طور سے شاعری اور محاورات پر مبنی پیرے تسلی بخش نہیں ہیں۔ بنیادی طور پر یہ ہمیں ایک جسم اور غیر جسمانی روح پیش کرتی ہے جو ملکر ایک شخص اور اس کی زندگی کو بناتے ہیں۔

ہم اس کا موازنہ روبرٹ ایچ گنڈری سے کر سکتے ہیں جس نے انسانی سیرت بلحاظ بائبل کا مطالعہ سوما بائبل کی الٰہیات کے مطابق کیا۔ بارٹن پائن کی پرانے عہد نامے پر لکھی گئی کتاب اس نئے عہد نامے کی کتاب کی شاندار ساتھی ہے۔ گنڈری نے نئے عہد نامے کی بنیاد پر نتیجہ اخذ کیا، ''انسان جسم اور روح سے مرکب ہستی ہے''۔ اور جب یہ دونوں ملتے ہیں تو ایک زندگی بن جاتی ہے۔ یاد رہے کہ ہم ترکیب کی بات کر رہے ہیں محض اضافے کی نہیں۔ جان ایک ایسی چیز ہے جو بنا روح اور بنا جسم کے کچھ بھی نہیں۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان جسم بھی رکھتا ہے اور روح بھی مگر جان نہیں۔ انسان ایک زندگی ہے۔

روح کے بغیر جسم بنا ڈرائیور کار کی طرح ہے اور جسم بنا روح.... گنڈری کی ایک مختصر بات عمدگی سے اس صورتحال کی طرف اشارہ کرتی ہے:

> حقیقی انسانی زندگی کے لیے بائبل کی کسوٹی روح کی آگاہی نہیں ہے، نہ ہی مادی چیز جیسے کہ جسم۔ خواہ انسان روح اور جسم کا اتحاد ہے پھر بھی جسم کو حرکت میں لایا جاتا ہے اور روح صرف خدا کی تابع فرمانی کا اظہار کرتی ہے۔ انسانی سیرت کے دونوں حصے مقدس شیبہہ کی شان وشوکت میں شامل ہیں۔ وہ شان انسان کی اُس خدمت میں مضمر ہے، جو وہ مادی تخلیقات کا محافظ ہونے کے ناطے کرتا ہے۔ اس کام کے لیے انسان کو جسمانی ذریعے کی ضرورت ہے نہ کہ غیر مادی شعوری ذریعے کی۔ نہ روح کو جسم پر کوئی سبقت حاصل ہے اور نہ جسم کو روح پر۔ ہر ایک دوسرے کو اتحاد سے حاصل کرتا ہے اور علیحدگی میں ایک دوسرے کو کھو دیتا ہے۔

ہم سچ کے قریب تر دکھائی دیتے ہیں جب ہم ممکنہ سادہ ترین مساوات بناتے ہیں یعنی:

جسم + روح = زندگی

یہ انسان کو دو ہرا ہرگز نہیں بناتی ماسوائے بحث اور جائزے کے مقاصد کے۔ انسان ایک شخص کے طور پر باقی رہتا ہے جب جسم اور روح الگ الگ ہوتے ہیں۔ اس لیے جب ہم یہ بات کرتے ہیں تو جسم انسانی زندگی کا نصف حصہ ہے اور روح دوسرا نصف۔ چونکہ نصف انسان کوئی چیز نہیں ہے لہٰذا الگ ہو کر جسم فوراً رک جاتا ہے اور محض کیمیکلز کا بے مقصد ڈھیر بن جاتا ہے اور روح تمام جسمانی روابط اور ذرائع اظہار کھو دیتی ہے۔ اسی طرح یقیناً شعور بھی کھو جاتا ہے۔

صرف جسم کے زندہ ہونے پر ہی اور اس میں روح کے شامل ہونے سے ہی انسان پھر سے ایک شخص اور زندگی کے طور پر ترکیب پاتا ہے۔ زندگی ایک وحدت ہے جو ایک حقیقت ہے اور فطرتاً ناقابل تقسیم ہے۔ دو اجزاء کے ملاپ سے یہ نتیجتاً ایک نئی چیز بن کر سامنے آتی ہے۔ اب ہم اوپر دی گئی مساوات کو نئی شکل میں اس طرح بیان کر سکتے ہیں۔

ایک + ایک = ایک

ایسی مساوات کا مطلب ہے کہ ایک اور ایک **ملکر** ایک ہی بنتے ہیں دو نہیں: اور اس منفرد مساوات کا راز ایک چھوٹے لفظ ''اور'' میں پوشیدہ ہے۔ ''اور'' سے ہمارا مطلب کیا ہے؟ یہ محض جمع کا نشان نہیں بلکہ علمی رو سے ملاپ ہے۔

یہ مساوات اگر کلام کے مطابق نہیں تو ہمارے لیے کچھ نہیں ہے۔ زیادہ واضح ذکر پیدائش 2:24 میں ملتا ہے جب خدا حوا کو آدم کے پاس لایا (باپ دلہن کو دلہے کے پاس لایا) اس نے کہا ''وہ ایک جان ہوں گے'' یعنی ایک جمع ایک برابر ایک۔

جسم کے ایک ہو جانے کی مطابقت ہمیں چرچ میں بھی ملتی ہے جب اس کے اراکین اور سربراہ (یعنی یسوع) ایک واحد فعال اتحاد بن جاتے ہیں۔ ''کیونکہ جسم ایک ہے اور اراکین بہت سے اور تمام اراکین بہت ہونے کے باوجود ایک جسم ہیں۔ اس لیے مسیح بھی ایک ہے اور تم مسیح کا بدن ہو'' 1 کرنتھیوں (12:12,27)۔ اور ''وہ کلیسیا کا سردار ہے'' (کلسیوں 1:18)۔ اسی طرح یہودی اور مشرکین

ملکر ایک ہو جاتے ہیں (افسیوں 2:15) اگر چہ شادی کرنے کے لیے دو ساتھی چاہییں لیکن وہ شادی کے شرکا نہیں، اس طرح سے ہوئی شادی خود میں ایک حقیقت بن جاتی ہے جیسے زرد اور نیلا ملکر سبز رنگ بناتے ہیں، مگر نہ تو زرد اور نہ ہی نیلا خود میں سبز ہیں۔ پہلو بہ پہلو وہ زرد اور نیلا ہوتے ہیں مگر ملکر سبز بن جاتے ہیں۔

مطابقت کے لحاظ سے بلاشبہ جسم اور روح ملکر زندگی بناتے ہیں، لیکن بننے والی چیز ''زندگی'' اس مطابقت میں شادی ہے نہ کہ شرکاء میں سے ایک۔ شادی اپنے آپ میں ایک ہستی ہے جیسے کہ زندگی۔

ایک بدروح ایک انسانی جسم پر حتیٰ کہ کسی مردے پر بھی غالب آسکتی ہے جیسے کہ شیطان نے موسیٰ کے جسم کے ساتھ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ ایک اور انسانی جان کی پیدائش نہیں ہے، بھلے ہی شیطان ایسا کرنے میں کامیاب بھی ہوا ہوتا۔ دوسرے واقعہ میں اسے کوئی بدروح ہی پیدا کرے گی یہ ایک انسانی جسم اور روح کی مساوات ہے جس سے انسانی زندگی بنتی ہے۔

ایک زندہ جان: جسم اور روح کا ناقابل تقسیم ملاپ

ترکیب کے لحاظ سے انسان جسم اور روح ہے اور ماہرین علم الٰہی کے مطابق بلحاظ زندگی انسان سادہ اور ناقابل تقسیم ہے۔ انسانی جان کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس طرح زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ اگر دونوں اجزاء کو علیحدہ کر دیا جائے جو کہ واحد طریقہ تقسیم ہے تو زندگی باقی نہ رہے گی۔ خدا نے جو منصوبہ بنایا وہ انسان کے دو اجزاء نہیں تھے جو اس نے دو مراحل میں بنائے یعنی جسم اور روح۔ جب روح کو جسم میں داخل کیا گیا جو اسے قبول کرنے کو تیار تھا تو ''انسان جیتی جان ہوا''۔ (پیدائش ۲:۷) جیتی جان وہ ہے جسے خدا نے اپنی شبیہ پر تخلیق کیا۔

روح اور جسم کا ملاپ شادی کا تقرر ہے۔ چونکہ ہر ایک روح ایک جسم کے لیے خاص طور پر بنائی گئی اور خدا کا کبھی یہ ارادہ نہ تھا کہ یہ اتحاد موت کے ذریعے ختم ہو جائے، اگر چہ گناہ کے ذریعے یہ ختم ہو جائے گا۔ مگر یہ اتحاد پھر واقع ہوگا جب زندہ کیا ہوا جسم اپنی روح سے مل جائے گا۔ یہ صرف جلال کی امید نہیں ہے جس کے ذریعے روح نجات پائے گی بلکہ زندگی کی، یعنی جسم اور روح دونوں نجات پائیں گے۔

یہ بیان کافی نہیں ہے کیونکہ یہ ایک روح کو تجویز کرتا ہے جو شعوری طور پر جسم کی تلاش میں ہے۔ میرا ماننا ہے کہ شعوری روح بنا جسم کے کچھ نہیں ہے، اسے جسم کے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ وہ حقیقی دنیا کا اور خود اپنا شعور حاصل کر سکے۔ مزید برآں میں پُر اعتماد ہوں کہ ایک مسیحی کے لیے لاشعور میں جانا کوئی غلطی نہیں بلکہ ہم خدا کی موجودگی کا احساس کر سکتے ہیں کیونکہ ہماری روح ہمارے زندہ کیے جانے والے جسم کے ساتھ دوبارہ ملا دی جائے گی۔ مختصر بات یہ کہ، موت ہمارا پھر سے جی اٹھنا بنتی ہے۔ اس لیے زندگی انتہائی ناقابل تقسیم ہے، واحد تقسیم جو ممکن ہو سکتی ہے، زندگی کا خاتمہ ہے۔

اسی اثناء میں روح جب جسم سے نکلتی ہے تو براہ راست خدا کی حفاظت میں چلی جاتی ہے جب تک کہ جسم کو اس کے مناسب گھر کے لیے دوبارہ زندہ نہ کیا جائے۔ روح کی روانگی اور جسم کے جی اٹھنے کے درمیان تاہم وقت کی غلطی کا کوئی تجربہ نہیں کیونکہ ایسی غلطی کا امکان ہی نہیں۔ اس طرح ہم کبھی بھی اپنی دنیاوی زندگی کے کسی بھی مرحلے میں محض ایک روح کا درجہ نہیں رکھتے۔ ہم خدا کے حضور ننگے نہیں بلکہ

کپڑوں میں جاتے ہیں، اور جسم سے نجات پانا ایک نئے جسم کے کپڑوں میں جانا ہے جو کہ شاہی استقبال کے لیے مناسب ہو۔

میں نے اپنی کتاب ''وقت سے باہر سفر'' میں اس بات کو انتہائی احتیاط سے مکمل کیا ہے۔ یہ کتاب کلام خدا کے ان بہت سے پیروں پر روشنی ڈالتی ہے جو براہ راست ان حالات کو بیان کرتے ہیں جن کے تحت یہ ابدی سفر ممکن ہوتا ہے۔ خدا کے وعدے، کہ ایمان دار موت نہیں چکھیں گے، حیران کُن طور پر علمی لحاظ سے پورا کیا گیا ہے۔ اس سفر کے دوران کوئی شعوری نقصان نہیں ہوگا۔

مسیحی عقائد اور ارتقاء کا تضاد

حقیقتاً جو ہمارے پاس ہے وہ یہ ہے کہ، انسان کی تعریف ایک انسانی روح اور جسم کا ملاپ ہے، یہ جسم اور روح کا اجتماع نہیں بلکہ قابل فہم سے ایک ملاپ ہے۔

اس مساوات کو دیکھتے ہوئے یہ بات انتہائی موزوں ہے کہ زندگی کا بچانا مکمل انسان کا بچانا ہے کیونکہ روح کی نئی پیدائش کی ہر یقین دہانی اور جسم کی نجات کی یقین دہانی ہمیں شک سے بالاتر کر کے زندگی کے بچاؤ کی یقین دہانی کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ نصف انسان کا بچاؤ نہیں بلکہ پورے کا ہے۔

زندگی کی بنیاد کے لیے ارتقائی نظریے کا جائزہ کچھ یوں ہے یہ ایک ثانوی تغیر ہے جو براہ راست جسم سے ابھرتا ہے اور اس وقت تک رہتا ہے جب تک جسم باقی رہے۔ اس فلسفے میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ انسانی روح عقل سے پرے ہے کیونکہ اُن کی وضاحتیں صرف اس واقع پر لاگو ہوتی ہیں جسے وہ مانتے ہیں۔ کوئی مسیحی ماہر ارتقاء یا تو اپنے مسیحی علوم کے خلاف ہے یا پھر اپنے سائنسی فلسفے کے۔

☆☆☆

روح + جسم =ایک قابل شناخت شخص

یقیناً انسان جانوروں سے بہت مختلف ہے بلکہ ہم ایک دوسرے سے بھی مختلف ہیں۔ ہر انسان منفرد ہے جس کی کوئی نقل نہیں ہے۔

مَیں ''مَیں'' کیسے بنا؟

ہم جانتے ہیں کہ ہم اپنا جسم اپنے والدین سے عمل تولید سے حاصل کرتے ہیں: مگر روح کہاں سے آتی ہے؟ اس بارے میں صرف چار نظریات ہیں۔ ۱۔اوتار سے ۲۔براہ راست تخلیق سے ۳۔ہمارے والدین کے توارث سے، یعنی ہم اپنے جسم کے ساتھ ساتھ روح بھی تولید سے ہی حاصل کرتے ہیں ۴۔ارتقاء سے۔ اگر چہ ان سے کچھ مسائل پیدا ہوتے ہیں، اس بات کو الگ رکھتے ہوئے آیئے ان میں سے ہر ایک کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ اوتار:

کھل کر کہا جائے تو اوتار کا مطلب کسی روح کا اجسام کے سلسلے میں سے گزرنا ہے، جن میں سے ہر ایک اپنی حالت کے اظہار کا ذریعہ بن جاتا ہے، مگر کاملیت تجربے سے ہی حاصل کرتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے روح کائناتی شعور کے باندہ اجتماع میں سے گزرتی ہے اور آخر کار ذاتی شناخت کے بوجھ سے آزاد ہو جاتی ہے، یا خدا کے ہاں بنتی ہے شاید اُس ذاتی شناخت کو کھوئے بغیر ہی۔

اس بات کو بہت سے لوگ مانتے ہیں، بہت سے لوگ انفرادیت کی قیمت کو بہت زیادہ سمجھتے ہیں اور ہجوم میں کھو جانے پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے لوگ خود کی نسبت کسی زیادہ بڑی چیز میں کھو جانے کو خوشگوار حل سمجھتے ہیں۔ یہودی لوگوں نے نظریہ اوتار کو ایک قابل غور سوچ دی ہے اور اس بارے میں اپنے نظریات کو قبالہ کے حوالے سے کام کر کے قرون وسطیٰ کے دوران واضح کیا ہے۔ ان کی سوچ ناستک ازم سے کافی متاثر تھی، جس کے مطابق تجسیم، روح سے کم تر درجہ رکھتی ہے اور اوتارنا قابل خواہش ہے۔

اس نظریے میں تمام روحیں آغاز میں ہی بنائی گئیں اور وہ اجسام کے بغیر بھی مکمل تھیں۔ یہ روحیں فطرتاً (نر و مادہ) تھیں۔ بعد میں آنے والی سزا کے طور پر روحوں کی تجسیم ہوئی اور ہر ایک کو نر یا مادہ بنا دیا گیا تا کہ وہ پھر سے شادی کے ذریعے وحدت کی تلاش کریں۔ چونکہ تجسیم ایک سزا تھی اور تقویٰ کی طرف ایک مضبوط جھکاؤ تھا جہاں روح ترقی پاتی ہے اور جسم کا انکار کیا جاتا ہے پر فطرتاً وہ بھی ترقی پاتا ہے۔

غالباً نیکلدیمس کے ذہن میں اوتار جیسا ہی کوئی خیال ہو گا جب اس نے خداوند یسوع سے پوچھا کہ کیا کوئی آدمی اپنی ماں کے پیٹ میں پھر سے داخل ہو سکتا ہے اور پھر سے پیدا ہو سکتا ہے۔ کیا یسوع یوحنا بپتسمہ دینے والے کا اوتار تھا یا الیشبع کا یا یرمیاہ کا یا نبیوں میں سے کسی کا۔ اگر چہ منطقی طور پر نہیں مگر پھر بھی یہ بات واضح ثابت کرتی ہے کہ وہ اس نظریے سے آشنا تھے۔

بعد میں اوریجن (185-254 سن عیسوی) نے اس تصور کو اور آگے بڑھایا اور مغربی کلیسیا کی طرف سے پہنچے ہوئے [56] دکھ کو ایک بدعتی کے طور پر رد کر دیا۔ تاہم اس نے پہلا ماہر علم الٰہی اور انتہائی تخلیق کار بننے کی کوشش جاری رکھی۔ اُس کے کام نے اصل تصورات کو بالکل الگ کر دیا۔

یہ شہادت پہلے کی طرح آج بھی فطری روایت ہے۔ مثال کے طور پر آپ میں سے بہت سے لوگوں کو کئی بار یہ تجربہ ہوا ہوگا کہ وہ کسی ایسی جگہ جائیں یا کسی اجنبی سے ملیں تو یہ احساس ہو کہ وہ اس جگہ پہلے بھی جا چکے ہیں یا اُس سے پہلے بھی مل چکے ہیں۔ لوگوں کے کچھ معاملات ایسے بھی سامنے آئیں ہیں کہ انھوں نے ایک جگہ کی تفصیل سے وضاحت کی بالکل اُسی طرح جیسے وہ اس سے واقف ہوں لیکن حقیقت میں وہ وہاں کبھی نہیں گے ہوتے پھر بھی ان کی تفصیل انتہائی درست ثابت ہوتی۔

وہ یہودی مسیحی فلسفے کے مطابق انسانی روح کا محدود اوتار مانتے ہیں۔ اس روایت سے ہٹ کر دیگر مذہبی حلقے یہ بھی مانتے ہیں کہ انسان کا اگلا اوتار کسی جانور، کیڑے یا پودے کی شکل میں ہوگا۔ اور اس طرح کسی جانور کا اوتار کسی انسان کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔ اوریجن نے محسوس کیا کہ انسان کی گنہگار فطرت کا مسئلہ اس کی گزشتہ غیر کامل حالت سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اوتار کا تصور حقیقت میں جان اور روح کی بنیاد کا کوئی حل مہیا نہیں کرتا۔ یہ محض تاریخ بتاتا ہے کہ روح جب ایک بار تخلیق ہو جائے تو اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ ہمارا مسئلہ اب بھی یہی ہے کہ روح کہاں اور کس شکل میں بنائی گئی۔

کیا یہ پانی کے ذخیرے کی طرح ہیں جس کے قطرے موضوع اجسام میں ڈالے گئے؟ یا ابتدا ہی سے روحوں کا کوئی ذخیرہ ہے، اور جب وقت آتا ہے تو روح اس کے جسم میں ڈال دی جاتی ہے اور جب کہ دنیا کی آبادی بتدریج بڑھ رہی ہے اور بہت سے اجسام کو ارواح درکار ہیں، تو کیا بہت سی ارواح ابھی تک منتظر ہیں؟ یا کیا انہیں ضرورت کے تحت تخلیق کیا جاتا ہے؟

ہر موت کے ساتھ ایک روح کہیں اور خدمت کرنے کے لیے آزاد ہو جاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ پیدائش اموات سے زیادہ ہیں۔ اس لیے ہمیشہ پرانے اجسام جو خالی ہو جاتے ہیں کی نسبت نئے کرنے والے اجسام زیادہ ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ بائبل کے اعداد و شمار تصورِ اوتار کی بالکل حمایت نہیں کرتے، خاص طور سے نجات یافتہ لوگوں کے لیے موت کسی روح کو بے گھر نہیں چھوڑتی بلکہ اسے نئے سرے سے زندہ ہونے والے جسم سے ملاپ کے لیے فوراً آزاد کر دیتی ہے۔

۲۔ براہ راست تخلیق

اس کے برعکس براہ راست تخلیق کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر فرد روح خدا کا کام ہے جسے علم الٰہی میں تخلیق کہتے ہیں۔ کلام خدا کے بہت سے پیروں کو ایک اور انداز سے سمجھا جا سکتا ہے ان میں سے کچھ کا حوالہ ہم نے پہلے ہی ایک اور متن میں دیا ہے۔ اس نئے متن کے حوالے سے چند ایک کو یہاں دہرانا بے جا نہ ہوگا۔

روح انسان سے اخذ نہیں کی جاتی بلکہ خدا کی طرف سے دی جاتی ہے۔ واعظ 12:7

خدا انسان کے باطن میں اس کی روح پیدا کرتا ہے۔ زکریاہ 12:1

روح (زندگی) خدا نے بنائی۔ یسعیاہ 57:16

خدا تمام ارواح کا باپ ہے۔ عبرانیوں 12:9

اگر یہ خدا ہے جس نے ہماری روح کو ترتیب دیا اور تخلیق کیا تا کہ وہ ہمارے جسم کے مطابق ہو (خواہ نر ہو یا مادہ بیرونی احساسات سے موازنہ ہو یا مقابلہ، عملی ہو یا فلسفیانہ، فنی ہو یا غیر تصوراتی، تخلیقی ہو یا محض تصوراتی وغیرہ) یہ بات قدرتی ہے کہ یہ اسی جسم کی طرف لوٹے جسے چھوڑ کر آئی ہے۔ خدا کے ہاتھوں میں یہ اپنی شناخت کے ساتھ محفوظ رہتی ہے تا کہ نئے زندہ کیے جانے والے جسم میں ڈالی جا سکے و ہمیں تب ملتا ہے جب ہم اپنے پرانے جسم کو ترک کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک زندگی پھر سے مکمل طور پر بنتی ہے۔

روح بیچاری ذاتی شناخت کا نصف حصہ ہے اور چونکہ اس کی بنیاد الٰہی ہے، تو جسم کا خاتمہ جس میں یہ رہتی ہے کسی طور یہ اشارہ نہیں کرتا کہ روح کا وجود بھی ختم ہو گیا۔ روح کسی اندھے ارتقائی عمل کی حادثاتی یا عارضی ذیلی پیداوار نہیں بلکہ خدا کی تخلیق ہے تا کہ ہمیشہ تک باقی رہے۔ خدا اس قابل ہے کہ وہ زندہ کیے ہوئے جسم کو پھر سے اُسی روح اور اُسی جسم کی شکل میں بنا لے۔ انسان کی اسی منزل کا کسی ارتقائی فلسفے سے کوئی مقابلہ نہیں۔ منطقی طور پر ماہرین ارتقاء براہ راست تخلیق کے تصور کو رد کرتے ہیں۔ انسانی تنظیم میں روح جیسے ضروری جزو کو اہم نہیں مانتے اور خاص طور سے کوئی بھی تصور جسے لگاتار تخلیق درکار ہو کہ وہ اربوں مراحل پر بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

۳۔ روح کی منتقلی بذریعہ توالد و تناسل

ایک اور عقیدہ یہ بھی ہے کہ جسم کے ساتھ ساتھ روح بھی والدین ہی پیدا کرتے ہیں لفظ (Traducianism) کو لاطینی فعل (Traducere) سے اخذ کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے ''منتقل کرنا''۔ یہ اصطلاح آدم اور حوا کے تصور سے لی گئی ہے جہاں ایک روح براہ راست تخلیق کی گئی ہے تا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے لاتعداد زندگیوں کا ذریعہ بن سکے۔ مستقبل میں آنے والی تمام روحیں ان کی روحوں کو کم نہیں کرتیں جس طرح ایک شمع سے دوسری شمع جلائی جائے یا پھر سینکڑوں شمعیں مگر اعلیٰ ذریعہ کم نہیں ہوتا۔ تمام روحوں کا مواد آدم اور حوا میں تخلیق کے ذریعے سے لگایا گیا۔ ہماری روحیں اسی راس سے اخذ کی گئی ہیں۔

اس تصور کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے، کہ یہ عمدگی سے اس بات کا جوابدہ ہے کہ ہماری وراثت آدم اور حوا سے ہے جس کی فطرت گنہگار اور خطا کار تھی۔ لیکن یہ پرکشش نظریہ مسائل بھی کھڑے کرتا ہے

پہلی بات یہ ہے کہ انسانی زندگی یا روح کی ایسی بنیاد کے لیے بائبل کی کوئی واضح شہادت نہیں۔ صرف ایک ہی پیرا اہل دکھائی دیتا ہے یعنی یوحنا 3:6، ''جو جسم سے پیدا ہوا وہ جسم ہے اور روح سے پیدا ہوا وہ روح ہے''۔ یہاں ہمیں روح کی منتقلی بذریعہ توالد کی مضبوط بنیاد مل سکتی ہے۔ لیکن تحریر واضح طور پر اشارہ کرتی ہے کہ لفظ ''روح'' پاک روح کے لیے استعمال ہوا ہے اور پیدائش نئی پیدائش کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ''حیران نہ ہو کہ میں نے کہا کہ تم پھر سے پیدا کیے جاؤ گے۔'' یہ بات نئے تراجم سے پہچانی جا سکتی ہے جب کہ چند ایک میں روح کو چھوٹے حروف سے ہی لکھا گیا ہے۔

اکثریتی رائے ایسے معاملات کو تسلیم نہیں کرتی لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ آدم نے حوا کو پہلی بار دیکھا تو اس نے یہ نہیں کہا کہ ''یہ میری روح میں سے روح اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے'' مگر یہ کہا کہ ''اب یہ میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے۔'' (پیدائش 2:23) اس میں کوئی شک نہیں کہ حوا کی روح یا زندگی اور اس کا جسم بھی آدم ہی سے اخذ کیا گیا۔

خدا نے خود بولا ''ارواح کا باپ'' (عبرانیوں 12:9) آدم کو اس طرح سے کبھی بیان نہیں کیا گیا اس طرح یہ خطاب تبھی سچ ہوگا اگر اروح کا انتقال بذریعہ توالد کا نظریہ سچ ہے۔

ایک وجہ سے اس نظریے کو بھی رد کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ ابتدائی کلیسیا سے لیا گیا جو کہ ابتدائی یونانی فلسفیوں کے زیر اثر تھا، خاص طور سے ''زینو'' (450 قبل مسیح) اور کلینتھس (252-103) قبل مسیح دونوں ہی تقدیر کے مکتبہ فکر سے تھے۔ یہ دستاویزی ذریعہ خود کو کلام خدا کے طلباء کے سپرد نہیں کرے گا کیونکہ یونانی فلسفے کی بنیاد ہی بائبل کے الٰہی نظریات پر ہی ہے۔

تاہم ابتدائی کلیسیا کے فادران نے اس نظریے کو اختیار نہیں کیا کیونکہ یہ اس بات کی عمدہ وضاحت کرتا ہے کہ گناہ انسان کی فطرت میں ہے جو بڑھتے بڑھتے عالمگیر ہو گیا، ایسا پیلاجیس کی مثال کے تحت نہیں ہوا۔ طرطولین اس کا مضبوط حامی تھا اس کے الفاظ ہیں:

> ''ہمارے اولین والدین خود میں تمام انسانیت کے غیر ترقی یافتہ جراثیم رکھتے تھے، اور اس کی زندگی تمام زندگیوں کا سرچشمہ تھی۔ انسانوں کی مختلف ارواح اُسی ایک روحانی جوہر سے ہیں۔ اس لیے تمام انسانوں کی فطرت بدعنوان ہو جاتی ہے کیونکہ اس نسل کا حقیقی باپ گنہگار تھا اور اسی سے تمام ارواح پیدا ہوئیں۔''

یہ ایک دلکش متبادل ہے مگر بائبل کے مطابق نہیں...

تاہم اگر ارواح واقع ہی توالد کے ذریعے سے منتقل ہوتی ہیں اور ہم اپنی ارواح مشترکہ طور پر اپنے والدین کے ذریعے سے حاصل کرتے ہیں، تو خداوند یسوع مسیح کی روح تخلیق نہیں تھی بلکہ والدین ہی سے وصول ہوئی یہ والدین پاک روح اور مریم ہو سکتے ہیں۔ اس طرح خداوند یسوع کی روح کا نصف مریم سے آیا اور باقی کا نصب پاک روح سے اور مریم سے آیا ہوا نصف حصہ بدعنوان ہے۔ یہ نصف حصہ پوری روح کو خراب کر دے گا اور اس طرح خداوند یسوع کی کامل معصومیت پر سوال اٹھتا ہے۔ جب تک کہ ہم رومن کاتھولک کے بے عیب تصور کو قبول نہ کر لیں جو کہ اسی مسئلے سے نپٹنے کے لیے اٹھتا ہے۔ کہا جاتا ہے لوتھر نے ارواح کے انتقال کا توالدی نظریہ اختیار کیا اور رومن کاتھولک دستاویز سے ہٹ کر اپنا الگ مقام بنایا۔ لیکن واقعہ سے یوں پتہ چلتا ہے کہ اگسٹن کی طرح جو بڑی حد تک اپنی ہی سوچ سے متاثر تھا۔ لوتھر کبھی بھی مکمل طور پر اپنے دماغ میں یہ معاملہ قائم نہ کر پایا وہ توالدی اور تخلیقی نظریات میں بھٹکتا رہا۔ جن لوگوں نے اس کی پیروی کی وہ واضح طور پر توالدی نظریے کی طرف آ گئے لیکن لوتھر خود دونوں نظریات میں مساوی رہا۔

یہ قدرتی بات ہے کہ وہ مسیحی جو انسانی جسم کے ارتقاء کی حمایت کرتے ہیں وہ فطری عوامل میں کوئی عدم تسلسل نہیں دیکھتے اور ان کا رجحان توالدی نظریے کی طرف زیادہ ہے، چونکہ یہ نظریہ بھی اس بات کو نظر انداز کرتا ہے کہ روح براہ راست تخلیق سے متعارف ہوتی ہے۔

۴۔ارتقاء

بنیادوں کا کوئی ارتقائی نظریہ کسی ایسی چیز کو نہیں مان سکتا جو غیر مادی ہو۔اس طرح تخلیق کو بھی خارج کر دیا جاتا ہے کیونکہ یہ کوئی سائنسی تصور نہیں بلکہ غیر مادی ہے۔اسی وجہ سے تو الدی نظریہ بھی خارج کر دیا جاتا ہے۔اگر چہ یہ ارتقائی نمونے کو مانتے ہوئے متعارف ہوا۔تخلیق (اگر چہ کچھ نہیں) پھر بھی کسی عمل کو شروع کرنے کے لیے درکار ہے۔

روح کو خواہ ذہن کا نام دیا جائے یا ارادے کا یا شعور کا یہ کسی واقع کی مدد و معاون ہے ان چیزوں کا وجود اپنے حق کے لیے نہیں ہے بلکہ محض الیکٹرو کیمیکل عوامل سے الگ ہے۔کسی انتہائی سائنسی دماغ کے لیے صرف رویہ ہی نفسیات کی قابل قبول شکل ہے۔جے بی واٹسن مکتبہ رویہ کے بانی نے بہت عرصہ پہلے کہا کہ وقت آ گیا ہے کہ ہم شعور کی اصطلاح کو ماہر نفسیات کے ذخیرہ الفاظ سے مکمل طور پر خارج کر دیں۔موجودہ رجحان نے ردعملی شخص کو محض ردعملی چیز میں تبدیل کر دیا۔اور رویوں کو ریفلیکس کا نام دے دیا ہے۔انسان کے خواہشات اور مقاصد کو ختم کر دیا گیا ہے۔روح یا جان کی الگ سے کوئی حقیقت نہیں۔

برونو بیت الہیم نے اپنی کتاب ''فروڈ کی نفسیات'' تصور روح کے حوالے سے شائع کی۔وہ کہتا کہ فروڈ نے اپنے سارے کام میں روح کے لیے لفظ ''die sede'' استعمال کیا، اس کے امریکن مترجمین نے بھی لفظ روح (soul) کو وبا سمجھ کر نظر انداز کیا، اور پچیدگیوں کو ''نفسیاتی شخصیت'' کے طور پر استعمال کیا۔بیت الہیم اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ ماہرین نفسیات نے محسوس کیا کہ اگر فروڈ میں سے روح کو بالکل نکال دے تو سائنسی حلقے اسے فوری قبول کر لیں گے۔

ان کے نظریے کے مطابق ہم محض حیاتیاتی مشین کا ایک پرزہ ہیں۔اگر جسم کی مشینری کے ردعمال کو روح کہا جاسکتا ہے تو پھر روح ایک ثانوی اثر سے زیادہ کچھ نہیں۔یہ ایک ثانوی اثر ہے جس کا اپنے آپ میں کوئی وجود نہیں اور نہ ہی اس چیز پر اثر ڈالتا ہے جو اسے ابھارتی ہے۔یہ کسی چشمے کے پانی کی حرکات وسکنات کے سوا کچھ نہیں، اس مشین میں کوئی بدروح نہیں۔

انتہائی منطقی ماہر ارتقاء یا تو نظریہ مادیت (شعور مادے ہی کی خصوصیت ہے اور لاشعور جیسی کوئی چیز نہیں ہے) کو مانتا ہے شعور اچانک آسمان سے فطرت میں عدم تسلسل پیدا کر کے اترتا ہے اور وہ کوئی پہلے کی چیز نہیں ہے۔ان میں سے کوئی نظریہ بھی قابل مدافعت نہیں تھا اس لیے اس مصیبت کا صفایا کر دیا گیا اور اس پر اور کوئی بحث نہ ہوئی۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ تمام تر مادہ پہلے ہی سے حرکت میں تصور کیا جاتا ہے اس نظریے کی تصدیق ''زینو'' نے بھی کی، جس نے ''دیوتاؤں کی فطرت'' میں لکھا: "روح اور شعور کے بغیر کوئی چیز خود سے پیدا نہیں ہوسکتی ہر چیز کی ایک زندگی اور ایک شعور ہوتا ہے۔تاہم دنیا چیزوں کو روح اور شعور سے ہی پیدا کرتی ہے اس لیے دنیا خود بھی زندہ ہے اور دماغ بھی رکھتی ہے۔"

یہ بات قریباً 400 قبل مسیح میں لکھی گئی، تب سے اب تک انسانی شعور کا رویہ تھوڑا سا ہی تبدیل ہوا ہے۔سائنس ڈائجسٹ (1981) میں جولائی کے شمارے میں ایک مکالہ ہے " کیا کائنات زندہ ہے؟" دونوں ایک مسئلے سے متاثر ہیں، انسان کی روح کب آتی ہے؟ شعور کہاں سے آیا؟ ارتقاء کا نظریہ عدم تسلسل کے بغیر بتدریج چلتا ہے اور وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ شعور کل مادے کا اثاثہ ہے اور شروع ہی

سے اس کے ساتھ موجود ہے۔

لیکن یہ متبادل کے مادے نے شعور کو پیدا کیا ہے مسئلے کو بالکل حل نہیں کرتا یہ محض اس مسئلے کو ایک قدم پیچھے لے جاتا ہے۔ کیونکہ مادہ خود بھی تو اس کا جوابدہ ہے۔ اور مادے کی لافانیت نا قابل تصور ہے۔ اس کا آغاز کب اور کس مقام سے ہوا؟ ''کارل ون ویزکر'' نے یہ دلیل دیکر کہ مادہ اور روح اصل میں ایک ہی چیز ہیں اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کی وہ مسیحی جو یہ ایمان رکھتا ہے۔ مادہ اور روح دونوں خدا نے تخلیق کیے ہیں اور روح کو اس تصور کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں، کیونکہ مادہ صرف روح کا ثانوی اثر ہے پچھلا نہیں۔ جیسے کہ عبرانیوں 11:3 بیان کرتا ہے۔ "ایمان ہی سے ہم معلوم کرتے ہیں... کہ ایسا نہیں ہے جو کچھ نظر آتا ہے ظاہری چیزوں سے بنا ہو۔" کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ دیکھی جانے والی اور غائب سب چیزیں خدا ہی نے خلق کی ہیں اور وہ خود بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کلیسیوں (1:16)

مجوزہ حل کے مسائل:

ہر فرد میں روح کی بنیاد کے اس طرح سے ہمارے پاس چار متبادل نظریات ہیں، پہلا یہ کہ روح اوتار سے آتی ہے اور پہلے سے موجود ہوتی ہے اور روح زندگی بہ زندگی چلتی ہے اور ایک جسم سے دوسرے جسم میں جاتی ہے۔ تخلیص کے عمل سے گزرتے ہوئے کسی آخری حالت سکون میں جذب ہو جاتی ہے جو اسے مزید تجسیم کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ یہ صرف روح کی واضح تاریخ ہے روح کی بنیاد کا جواب نہیں۔ نظریہ اوتار روح کی بنیاد کے مسئلے کو حل نہیں کرتا بلکہ اس کی منزل تجویز کرتا ہے۔

دوسرا یہ ہر روح خدا کی ایک الگ تخلیق ہے اور کسی مناسب وقت پر مولد جسم میں ڈال دی جاتی ہے۔ نظریہ تخلیق اس شخص کے لیے مسائل پیدا کرتا ہے جو انسانوں کو نا ٹوٹنے والے سلسلے میں عدم تسلسل کے تصور کو قبول نہیں کر سکتا۔

تیسری بات یہ کہ روح کو والدین پیدا کرتے ہیں جیسے کہ جسم کو دونوں ملکر روح کا مواد بناتے ہیں۔ روح کا انتقال بذریعہ توالد روح کی بنیاد کے معاملے میں بلا جواب ہے۔

اور آخری بات کہ یہ ایک ساکن شور کی طرح ہے جو دماغ کی الیکٹرو کیمیکل سرگرمیوں سے جاری ہوتا ہے اور اس کا الگ سے کوئی وجود نہیں۔ ارتقاء کو اس حقیقت سے انکار کرنا پڑتا ہے کہ میرا خود کا کوئی وجود نہیں۔ میں بھی اس کا دوسروں کے لیے انکار کر سکتا ہوں کیونکہ دوروں کے لیے میرا غیر حقیقی طور پر ہونا ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ ''ڈیس کارٹس'' کا ثبوت کافی مجبور کرتا ہے، آزادانہ ترجمہ کرتے ہوئے اس نے یوں دلیل دی۔ "اگر میں شک کرتا ہوں تو اس شک کو محظوظ کرنے کے لیے میرا وجود ہے۔" اس لیے میری ذاتی بقاء پر کوئی سوال اٹھ نہیں سکتا۔

جولین ہگزلے نے جو کام سب سے اچھا کیا وہ تھا اس بات کو بلا تکلف تسلیم کرنا کہ ذہن کی بنیاد شاندار سوچ ہے جو بظاہر غلط لگے مگر صحیح ہو، اور اس کا انکار سختی سے کیا جا سکتا ہو۔ یہ صرف اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ ارتقائی عمل کتنا حیران کن ہے جو اس طرح کا ناقابل یقین کام کر سکتا ہے۔ اس طرح سے کوئی بھی عقلی طور پر اس پہ قابو نہیں پا سکتا۔ اگر دور اندیشی کو اجازت دی جائے کہ وہ سادہ چیزوں کو استعمال کرے تو اس معاملے میں وہ ہماری سوچ پر حکمران ہے۔ پھر شاید ہم اس بات کو تسلیم کر لیں گے کہ براہ راست تخلیق سادہ ترین

وضاحت ہے، کسی اور کی بجائے اس کا عظیم ترین حامی نیا عہد نامہ ہے۔ یہ خصوصی طور پر بنائی گئی روح ہے جسے خصوصی طور سے بنائے گئے جسم میں داخل کیا گیا۔ نتیجتاً ایک فرد بنا یعنی مَیں قابل شناخت ہو گیا جسے خدا نام سے جانتا ہے۔

ارتقائی تصور ہمیں دوہری مصیبت میں چھوڑ دیتا ہے۔ یا تو روح کا مواد مادے سے تعلق رکھتا ہے یا روح اچانک ظاہر ہوتی ہے، اور اشیاء کی ترکیب میں عدم تسلسل تشکیل دیتی ہے۔ نظریہ مادیت بھی بے حودہ لگتا ہے کیونکہ عدم تسلسل نا قابل قبول ہے۔ ایک انسان کو دو نا قابل اجازت چیزوں کے درمیان انتخاب کرنا پڑتا ہے۔

☆☆☆

روح/ جسم ایک باہم عمل

مشین میں ''روح''

جسم اور روح کے ملاپ کی منفرد تخلیق ماہرین ارتقاء کے لیے خصوصاً مادیت کے فلسفے کے لیے ایک مسئلہ ہے۔کوئی خوددار ماہر ارتقاء اس منظر کے خدوخال نہیں دکھائے گا کیونکہ نظریہ ارتقاء جاندار دنیا کی بقاء کا صرف جزوی جواب مہیا کرتا ہے۔ مادہ، زندگی، شعور اور خود شعوری ایک عظیم سلسلے کے ابھرتے ہوئے پیمانے ہیں، جس میں کوئی عدم تسلسل نہیں اور نہ ہی کچھ ایسا ہے جسے الیکٹرو کیمیکل کی اصطلاح میں مقداری طور پر سمجھا جا سکے۔

یہ سلسلہ پیمائشی طور پر مربوط و محفوظ ہے اور کسی بھی میکانزم یا ذریعہ توانائی جو اس نظام کا حصہ نہ ہو کہ تعارف کے بغیر ہے۔کائنات بلحاظ معانی لاتعداد نہیں، ایک ہی ہے اور قوانین کا ایک ہی نظام اس پر حکمرانی کرتا ہے جو کچھ اس کے اندر ظاہر ہوتا ہے۔اس کے لیے الٰہی مداخلتیں ناقابل اجازت ہیں۔

اگر کوئی ایسی چیز ہے جیسے کہ جان یا روح یا ارادہ یا دماغ کی خودآگہی تو یہ حقیقتاً کوئی دوسرا نظام نہیں بلکہ مادے ہی کا براہ راست نتیجہ ہے جو کہ پیچیدگی کی ایک یقینی سطح پر پہنچ چکا ہے۔ارنسٹ ہیکل (1834-1919) نے جرمن ایسوسی ایشن آف سائنس سے اک خطاب میں اپنے سامعین کو یقین دلایا کہ ایک بار جب سیل کے کیمیائی اجزاء (کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن اور سلفر) صحیح طور پر جڑ جاتے ہیں تو وہ حرکی دنیا کے روح اور جسم پیدا کرتے ہیں، اور اگر اس کی مناسب دیکھ بھال ہو تو یہ انسان بن جاتا ہے...کائنات کا راز اسی ایک واحد دلیل یعنی ذریعے سے واضح کیا گیا۔خدا کی خدائی منسوخ ہوگئی اور نصیب لامحدود علم کا ایک نیا دور بن گیا۔

آج وہ ماہرین ارتقاء جو اپنی سوچ میں انتہائی منطقی ہیں، ''اس بیان میں جھگڑنے جی کوئی چیز نہیں پاتے''۔ بہت سی نسلوں تک ارتقائی بیالوجسٹوں اور فزیالوجسٹوں نے اپنی تحقیق و تلاش اسی فلسفے کی قبولیت میں پیش کی۔اگرچہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ابھی تک بہت سے ایسے سوال ہیں جس کا کوئی جواب نہیں پھر بھی وہ اسی نظریے پر قائم ہیں۔ جب حالیہ سالوں میں اس نظریے کو یہ کہ انسان صرف ایک موثر مشین ہے کو دعووں کا سامنا کرنا پڑا اور مشین کے اندر روحوں کی دریافتوں کو افواہیں کہا جانے لگا تو بشمول محققین کے سب دنگ رہ گئے۔

روح (Ghost) کی ایک جھلک: پین فیلڈ کے تجربات میں

روح کی شہادت کی انتہائی موثر سطور میں سے ایک ویلڈر پین فیلڈ کے کام سے آئی ہے جو 1976 میں وفات پا گئے۔انھوں نے کئی سالوں تک مونٹریال نیورولوجیکل انسٹیٹیوٹ میں مرگی کے مریضوں کا انتہائی کامیاب علاج کیا۔ان سالوں کے دوران پین فیلڈ نے دماغ کے آپریشن کر کے ہزاروں لوگوں کو آرام پہنچایا جن کا تصور اور تکمیل بلاشبہ جرت مندانہ کام تھا، جو اسے حاصل ہوا اس پر نہ صرف اس کے ساتھی کارکن بلکہ وہ خود بھی بہت حیران تھا۔

یاد رکھیے کہ میں اس باب میں ذہن اور دماغ کے فرق پر بات کر رہا ہوں، ''ذہن' سوچ، ارادے اور شعوری توجہ کا نام ہے اور غیر جسمانی ہے۔ اور یہ خود ہی کسی صورتحال کی جانچ کرتا ہے اور اس کے معانی وضع کرتا ہے اس کے برعکس دماغ ایک جسمانی چیز ہے، ایک عضو ہے جسے ذہن استعمال کرتا ہے یہ کھوپڑی میں واقع ہے۔ اور اربوں اعصابی خلیوں سے مرکب ہے جن میں سے ہر ایک خلیہ دوسرے خلیے سے کم وبیش دس ہزار فائبرز کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یہ ناقابل یقین حد تک پیچیدہ ساخت ہے۔

زیادہ تر سائنس دانوں کی طرح پین فیلڈ نے بھی اپنے کام کا آغاز اس یقین کے ساتھ کیا کہ دماغ ذہن کا جوابدہ ہے، جس طرح چشمہ اپنے پانی کے شور کا۔ پانی کا بہاؤ روک دیں تو شور رک جاتا ہے، اور دماغ تباہ کر دیں تو ذہن تباہ ہو جاتا ہے۔ ذہن اور پانی کا شور دونوں ثانوی اثرات ہیں اور حقیقت میں ان کا وجود آزادانہ نہیں۔ اپنی ریٹائرمینٹ کے بعد اس نے اپنی پچھلی یادیں اس طرح لکھیں:

> میں نے اپنے سائنسی دور کے دوران دوسرے سائنس دانوں کی طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دماغ ذہن کا جوابدہ ہے۔ اب شاید وقت آ گیا ہے کہ ہم واقعہ کو اس طرح تصور کریں جس طرح ہے اور یہ سوال کریں، کہ کیا دماغ کا میکنیزم ذہن کا جوابدہ ہے؟ کیا دماغ کے بارے میں اب تک علم ذہن کی وضاحت کر سکتا ہے؟ اگر اب نہیں تو ان دونوں نظریات میں سے کونسا عقلی ہے۔ کہ انسان کی بنیاد ایک عنصر پر ہے یا دو پر؟

یہ تبدیلی اور یہ سوالات ان شاندار تجربات سے ابھرے جو اس نے اپنی زندگی میں کیے۔

مختصر طور پر یہ کہ پین فیلڈ نے جو تکنیک استعمال کی وہ یہ تھی کہ کھوپڑی کو ہٹا کر دماغ کی اوپری سطح کا حصہ اسی طرح پڑا رہنے دیں۔ اس طرح جو حرکاتی حصہ نمایاں ہوتا ہے وہ مرگی کے مریضوں کی غیر ارادی حرکات سے وابستہ ہے۔ مریض کو جزوی طور پر بے ہوش کر لیا جاتا ہے اور اسکی کھوپڑی کھولنے سے وہ ہلکا سا درد محسوس کرتا ہے یا بالکل نہیں۔ لیکن اسے باہوش رکھا جاتا ہے کیونکہ سرجن کے ساتھ اسکی بات چیت آپریشن کی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔

اس طرح سے سرجن دماغ کا نقصان دہ حصہ تلاش کرنے کے لیے سطح کو زخم لگا سکتا ہے۔ آپریشن کرنے کا آلہ بھی ایک الیکٹروڈ کا بنا ہوتا ہے، جو کہ ساٹھ سائیکل ٹو والٹ کرنٹ استعمال کرتا ہے۔ دماغ کی سطح کے ساتھ رابطہ کرتے ہوئے یہ درد کے احساس کا سبب نہیں بنتا لیکن جب اس طرح سے نقصان دہ حصے کو حرکت دی جاتی ہے تو مریض فوراً آگاہ ہو جاتا ہے کہ اسے مرگی کا دورہ پڑنے لگا ہے۔ اس طرح سے مدافعتی ٹشو لگائے جا سکتے ہیں اور آپریشن کی درستگی کی امید کی جا سکتی ہے۔

سرجن کو مریض کے ساتھ آپریشن کے دوران تمام وقت انتہائی قریبی رابطہ رکھنا پڑتا ہے، اور پین فیلڈ خود اس شدید اعتماد سے متاثر تھا۔ لیکن یہ دریافت غیر متوقع تھی کہ جب کوئی خاص حصہ الیکٹروڈ سے حرکت میں لایا جاتا تو مریض تیز یاددہانی کا تجربہ کرتا، اور اکثر وہ شک کرتا جیسے پین فیلڈ کوئی ریکارڈنگ استعمال کرتا ہو۔ اس یادداشت میں آواز، رنگوں کا نظارہ حتیٰ کہ ان کی ترتیب بھی شامل تھی کوئی بھی حصہ بار بار جوڑا جا سکتا تھا اور یاددہانی کے مراحل میں جو مریض کے شعور میں ہوتے تفصیل سے چلائے جا سکتے تھے۔ ایک موقع پر الیکٹروڈ کو ایک ہی جگہ باقاعدگی سے ساٹھ بار لگایا گیا، اور ہر بار یادداشت کا تجربہ ایک جیسا ہی رہا۔

حیرانی کی بات یہ تھی کہ مریض کی آگاہی (کہ کمرہ آپریشن میں کیا ہو رہا ہے) اس کی عملے سے بات چیت اور باہر کا شور اسکی یادداشت میں بالکل دخل انداز نہیں ہو رہا تھا۔ مریض دو طرح کے شعور کا تجربہ کر رہا تھا: ایک ماضی کی صورتحال کا اور دوسرا آپریشن کے اردگرد کے حالات کا۔ اس لیے مریض کے لیے یہ بات ممکن تھی کہ وہ دو دنیاؤں میں رہ کر یادداشتوں پر آپریشن تھیٹر کے لوگوں کے ساتھ تفصیل سے گفتگو کر سکے۔ مریض کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ جو یادداشت دو طرح کے میوزک پر، سیٹی یا گنگنانے پر بھی مشتمل تھی، اس کو نہ صرف یاد کر سکے بلکہ شناخت بھی کر سکے۔

ایک دن پین فیلڈ کو ایک نیا تجربہ ہوا اور اس کی آنکھیں ایک نئے راستے کی طرف کھل گئیں کہ انسان نامی مشینری میں روح کا وجود بھی ہے اُس نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا:

> جب کوئی نیورو سرجن الیکٹروڈ کو مریض کے دماغ کے حرکی حصے پر لاگو کرتا ہے تو اس کا مخالف ہاتھ حرکت میں آتا ہے اور جب وہ مریض سے پوچھتا ہے کہ اس نے اپنا ہاتھ کیوں ہلایا تو جواب ملتا ہے، "نہیں میں نے نہیں ہلایا، تم نے ایسا کروایا ہے..." یہ کہا جا سکتا ہے کہ مریض اپنے بارے میں یہ سوچتا ہے کہ وہ جسم سے الگ بھی کوئی وجود رکھتا ہے۔
>
> ایک بار جب میں نے مریض کو بتا دیا کہ میں اس کے دماغ کے حرکی علاقے کو متحرک کرنے لگا ہوں، اور اسے یہ کہا کہ جب میں الیکٹروڈ لگاؤں گا تو تم اپنے ہاتھ کو حرکت سے روک کر دکھانا اُس نے دوسرے ہاتھ کے ساتھ ایسا کر دکھایا اور اسے پکڑے رکھا۔ اس طرح ایک ہاتھ الیکٹروڈ سے حرکت دیتے ہوئے دائیں ہیمسفیر (دماغ کا حصہ) کے قابو میں تھا اور دوسرا ہاتھ بائیں ہیمسفیر کے قابو میں۔ اور دونوں ہاتھ ایک دوسرے کے خلاف کوشش کر رہے تھے۔ ایک ہیمسفیر کے دماغی عمل کے پیچھے مریض کا ذہن تھا اور دوسرے ہیمسفیر کے پیچھے الیکٹروڈ۔

پین فیلڈ نے یہ نتیجہ نکالا کہ دماغ ذہین کے سبب نہیں ہے بلکہ ذہن کا خادم ہے، اور مرضی سے کام کرنے کے لیے اس کا آلہ ہے۔ اس اتفاقیہ دریافت کو کئی بار دہرایا گیا اور پھر تجرباتی طور پر شک سے بالاتر واضح کیا گیا: دماغ عمل کو قابو کرتا ہے لیکن الیکٹروڈ دماغ کو۔ حقیقی زندگی اس کا متضاد ہے۔ یعنی ذہن دماغ کو کنٹرول کرتا ہے اور اسے استعمال کرتا ہے اور مادی دنیا پر اثر ڈالتا ہے۔ ایک حد تک دماغ ایک جسمانی عضو ہے جس کی ترقی جینیاتی لیاقت اور تجرباتی حاثات کے نتیجے میں ہوتی ہے۔ وکٹر فرینکل کی طرح سے یہ کہا جا سکتا ہے، دماغ ذہن کو بڑھاوا نہیں دیتا بلکہ اس کے ساتھ مشروط ہے۔

ذہن کی دماغ پر سبقت: کارن ہوبر کے تجربات

دماغ پر ذہن کی سبقت کا دوسرا ثبوت کچھ تجربات کے ذریعے ایچ ایچ کارن ہوبر نے دیا، اس کی دریافتوں کو سائنسی تصحیح کے ساتھ بیان کرنا قاری پر بوجھ ڈالنا اور اسے کھو دینا ہوگا! لیکن جو اس نے دریافت کیا وہ سادہ طور پر یہ ہے: جب کوئی ارادی عمل کیا جاتا ہے تو

کارٹیکس (دماغ کا حصہ) میں قابل پیمائش برقی صلاحیات پیدا ہوتی ہیں جو اس عمل کو کنٹرول کرتی ہیں۔ان صلاحیتوں کا مشاہدہ عمل کے بعد کیا جاتا ہے لیکن صرف ارادی عمل کے بعد۔لہٰذا ارادے کی شعوری مشق اور نتائج کی سرگرمی کے درمیان ایک قابل پیمائش دیر ہوتی ہے۔اور کبھی کبھی اس کا دورانیہ کئی سیکنڈ تک چلا جاتا ہے۔

اس مختصر مگر اہم وقفے میں برقی لہریں ایک وسیع علاقے میں پھیل جاتی ہیں جو آہستہ آہستہ تنگ ہو جاتا ہے اور اس اشارے پر متوجہ ہو جاتا ہے جس سے صحیح ارادی تحریک لائی جاتی ہے۔ارادے اور سرگرمی کے درمیان دیر قابل پیمائش ہے اور ارادے کی فطرت اور نتیجے کی سرگرمی میں مطابقت ہوتی ہے۔یہ کسی سارجنٹ کے ''کمپنی'' کہنے کی طرح سے ہے جو وہ پیروی کے لیے کوئی خاص حکم دینے سے پہلے کہتا ہے۔یہ ایک انتباہ کی طرح سے لگتا ہے یعنی کوئی ارادہ میکنیزم پر عمل کرنے والا ہے۔

نیورو فزیالوجسٹ سر جان ایکلز نے بیان کیا کہ، ''یہ تجربات ہمیں قائل کرنے کے لیے ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ رضا کارانہ حرکات دماغ کی نیورو مشینری میں بیرونی اثرات کے تحت رونما ہوتے ہیں۔''

مختصر یہ کہ مشین میں واقع روح ہے جو مشینری کو احکامات دینے اور اسکو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے قابل ہے۔

ذہن اور دماغ: دو مختلف زاویوں سے

مسئلہ ابھی بھی موجود ہے کہ ذہن یا ارادہ یا بلحاظ متن روح کس طرح سے دماغ کیساتھ رابطہ رکھتے ہیں۔میں اپنی مرضی سے اپنے ہاتھ کو حرکت دے سکتا ہوں، لیکن میرے ارادے سے دیوار پر لگے کلاک کی سوئیاں حرکت نہیں کریں گی۔ظاہر ہے کلاک کی سوئیوں کیساتھ کوئی ربط نہیں کہ ان تک پیغام پہنچایا جائے۔لیکن میرا ارادہ غیر جسمانی روح ہے تو پھر دماغ کیساتھ اس کا اصل رابطہ کہاں ہے جو میرے ہاتھ کو حرکت میں لاتا ہے، یہ مسئلہ ایک الہام کی طرح سے ہے۔تجویز یہ ہے کہ اگر ہم اس مسئلے کو واقع ہی حل کر سکتے ہیں تو ہمارے پاس ایک بہتر نظریہ یہ ہے کہ خدا جسمانی دنیا پر کیسے عمل کرتا ہے؟ ایمان سے پہاڑ کیسے حرکت کرتے ہیں؟ یا کیسے خداوند یسوع مسیح نے گلیل کی جھیل میں شدید طوفان کو فوراً روک دیا۔

ڈیس کارٹس نے اس روح اور جسم کے باہمی عمل کو پہچانا اور کہا کہ یہ دو طرح سے کام کرتے ہیں۔آج ہم باہمی عمل کی ان دو اقسام پر بات کریں گے۔یعنی روح و جسم کا باہمی عمل کس بات پر منحصر ہے جہاں سے آغاز ہوتا ہے، لیکن ڈیس کارٹس کی طرح سے ہم بھی حل کے تھوڑا قریب آ گئے ہیں۔جس نے نقطہ ربط کے لیے تحقیق کو آخر کار ترک کر دیا۔

ڈیس کارٹس نے ایک طریقہ کار کا انکشاف کیا کہ جب صحیح راستے کی طرف نشاندہی ہوتی ہے تو ہم فوراً پہچان جاتے ہیں۔پین فیلڈ اور کارن ہوبر کی طرح سے یہ طریقہ کار بھی واضح کرتا ہے کہ اس مشین میں واقع کچھ ہے جو اس سے کام کرواتا ہے۔

جو کچھ ہمارے ذہن میں ہے وہ ہماری قابلیت ہے، مادی دنیا کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کے لیے ہمارے پاس تین سمتیں ہیں نہ کہ دو جیسے کہ ایک عام تصویر اسے پیش کرتی ہے۔ہم اشیاء کے درمیان فاصلے پر ہوتے ہیں اور نہ ہی ہموار۔تین سمتی اثر اس لیے ہے کیونکہ ہماری دو آنکھیں اوسطاً 650 ملی میٹر دوری پر رکھی جاتی ہیں تا کہ ہم کسی منظر کی تصویروں کو الگ کر سکیں جسے ان دو حالتوں میں ایک لمحے لیا

گیا ہے۔

اس طرح اگر ایک کیمرے کے دو لینز ہماری آنکھوں کی طرح سے ہوں اور ایک ہی لمحے دو مختلف حالتوں کی دو تصویریں لے سکیں اور ان دونوں تصویروں کو مناسب طور سے اکٹھا کیا جائے تا کہ ہر آنکھ صرف ایک تصویر دیکھ سکے، تو ہم اچانک اپنے آپ کو تین سمتی دنیا میں پائیں گے۔ اگر چہ ہم ایک تصویر کو دو سمتی کاغذ پر دیکھ رہے ہیں۔ میرے پاس ایسا کیمرہ ہے اور میں نے اسے استعمال بھی کیا ہے اس کے دوہرے اثر نے ہمیشہ سنسنی ہی پیدا کی۔ کوئی یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ ایسے کیمرے خاص نظارے دیکھنے کے لیے ہی استعمال ہوتے ہیں ان کا استعمال وسیع پیمانے پر کیوں نہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب پہلی بار دیکھنے والا دیکھتا ہے تو اسے دو مختلف تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر چہ وہ عارضی طور پر غیر موافق ہوتی ہیں، پھر بھی ان میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ دو تصویروں کے درمیان فرق واضح طور پر کھل جاتا ہے اگر ہم ایک کے بعد دوسری دیکھیں اور انھیں اکٹھا کر کے سکرین پر دیکھیں۔ سکرین پر تصویر دھندلی اور مبہم ہوگی جیسے کہ تصویر لیتے ہوئے ایک خاص لمحے پر کیمرہ تھوڑا سا ہل گیا ہو۔ پروجیکٹر کا کوئی بھی فوکس اس دھندلاپ اور ابہام کو حل نہیں کر پائے گا۔

میں نے اس پر اس لیے زور دیا ہے کہ ان کی اہمیت قطعی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دو تصویریں سکرین پر ایک دوسرے کے اوپر چڑھا کر جوڑی نہیں جا سکتیں۔ دو آنکھوں کے دو لینز بھی دو تصویروں کو دو ریٹینا (آنکھ کا پردہ) پر اتار نہیں سکتے۔ ڈیس کارٹس نے قیاس کیا کہ دو ریٹینا کے اشارے جو دو غیر موافق تصویر کو سکرین پر دکھا رہے ہوں دماغ میں ایک ہی مقام پر پہنچتے ہیں جہاں وہ آپس میں ملکر ایک ہی سہ جہتی شکل میں ڈھل جاتے ہیں لیکن وہ کبھی بھی اعصاب کا خاکہ نہیں بنا سکا۔ وہ یہ دریافت کر چکا ہوگا کہ یہ دو اشارے دماغ میں ایک تصویر کی شکل اختیار نہیں کرتے مگر کارٹیکس (دماغ کا حصہ) میں الگ الگ رہتے ہیں، یعنی ایک بائیں ہیمسفیر میں اور دوسرا دائیں ہیمسفیر میں (دیکھیں تصویر 9.1)

پھر دو مختلف نظارے ایک طور پر کیسے دیکھے جاتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ یہ ذہن ہے جو انھیں جوڑتا ہے اور ترتیب دیتا ہے نہ کہ دماغ، ابھی تک یہ کہنا ناممکن ہے کہ یہ کام کیسے ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی پہلی بار میرے نظارے میں دیکھتا ہے تو اسے پتا چل جائے گا کہ دونوں نظاروں کو فوراً نہیں جوڑا، لیکن پھر اچانک یہ دو متضاد تصویریں فوراً جڑ جاتی ہیں اور ہم انہیں ایک تصویر کی طرح سے دیکھتے ہیں اس حقیقی طریقے کو بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ ''تبدیلی' اہم اور اچانک ہوتی ہے۔ دو نظارے غیر متوقع حائل ہو جاتے ہیں اور تصویر سہ جہتی شکل میں ابھرتی ہے! یہ ذہن کے کام کا دلچسپ تجربہ اور حیران کن وضاحت ہے۔

اگر کوئی دیکھنے والا سہ جہتی تجزیہ ایک ہی تصویر میں حاصل کر سکتا ہے تو وہ سینکڑوں تصویروں میں بھی جا سکتا ہے، اور اسے پہلے نظارے کی طرح دہری یا اچانک تجزیے کا کوئی تجربہ نہیں ہوگا۔ بلا شبہ وہ پہلے سے مقرر سہولت پیدا کر لیتا ہے جس سے جڑنے کا عمل تیز ہو جاتا ہے اور یہ عمل دیر تک چلتا ہے خواہ نظارہ ایک طرف رکھ دیا جائے۔ دن اور مہینے گزر سکتے ہیں مگر یہ دوہرے نظارے کی مہارت گم نہیں ہو

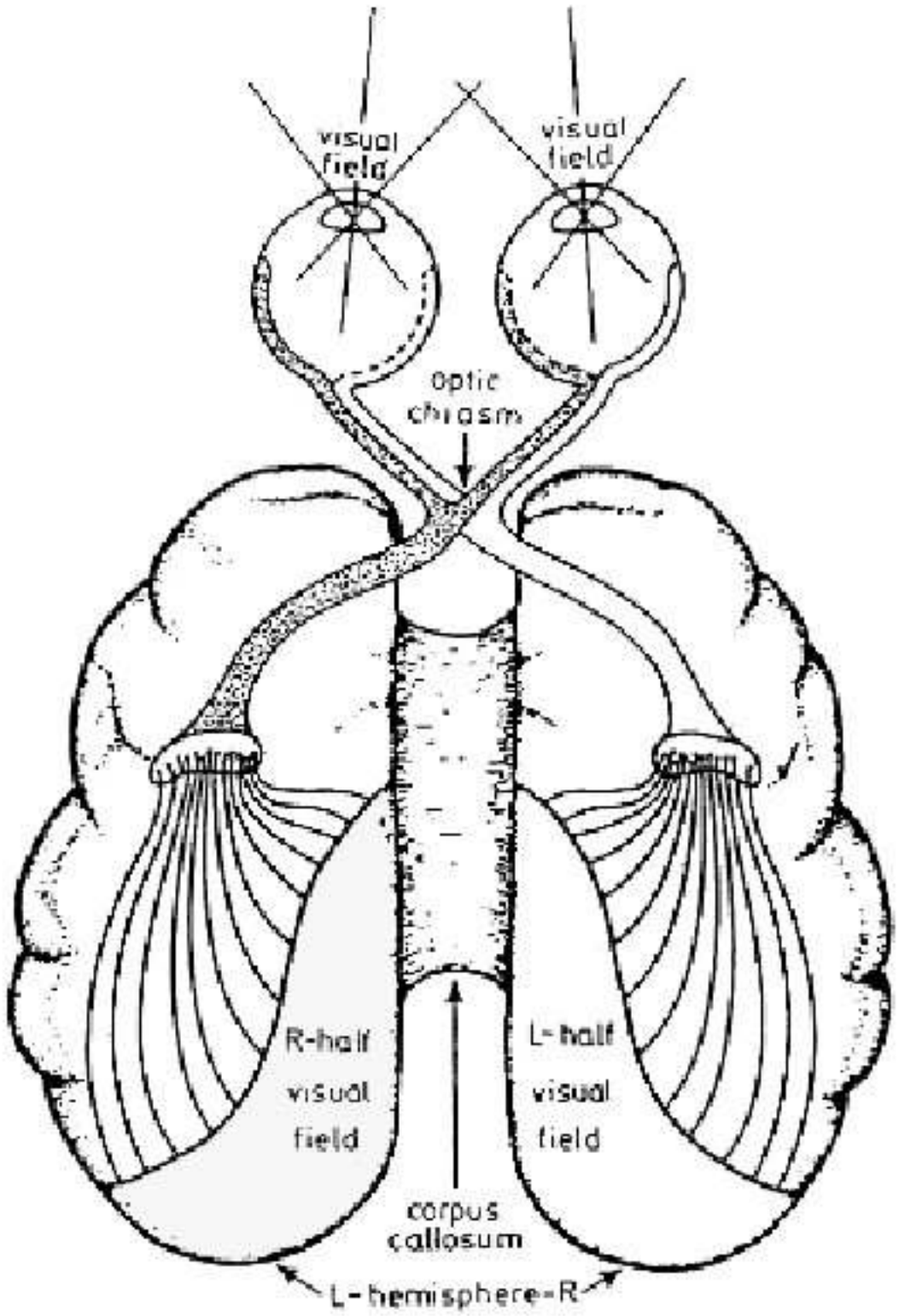

Figure 9.1:

Diagram showing how the pathways of the separate signals from the two eyes lead to two separate areas of the brain. Light captured by the left side of each of the eyes originates from the right (R-half) visual field and is sent via the optic nerves to the left side of the brain (stippled pathway). Light captured by the right side of each of the eyes originates in the left (L-half) visual field, and goes to the right side of the brain (non-stippled pathway).

گی ایسا دکھائی دے گا کہ ذہن نے یہ کرتب سیکھ لیا ہے۔

مختلف نظاروں کو جوڑ کر ایک دکھانے والی آنکھیں نہیں ہیں: بلکہ دو مختلف اور متضاد تصویروں کو جوڑنے اور ملانے کا کام ذہن کرتا ہے۔ دماغ قواعد کی شکل میں مواد مہیا کرتا ہے، ذہن، جان یا روح اس مواد کو حقیقت کی گہری شکل دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں

۔اس ملاپ کے بغیر سب کچھ ایک الجھن ہے۔ کسی ایک آنکھ کی قوتِ توجہ کے نقص کی وجہ سے جب اشارے غلط پیش کیے جاتے ہیں (ایسا مشینری کی خرابی کی وجہ سے ہوسکتا ہے) تو یہ ذہن یا جان یا روح ہی ہیں جو دونوں اشاروں میں سے ایک کو نظر انداز کر کے غیر موافق کشمکش کا تجزیہ کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب ایسا ہوتا ہے تو ہم گہرا تصور کھو دیتے ہیں، مگر پھر بھی ذہن آنکھوں کے الجھے اشاروں سے ادراک کروا دیتا ہے۔ ذہن صرف اس چیز کو ڈھال سکتا ہے جو دماغ صحیح رابطے سے پیش کرتا ہے۔

ذہن وہ کام کرتا ہے جو نہ کیمرہ کر سکتا ہے نہ آنکھیں، دو تصویروں کے تضاد کو خارج کرنے کے لیے ہم ایک آنکھ کو ڈھانپ لیتے ہیں! لیکن سٹیریوویژن (کسی چیز کو دو زاویوں سے دیکھنا) کے بغیر ہم اشیاء کی ضخامت اور گہرائی کا تصور نہیں کر سکتے، نہ پورے اعتماد سے ان پر قابو پا سکتے ہیں اور نہ ہی مسلسل آزمائش، غلطی اور تکلیف کے بغیر سوئی میں دھاگہ ڈال سکتے ہیں۔ کار چلاتے ہوئے ہمیں اپنے سے اگلی کار کا فاصلہ اس کے بدلتے ہوئے سائز سے ماپنا چاہیے اس طرح دنیا کی تصویر جو ہمارے پاس ہے ہموار ہوگی اور ہم اسی کو استعمال کریں گے۔ لوگ صرف ایک آنکھ سے کام کرتے ہیں دوہرے نظریے سے نہیں، لیکن اس ملاپ یا گلاوٹ سے ہٹ کر جسمانی دنیا کے حقائق کا ادراک اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہوگا۔ اگر ایک انتہائی چھوٹا الیکٹرانک سرکٹ جوڑا جا سکے تو یہ مشکوک ہوگا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے اگر ہم ہر صورتحال میں فاصلوں کا اندازہ کرنا نہ سیکھ لیں تو ہزار الجھنیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ اس سے ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ اشیاء کو تصور سے کہاں دیکھنا ہے۔

ذہن ہمارے لیے وہ کام کرتا ہے جو آنکھ نہیں کر سکتی، جو سٹیریو کیمرہ نہیں کر سکتا، جو سٹیریو مائیکروسکوپ نہیں کر سکتی اور جو سٹیریو پروجیکٹر نہیں کر سکتا مختصر یہ کہ کوئی مشین بھی نہیں کر سکتی۔ اگر ذہن اندرونی افعال کو منظم نہ کرے تو کوئی تخلیق ہوسکتی ہے نہ کوئی بامعنی ملاپ، کمپیوٹر اشارے جمع کرتا ہے وہ یہ کام خود بخود نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے اندر ایسا کوئی عمل چل نہیں رہا ہوتا۔ یہ صرف ایک مشین ہے جو ڈیزائن کے مطابق اشاروں کو اس طرح راستہ دکھاتی ہے کہ وہ ہمارے ذہن کیلیے بامعنی ہو جاتی ہے۔ کمپیوٹر کو علم نہیں ہوتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

انسان سے نچلے درجے کے بہت سے جانوروں میں اشیاء کو دو زاویوں سے دیکھنے کی صلاحیت ہے اگرچہ بعض اوقات اس کی وسعت زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ ان جانوروں کی مشینری میں بھی انسان کی طرح (روح) کچھ ہے جو کہ دماغ تک پہنچنے والے دو اشاروں کو مرکب کرتا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ جانور بھی جسم اور روح سے عبارت ہیں، کیا وہ بھی زندگیاں ہیں؟

اس کا جواب ہاں لگتا ہے۔ بلاشبہ عبرانی میں روح کے لیے لفظ (Nephesh) اکثر جانوروں کے لیے استعمال ہوا ہے اور اصل میں انسانوں سے پہلے یہ جانوروں پر ہی لاگو ہوتا ہے۔ کیا اس لحاظ سے انسان اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں؟ یقیناً فرق ہے اگرچہ

انسانوں اور جانوروں دونوں کے اجسام مٹی میں جاتے ہیں لیکن روح کا مقدر بالکل مختلف ہے ۔واعظ 13:21 اور 12:7 ہمیں بتاتا ہے کہ''انسان کی روح اوپر کو جاتی ہے یعنی خدا کی طرف جس نے اسے بخشا اور حیوان کی روح زمین کی طرف'' جہاں یہ اپنے جسم کی تقدیر کے ساتھ جاملتی ہے۔دوسرے لفظوں میں دونوں (انسانی اور حیوانی روح) کی منزل ایک دوسرے کے متضاد ہے۔

جسم اور روح کے باہمی عمل کی اصطلاحات:

ہم بہت سی اصطلاحات مثلاً ذہن ، ذہانت ، ارادہ ، جان ، روح وغیرہ کو بلا امتیاز استعمال کرتے ہیں۔مشین میں کسی''روح'' کی سرگرمیوں کو بیان کرنے کے لیے زیادہ اصطلاحات کا ہونا بدقسمتی ہے۔ یہ سب اصطلاحات مناسب ہیں مگر ان میں سے ہر ایک نا دکھائی دینے والی ہے۔لہذا وہ جسمانی نہیں بلکہ روحانی اہلیت رکھتی ہیں۔میں ایک لفظ کہنا چاہوں گا کہ''آگاہی'' کا کیا مطلب ہے،اور خود آگاہی کا کیا مطلب ہے،جس جو بیان کرنا زیادہ مشکل ہے۔

کبھی کبھی بچے بغیر دماغ کے پیدا ہوتے ہیں پھر بھی وہ آواز اور بُو پر جسمانی لحاظ سے ردعمل کرتے ہیں۔اس ردعمل کے باوجود اصل شعور کی کوئی شہادت نہیں ملتی اور اس کو پیش کرنے کے لیے نہ ہی کوئی دماغ ہوتا ہے، "حقیقت میں وہاں کوئی نہیں ہوتا۔" وہ زندہ ہوتے ہیں لیکن اس شخص کی طرح جو گھرے سکتے میں ہو،اور وہ اپنے ارادے سے بھی کبھی اس سے باہر نہیں آپاتے۔ان کا بیرونی حقیقت سے کوئی شعوری رابطہ نہیں ہوتا کیونکہ ان میں کارٹیکس نہیں ہوتا۔یہ صورتحال اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ردعمل کی حیران کن سطح شعور کی مکمل عدم موجودگی میں بھی ممکن ہے۔

آخری نقطہ اہم ہے۔جانور بھی اپنے اجسام کا بیمار اور زخمی ہونے کی حالت میں شعور رکھتے ہیں،لیکن انسان زیادہ تر اپنی بیداری کی حالت میں اپنے جسم کا شعور رکھتا ہے۔جب کوئی بچہ پہلے پہل یہ دریافت کرتا ہے کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں اس کے جسم کا حصہ ہیں تو غالباً پہلی بار اس میں خود آگاہی کی جھلک پیدا ہوتی ہے۔اس لیے یہ بات اہم ہے کہ انسانی جسم اپنی زندگی کی ابتدا میں ہی شعور پیدا کر لیتا ہے۔ یعنی نہ صرف وہ اپنے جسم سے بلکہ دوسرے اجسام سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے۔ہم اپنے اجسام کو مقبول سمجھتے ہیں،ایک ایسی چیز جسے الگ کھڑا کیا جاسکتا ہے اور مادی خیال کر سکتے ہیں۔

ذاتی جسمانی شناخت کے اس معاملے میں میرا خیال ہے کہ یہ بات انتہائی اہم ہے کہ صرف انسان وہ واحد مخلوق ہے جو اپنے مردہ اجسام کا خیال رکھتی ہے!ایسا کوئی جانور نہیں جو اسے ایک عارضی چیز سے زیادہ سمجھتا ہو،اُسے مردہ جسم میں سوائے خوراک کے اور کوئی دلچسپی نہیں ہوتی خواہ وہ جسم اس کے اپنے ساتھی کا کیوں نہ ہو۔ایک بار جب کوئی مردہ ہو جاتا ہے تو اسکو شکاریوں سے بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ بہت شروع کے وقتوں سے ہی قبر میں پھولوں کی موجودگی کا پتا چلا ہے یعنی انسان اپنے مردوں کو ارادۃً دفن کرتا تھا۔زیادہ تر مردوں کو جنین کی حالت میں رکھا جاتا ہے،یعنی اس حقیقت کی امید کی جاتی ہے کے موت کے بعد جسم نئی پیدائش کے ذریعے سے دوبارہ زندہ ہوگا۔

تھیوڈوسیس ڈوبزہانسکی لکھتا ہے ''ہر جگہ کے لوگ اپنے مردوں کی حفاظت رواج کے طور پر کرتے ہیں۔لیکن کوئی جانور ایسا کچھ نہیں کرتا اور انسانی رویوں کی یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ مردہ جسم کو زخم سے بچانے کے لیے اس کی حفاظت رسماً یا قانوناً کی جاتی ہے۔ بے شک زندہ لوگوں کی نسبت مردہ لوگوں کے ہاتھ پاؤں توڑنے سے منع کرنے کے قوانین زیادہ سخت ہیں۔انسان کا اپنے جسم اور دیگر لوگوں کا شعور رکھنا، حیوانی شعور سے بے حد مختلف ہے۔جسم کا اس کی روح کے ساتھ شعور اپنا ہو یا دوسروں کا انسانیت کا نتیجہ ہے۔

روح اور جسم ایک مسلمہ ملاپ

سر جان سی ایکلز (نیورو فزیالوجی پر کام میں نوبل انعام یافتہ) اور سر کارل آر۔پوپر نے مشترکہ طور پر 1977 میں ایک شاندار کتاب لکھی جو انسان روح و جان کی حقیقت اور اس کی دوہری فطرت کی حامی تھی۔کتاب لکھتے ہوئے انھوں نے اس کا موضوع انسان اور دماغ طے کیا۔لیکن بعد میں جوں جوں روح اور ذہن کو انسانی جسم میں منظم کرنے کے تجرباتی شواہد اکٹھے ہوتے گئے۔تو انھوں نے اس حقیقت کو مان لیا اور اس کا موضوع تبدیل کر دیا۔لکھنے والے نقطہ نظر سے یہ تبدیلی بہت چھوٹی تھی لیکن اس کا اطلاق بہت اہم تھا۔نیا موضوع انسان خود اور اس کا دماغ بن گیا

ایکلز نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ خود آگاہ ذہن سے، جسم سے ملنے والے اشاروں کے مشاہدات میں سست روی سے مشغول نہیں بلکہ ہو شیاری سے ان کی پڑتال کرتا ہے۔آنکھ کا، ناک کا اور کان کا سب سے بڑا عضو جلد ملے جلے اعصابی افعال شعور کے سامنے لگاتار پیش کرتے ہیں۔پھر ذہن دماغ میں آئے مختلف اشاروں میں سے مختلف چیزیں چنتا ہے۔اور اس کا کارٹیکس کے مختلف حصوں کے نتائج جمع کرتا ہے جسم اس طرح کافی کچھ لاگو کرتا ہے۔لیکن ذہن جان بوجھ کر کچھ کو نظر انداز کرتا دیتا اور دوسروں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔اس طرح سے خود آگاہ ذہن تجربے کی انفرادیت حاصل کرتا ہے۔جو کہ کلی طور پر ذاتی ہوتی ہے۔دماغ اپنے آپ کو ایک ذاتی کمپیوٹر کی طرح استعمال کرتا ہے۔اس نظریے کے مطابق سب سے اہم کردار خود آگاہ ذہن ادا کرتا ہے، اور اپنی منتخب اور مرکب صلاحیتوں کو استعمال میں لاتا ہے۔

یہ دونوں سائنس دان روح و جسم کے باہمی جوڑ سے متاثر تھے۔یہ ایک ایسا جوڑ تھا جس پر ''تھامس ایکوینز' سے لیکر 'جیمز اور' تک ماضی کے تمام ماہرین الٰہیات نے تبصرہ کیا اور موجودہ دور کے مصنفین کے لیے لکھا۔یہ سب سمجھتے تھے کہ روح و جسم کی کشش ایک مضبوط ذاتی شناخت کے احساس سے انسان میں ابھرتی ہے، جو جانوروں کی نسبت انسانوں میں بہت گہری ہے۔یہ ایک طرح کا شعور ہے، جس کا تعلق روح کی اپنے جسم سے آگاہی میں ہے۔جسے اب حیوانی زندگی کے انتہائی جدید طلباء بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انسان منفرد ہے۔

جیمز اور نے اس کشش کو بہت اہمیت دی اور جسمانی موت کو حقارت سے منسوب کیا۔اور پرانے وقتوں سے ہی انسان کی سوچ ایسی ہی رہی اگرچہ انسانی روح پر جسم ایک بوجھ ہے جو اس کی اعلیٰ ترین تمناؤں کو خواہشات کیوجہ سے خراب کرتا ہے۔پھر بھی یہ اس قدر مضبوطی سے جڑے ہوئے ہیں کہ انھیں زندگی بھر موت سے ٹوٹ پھوٹ کا ڈر رہتا ہے۔ابھی تک موت کی انتہائی ڈرامائی قابل قبول اور الٰہی تصور سے سچی ترین تعریف یہ ہے، ''جسم اور روح کی علیحدگی موت ہے۔''

ہم آزاد ہونے کے خواہش مند ہیں، کیونکہ یہ جسم تباہ ہوتا ہوا گھر ہے لیکن اس علیحدگی سے ہم اس طرح کانپتے ہیں جیسے کوئی اپنے

زندگی بھر کے ساتھی کے نقصان سے۔

ذہن یا روح بااختیار نشست ہیں۔ دماغ ایک آلہ ہے جو اس کی خدمت کرتا ہے۔ سب کچھ ذہن ہی مرکب، مرتب اور متحد کرتا ہے۔ جسم ایک مثالی خادم ہے اور ذہن اس بامعنی عمل کا مالک ہے جو ایک غیر جسمانی حقیقت ہے: لیکن زوال کے سبب سے اکثر جسم اس کا مالک بن جاتا ہے۔

رومیوں 7 باب میں پولوس اس کوشش کو وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ زوال کے نتائج جتنے جسم کے لیے مہلک ہیں اتنے ہی روح کے لیے۔ ہم کلام خدا میں اچھائی اور برائی کے باہمی عمل کو مثالوں کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

متی 26:41 میں یسوع نے اسے دکھ کے ساتھ بیان کیا ہے، ''روح تو تیار ہے مگر جسم کمزور ہے'' جیسے ہی وہ اپنی پیش قدمی کی ہولناک گھڑی اپنے شاگردوں کے پاس آیا تو انھیں سوتے پایا۔ پولوس نے افسوس کیا اور پکارا، ''آہ میں کیسا بد بخت آدمی ہوں! اس موت کے بدن سے مجھے کون چھڑائے گا؟ (رومیوں 7:24)''

اگرچہ وہ اپنے جسم پر چلایا لیکن اس لمحے اس نے کہا کہ مجھے کوئی خواہش نہیں کہ مجھے اس جسم سے الگ کیا جائے۔ یہاں ایک غیر مطلوبہ باہمی عمل تھا۔ لیکن بائبل معاون باہمی عمل کے بارے میں بھی بات کرتی ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ جب شاگرد یسوع کے پاس آئے تو حیران ہوئے اور کہا کہ بیماروں کو شفا دینے والی جوئی طاقت ہمیں ملی ہم اس میں ناکام ہو گئے ہیں۔ یسوع نے کہا، ''یہ جنس دعا اور روزے کے سوا نہیں نکلتی (مرقس 9:29)۔ یعنی دعا کے ذریعے جو روح کا ضابطہ ہے۔ شیطان کے ساتھ کچھ جنگیں ہیں جس میں روح و جسم یعنی مکمل انسان درکار ہے، حالانکہ حقیقت میں یہ جنگ روحانی ہے۔

نظریہ ارتقاء روح کا کوئی جواب نہیں دے سکتا

انسان کے پاس کمپیوٹر کی طرح کا دماغ ہے۔ یہ تو وہ ہے جو انسان کے پاس ہے، مگر انسان کیا ہے؟ انسان حقیقتاً ایک روحانی مخلوق ہے، لیکن وہ مجسم مخلوق اور تمام مخلوقات میں سے منفرد ہے کیونکہ اس کے جسم اور روح کا آغاز اور انجام دونوں لاثانی ہیں۔

ایکلز مسیحی عقائد سے ہرگز متفق نہیں تھا مگر اپنے تجربات کے ذریعے وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچا اس لیے اس کے کام سے بھی ہمیں روح کی ارتقائی بنیاد کو رد کر دینا چاہیے۔ اس نے یہی کہا حالانکہ اس کے ساتھی مصنف کارل پوپر نے اسے بلا ابہام قبول کر لیا۔

اپنی ایک اور کاوش ''حقیقت کا سامنا'' میں ایکلز کچھ بیانات کا مشاہدہ کرتا ہے ''ارتقاء کے دوران شعور یا ذہن کے بتدریج وقوع کو سائنسی شواہد حمایت نہیں کرتے، مگر یہ بیانات ایمان کی روح سے دیئے جاتے ہیں، کم از کم موجودہ ارتقائی نظریہ تمام جانداروں کی بنیاد اور ترقی کی وضاحت اسی اصول کے تحت کرنا ہے اور اس میں ہم خود بھی شامل ہیں۔

یہ ''ایمان'' تجرباتی ثبوتوں پر بتدریج ختم ہو رہا ہے۔ مشین میں ضرور کچھ ہے۔

☆☆☆

تیسرا حصہ

پہلے اور آخری آدم کی انسانیت

مسیحی ایمان محض اجزاء کا سلسلہ نہیں ہے:

اس میں ایک اہم عضوی وحدت ہے

اگر کل کا کوئی حصہ مطیع ہو جائے تو یہ وحدت

مکمل منطقی و غیر منطقی طور پر نا قابل دفاع بلکہ

تباہ ہو جاتی ہے۔

کھنڈرات میں گھر

پہلا آدم زوال شدہ انسان بن جاتا ہے

کیونکہ میں جانتا ہوں کہ مجھ میں یعنی میرے جسم میں کوئی نیکی بسی ہوئی نہیں (رومیوں 7:18)

کیونکہ ہم اس خیمے میں رہ کر بوجھ کے مارے آہیں بھرتے ہیں اس لیے کہ ہم پاجامہ اتارنا نہیں بلکہ اس پر اور پہننا چاہتے ہیں (کرنتھیوں 5:4)

سی ایس لیوس نے اپنی کتاب ''مسئلہ درد'' میں لکھا:

میرے خیال میں انسان کی گراوٹ محض اس کا انفرادی زوال نہیں بلکہ کسی صنف کے مرتبے کا نقصان ہے۔ انسان نے اپنے زوال سے اپنی حقیقی مخصوص فطرت کو کھو دیا....

یہ شرط وراثت کے ذریعے بعد میں آنے والی تمام نسلوں میں منتقل ہوگئی، کیونکہ یہ وہ نہیں جسے ماہر حیاتیات تغیر کہتے ہیں۔ یہ ایک نئی قسم کے انسان کا وقوع تھا۔ یہ ایک نئی صنف تھی جسے خدا نے کبھی ایسا نہیں بنایا تھا، یہ ایک ایسی صنف تھی جو گناہ کر چکی تھی۔ انسان جس تبدیلی سے گزر چکا تھا وہ کسی نئے عضو یا نئی عادت کی نشوونما نہیں تھی بلکہ اس کی سیرت میں ایک انقلابی تبدیلی تھی۔ یہ ایک مداخلت تھی جو اسکے اعضا اور اندرونی تحریف کے درمیان تھی۔

ہماری موجودہ حالت اس حقیقت سے واضح ہے کہ ہم ایک خراب شدہ صنف کے اراکین ہیں۔

چونکہ ہم جسم اور روح سے بڑھ کر ہیں اس لیے یہ واضح ہے کہ خراب شدہ جسم خراب شخص بناتا ہے۔ ہمارا جسم اور روح مکمل اور مہلک طور پر زخمی ہو چکے ہیں درحقیقت ہم وہ انسان نہیں رہے جس کا ارادہ خدا نے کیا تھا۔

جب خدا نے باغ عدن میں پکارا، ''آدم تم کہاں ہو؟'' تو میرا خیال ہے یہ وہ انسان نہیں تھا جس کو خدا تلاش کر رہا تھا۔ وہ جانتا کہ وہ شخص کہاں ہے۔ اور اس نے اپنی زندگی میں سے کیا کھو دیا ہے، اس نے شاہکار صنف تخلیق کی تھی اور اسے انتظام نظام زندگی پر اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ اصناف کی فہرست میں انسان سب سے پہلے تھا مگر وہ فطرت میں آجائے گا۔ اصناف کی تاریخ میں انسان ممتاز تھا مگر اس کا آغاز اس کے سوال سے ہوا۔

خدا نے انسان کی تخلیق کو ابھی ابھی مکمل کیا تھا اور اسے اپنی صورت دی تھی۔ مگر یہ انسان اب غائب ہو چکا تھا۔ انسان گناہ کر کے اصل انسان جیسا نہ تھا۔ اب وہ نہ معصوم تھا اور نہ لافانی، دوسری مخلوقات کی طرح اس میں حیوانی جبلت آگئی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنی صورت کھو دی تھی جو اسے عطا ہوئی تھی۔

کیا انسان: خدا کی شبیہہ میں ہے؟

آدم کے بچے خدا کی شبیہہ پر نہیں بلکہ آدم کی شکل میں پیدا ہوئے۔ پیدائش 5:1-3 کا حوالہ ان دو صورتوں کو قریب رکھتے ہوئے یوں واضح کرتا ہے:

آدم کا نصب نامہ یہ ہے۔ جس دن خدا نے انسان کو خلق کیا تو اسے خدا کی صورت پر بنایا۔

نر اور ناری انہیں بنایا اور انہیں برکت دی اور جس دن وہ پیدا کیے گئے اس نے ان کا نام آدم رکھا۔

آدم ایک سو تیس برس کا تھا کہ اسکا ایک بیٹا اس کی صوت پر اسکی مانند پیدا ہوا۔ اس نے اس کا نام سیت رکھا۔

خدا نے انسان کو اپنی مانند خلق کیا تھا (آیت 1) زوال شدہ آدم نے اپنی مانند بیٹے پیدا کیے (آیت 3)۔

آدم نے ممنوعہ پھل کھا کر خدا کے نظام میں مہلک زہر متعارف کروایا اور اپنے بعد آنے والے سب لوگوں میں جسمانی اور روحانی طور پر مہلک نقص پیدا کر دیا۔ یہ عمل نسل در نسل چلتا رہا انسان کی قوتِ حیات بتدریج کم ہوتے ہوئے ایک ہزار سال سے 120 سال تک آ گئی۔ اور داؤد کا دور آنے تک یہ عمر صرف ستر سال رہ گئی۔

4000 سال تک دنیا نے ایک حقیقی آدم، جیسا خدا نے اسے بنایا تھا، نہ دیکھا: پھر وہ خداوند یسوع مسیح کی ہستی میں ایک اعلیٰ و ارفع شکل میں ظاہر ہوا۔ جو خود خدا کے ظہور کا کامل ذریعہ ثابت ہوا۔

کبھی کبھار ہم مردانیت یا نسوانیت کی ایک عمدہ مثال دیکھتے ہیں، مگر یہ شان چند سالہ ہوتی ہے کیونکہ وہ باطن میں پہلے ہی سے مر رہے ہوتے ہیں۔ کوئی خفیہ چیز انھیں کھا رہی ہوتی ہے اور آخر کار روح روانہ ہو جاتی ہے اور موت زندگی کی شمع بجھا دیتی ہے۔ زندگی بھر جاری تباہی کا عمل انسان کو اچانک ہڑپ لیتا ہے، انتشار تیزی سے واقع ہوتا ہے پر تابوت ساز آڑے آ کر اس عمل کو سست کر دیتا ہے۔

یہ تباہی اچانک سے شروع نہیں ہوتی بلکہ ہم اپنی پیدائش ہی سے مر رہے ہوتے ہیں۔ لافانی مخلوق کی فانی مخلوق میں تبدیلی جسم کے ہر خلیے ہر عضو اور ہر ریشے کو متاثر کرتی ہے اور انسان کی خوبصورتی بدصورتی اور بڑھاپے میں بدل جاتی ہے۔

یہ اس مشین کی محض غیر معمولی تخلیص ہے، جس کے تحت وہ زخموں کو مندمل کرتی ہے اور ڈی این اے کی غلطیوں کو سدھارتی ہے۔

جسم روح کو کیسے متاثر کرتا ہے؟

کیا اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ واقع جسم کی بدعنوانی حیاتی طریقے سے روح کی تذلیل کرتی ہے؟ بلاشبہ اس کا جواب ہے ''ہاں''۔ یہ حقیقت جنگِ عظیم دوئم میں جاپانی کیمپوں میں ہونیوالی مردوں اور عورتوں کے اجسام کی بے حرمتی سے واضح ہے۔

ان خیموں سے لوگوں پر ہونے والے اثرات کا کئی بار مطالعہ کیا گیا۔ ان میں سے ایک کا نام ٹیرنس ڈیس پریس نے (The Survivor) ''زندہ رہنے والا'' رکھا۔ یہ ان عوامل کا مطالعہ تھا جن سے کچھ لوگ زندہ باقی بچے، اگرچہ کثیر تعداد خیموں میں ہی مر گئی تھی۔

ڈیس پریس نے زندہ بچ جانیوالوں سے انٹرویو یا خط و کتابت کی تو ایک چیز کھل کر سامنے آئی کہ انھوں نے اپنے جسم کی صفائی اور حفاظت کو اہمیت دی۔ وہ عموماً اپنی ٹھنڈی کافی میں انگلی ڈبو کر اپنے گال اور ماتھے کو چھو کر صاف کرتے، حالانکہ بظاہر یہ بہت غیر معمولی

اقدامات تھے۔

ایک بچنے والے نے انٹرویو میں اپنا مشاہدہ بتایا، ''میں نے اپنے اردگرد دیکھنا شروع کیا اور کسی بھی عورت کے اختتام کے آغاز کو دیکھا جس کے پاس پاک صاف ہونے کا موقع تھا مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔'' یہ لوگ کثیر کوڑے کے ڈھیر میں رہتے تھے وہاں غلاظت، قے، بہتے ہوئے زخم حتیٰ کہ اس ماحول میں کسی بھی قسم کی گندگی کی کوئی کمی نہ تھی۔ کچھ خیموں میں لوگ سارا دن ٹخنوں تک کوڑے میں کھڑے رہتے۔ حتیٰ کہ بدبو کی وجہ سے پرندوں نے ان خیموں پر اڑنا ترک کر دیا۔ اگر چہ جسم کی صفائی کی طرف ذرا سی توجہ بھی روح کو زندہ رکھنے کے لیے کافی تھی۔ جب اس توجہ کو بھی ترک کر دیا گیا تو لوگ مرنا شروع ہو گئے۔ ایک اور بچنے والے نے کہا، ''بہت سے ساتھیوں نے نہانا چھوڑ دیا۔ یہ مرنے کا پہلا مرحلہ تھا۔ یہ تقریباً فولادی قانون تھا۔ وہ لوگ جو ہر روز نہانے میں ناکام رہے جلد مر گئے.... یہ ایک یقینی علامت تھی۔''

ڈیس پریس ایک دانا لکھاری اس پر یوں تبصرہ کرتا ہے: ''اگر روحانی پھرتی کم ہو جائے، تو جسمانی برداشت بھی کم ہو جاتی ہے۔ اگر جسم بیمار پڑ جائے تو روح اپنی گرفت چھوڑنے لگتی ہے۔ انتہا پسندی کی بقاء کا ایک انوکھا نظام ہے۔ بچنے والے نہ مرنے کے لیے اپنی شخصیت کو محفوظ رکھتے ہیں۔ وہ جسم کی دیکھ بھال اخلاقی بقاء کے لحاظ سے کرتے ہیں۔'' بہت مشکل ہے کہ کوئی روح و جسم باہمی عمل کے بارے میں اس چونکا دینے والی وضاحت سے بڑھ کر کچھ کہہ سکے۔

ڈیس پریس جسم کی اس قدر ناپاکی کو موزوں طور پر ''روحانی صدمہ'' کہتا ہے۔ ان میں سے کچھ کو غلاظت کھانے پر مجبور کیا گیا اور انکار کی صورت میں ان کا سر جھکا دیا جاتا ہے جب تک وہ مان نہ جاتے: جب انھیں سر اٹھانے کی اجازت دی جاتی تو وہ علمی طور پر نادان ہو جاتے۔ ایک بچنے والے نے انسانی غلاظت کے اغراق کی بات یوں کی ''انتہا پسندی نے راستے بند کر دیے۔ انسانی اخلاق پر اس سے بد ترین حملہ ممکن دکھائی نہیں دیتا۔''

وہ عورتیں جن کے ساتھ جنسی زیادتی ہوتی ہے، کبھی کبھار ایک سے زیادہ لوگ بھی کرتے ہیں، ان میں گندگی کا تباہ کن احساس ہے جیسے کہ خودکشی کی کوشش۔ لارنس آف عرب کی کہانی کو یاد کریں، اس نے بھی خودکشی کرنے کے بارے میں سوچا جب اسے ایک مایوس اقلیتی مصری افسر نے بے حرمت کیا۔

میرے خیال میں ڈیس پریس اس حقیقت پر صحیح زور دیتا ہے کہ ناپاکی کا احساس جرم کے تصور کے تحت ہے، اور جسم کی صفائی روحانی تخلیص کے تصور کے تحت۔ جرم کی اخلاقی صفائی اور ناپاکی سے جسمانی پاکیزگی بائبل سے منعکس ہے جب کئی موقعوں پر خدا کی خدمت میں مصروف لوگوں کو رسمی صفائی کے لیے کہا گیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ماسوائے سماجی اسباب کے روح کی صفائی کے بغیر جسم کی صفائی غیر موثر ہے یہ مشاہدہ بالکل صحیح ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے جسم کی صفائی بھی روح کی صفائی کے بغیر غیر موثر ہے۔ انتہائی روحانی انسان جو اپنی جسمانی صفائی کا خیال نہیں رکھتا صرف نصف روحانی ہو سکتا ہے۔

لیکن اس قسم کے مقابل بیان پر غالباً یوں ہو گا، ''ہاں جسم کی روح جیسی اہمیت نہیں، کیا ایسا ہی ہے؟'' عبرانیوں 10:22 اس معاملے کو یوں پیش کرتا ہے: ''آؤ ہم دلوں کو برے ضمیر سے پاک کر کے اور بدن کو صاف پانی سے دھلوا کر سچے دل سے اور کامل ایمان کے

ساتھ قریب ہو جائیں (یعنی ہماری روحیں برّے کے خون میں دھل گئی) اور ہمارے جسم خالص پانی کے ساتھ۔'' جسم اور روح دونوں کی صفائی کامل ایمان کے لیے ضروری ہے، نہ کہ نصف ایمان کے لیے۔

فانی اجسام کیسے تباہ ہوتے ہیں؟

یہ ایک منفرد صورتحال ہے، یہ جسم کی اہمیت کا دوہرا احساس ہے۔ ہمارے پاس روح کے لیے ایک لڑھکتا ہوا گھر ہے، جس کے ساتھ روح کا گہرا تعلق ہے۔ اتنا گہرا کہ قبر میں جا کر ہی اسے علیحدگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قبر کا خوف ساری زندگی رہتا ہے حتیٰ کہ ان لوگوں کو بھی جو آسمان پر شاندار گھر کے مخصوص ہونے کی امید میں ہوتے ہیں۔

بلاشبہ بائبل اس گھر کی تباہی کا افسردہ منظر پیش کرتی ہے خصوصاً پولوس اس نکتے پر بہت مضبوط ہے اور اسے گناہ کا جسم اور فانی جسم کہتا ہے۔ اگر فنا انسان کی فطرت میں ہے تو وہ کافی حد تک بے خطر ہو سکتا ہے۔ جسم کو ابدیت کے لیے بنایا گیا، اس لیے اس کی فنا بے قاعدہ ہے کیونکہ یہ اس لیے نہیں بنایا گیا۔ جسم غیر طبعی حالت میں ہے، یعنی ایک مہلک مرض کی حالت میں جو کوڑے کے مساوی ہے۔ کلام خدا کے مطابق موت جسم کو چھوٹی حالت میں رکھتی ہے جیسے کہ کوڑھی اپنی زندگی میں رکھا جاتا ہے۔ زندہ لوگ نہ تو کسی کوڑھی کو چھوتے ہیں اور نہ ہی موت کو جب تک کہ وہ ناپاکی میں مبتلا نہ ہوں۔ ہمارا جسم اندر سے بیمار ہے اور کوڑھی کا جسم باہر سے اور ایسا اس لیے ہے کہ یہ غیر طبعی طور پر فانی ہے۔ درحقیقت یہ پہلے ہی سے مردہ ہے۔

رومیوں 7:24 میں جسم کو ''موت' کا جسم'' کہا گیا ہے۔ عبرانی میں اس اصطلاح کا مطلب ''مواد میں' اور یونانی میں 'تعمیر میں' ہے: اسے سادہ طور سے ایک ''مردہ جسم' کہا جائے گا۔ الفاظ کی اس قسم کی تبدیلی عبرانی زبان میں عام ہے، مثال کے طور زبور 48:1 میں ''اس کی تقدیس کا پہاڑ'' کو ''اس کا مقدس پہاڑ' کہنا زیادہ بہتر تھا۔ اسی طرح زبور 47:8 میں ہمیں ''اس کی تقدیس کے تخت' کو ''مقدس تخت' پڑھنا چاہیے اور ایوب 30:12 میں ''ان کے بربادی کے راستوں'' کو ''ان کے برباد راستے'' پڑھنا چاہیے۔ نئے عہدنامے میں افسیوں 6:10 ''اس کی قدرت کی قوت' یعنی ''اس کی قادر قوت' کلسیوں 1:22 میں، ''اس کے گوشت میں جسم کا مطلب ہے'' ''اس کے جسم کا گوشت' اگرچہ پولوس یونانی میں لکھتا ہے مگر عبرانی میں سوچتا ہے۔

جب رومیوں 7:24 میں پولوس اپنے مردہ جسم کا حوالہ دیتا ہے، جسے وہ چھوڑ دینے کی خواہش رکھتا ہے تو اس کے ذہن میں وہی صورتحال ہو گی جو رومی دنیا میں عام تھی۔ قاتل کی مخصوص سزا یہ تھی کہ مقتول کا جسم اس کے جسم کا ساتھ زنجیر سے باندھ دیا جاتا۔ اس جسم کو اسطرح منسلک کیا جاتا ہے کہ قاتل جہاں کہیں بھی جاتا وہ اس جسم کو اٹھانے یا گھسیٹنے پر مجبور ہوتا جب تک کہ یہ جسم گل سڑ کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاتا۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر یہ بات حیرانی کا باعث نہیں کہ پولوس جسم کو ایک حقیر چیز سمجھتا تھا۔

قاری یہ سمجھ سکتا ہے کہ پولوس کا جسم کسی نہ کسی طرح بیمار ہو گا مگر علماء اس بات پر ابھی تک متفق نہیں کیونکہ اس کی سوچ پر اس کے ذاتی تجربے کا رنگ تھا۔ اہم یہ ہے کہ اس بات کو سمجھا جائے کہ جب انسان مرتا ہے تو وہ غیر طبعی موت مرتا ہے یعنی ایک ایسی موت جسے وہ زندگی بھر جھیلتا رہا ہے۔ بہت سے لوگوں کو موت دیر سے آتی ہے، ان پر گلنے سڑنے کا عمل مخفی رکھا جاتا ہے اور وہ ابدیت کے دعوے پر قائم رہتے

ہیں ۔لیکن جونہی روح جدا ہوتی ہے یہ وہم جدا ہو جاتا ہے،البتہ جسم کی علیحدگی ایک تیز عمل ہے۔اگر کسی چیز کو دیکھ کر پریشانی مین مبتلا ہوتا ہے جیسے کے انسانی جسم کی تحلیل تو یہ بات مشکوک ہے۔یہ نظارہ انسان کو خوفناک حد تک پریشان کرتا ہے اگر چہ جانور بظاہر مکمل طور پر نہیں پر تقریباً مختلف ضرور ہیں۔

گرائے گئے آدم کے جسم میں جو ہم میں اترا اور نہ گرائے گئے آدم کے جسم میں جو خداوند یسوع مسیح میں اترا،جسم کی تباہی کا فاصلہ ہے۔خداوند یسوع مسیح کا جسم ایک ایسا جسم تھا جس نے تین دن دفن رہنے کے بعد بھی کوئی سڑاہٹ نہ دیکھی،اور اس نے کوئی بدعنوانی نہ دیکھی کیونکہ یہ کبھی موت کے بیج سے بنایا ہی نہیں گیا۔البتہ ہماری موت ہمیشہ اس طرح سے ہوتی ہے۔

یہ تشدد کا عمل ہے اور دو اجزا یعنی جسم اور روح کی علیحدگی ہے جنہوں نے کبھی الگ ہونے کا ارادہ نہیں کیا۔لیکن خدا کی اقتصادیات میں یہ بات اہم تھی کہ جسم کو تباہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ گری ہوئی فطرت کا ساتھی تھا اور صرف علیحدگی سے اور مکمل طور پر نئی شکل میں جی اٹھنے سے ہی انسان کو اس کے گناہ سے نجات مل سکتی تھی۔انسان کی روح کو محض نئی تشکیل نہیں دی جاتی بلکہ نئے سرے سے تخلیق کیا جاتا ہے۔اسی طرح انسان کا جسم بھی محض نئے سرے سے تشکیل نہیں دیا جاتا۔ہم ایک تباہ ہوتے ہوئے گھر (جسم) میں رہتے ہیں جو کہ قبر میں ٹوٹ پھوٹ جائے گا اور اسے پھر سے اکٹھا نہیں کیا جائے گا۔اسے پرانے مواد سے نہیں تشکیل دیا جائے گا، بلکہ ایک نئے سرے میں تشکیل دیا جائے گا جو اتنا ہی شاندار ہوگا جتنا خداوند یسوع مسیح کا جی اٹھنے کے بعد (فلپیوں 3:21)۔

تھامس بوسٹن نے (1720) میں اس معاملے کو انتہائی خوبصورتی سے بیان کیا: ''جسم میں ایک خباثت ہوتی ہے، جو مقدسین میں بھی ہے اور اسے اس وقت تک دور نہیں کیا جا سکتا جب تک جسم قبر میں گل نہیں جائے اور نئی زندگی میں ایک نیا جسم اور ایک نئی شکل نہ مل جائے۔

دو انسان آدم کہلائے: ماہرین ارتقاء کے لیے ایک مسئلہ

انسان کھنڈرات کے گھر میں رہتا ہے، یہ ایک ایسا جسم ہے جو ارتقائی عمل کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ دونوں افراد میں جسمانی شان اور ابدیت کی قابلیت کو پیش کرتا ہے۔دونوں افراد آدم کہلائے۔

نظریہ ارتقاء ہمیں کوئی اشارہ نہیں دیتا کہ وہ منظر میں کیسے نمودار ہوئے۔اگر پہلے آدم کو ارتقائی عمل کا نتیجہ مان لیا جائے تو دوسرا آدم جو انسانی سلسلے میں بہت دیر بعد آیا، ارتقائی عمل کا حصہ ثابت نہیں ہوتا۔ہمارے پاس بائبل کا جواب ہے جو بلا ابہام بیان کرتی ہے کہ پہلے آدم کی بنیاد ہی تخلیق سے ہے اور دوسرا آدم ایک کنواری کے جسم میں ایک الٰہی معجزے سے اترا اگر چہ وہ قدرتی عمل سے پیدا ہوا۔

☆☆☆

عالیشان گھر

لازوال آدم ثانی

گھر جو خداوند کے لیے بنایا جائے شاندار ہونا چاہیے۔ ا تواریخ 22:5

بائبل یہ بات واضح طور پر بیان کرتی ہے کہ آدم کی نسل سے آنے والے سب لوگ خدا کی شکل پر نہیں بلکہ آدم کی شکل میں پیدا ہوئے۔لیکن بائبل ایک اور پر زور بیان دیتی ہے کہ صدیوں بعد ایک ایسا شخص پیدا ہوا، ''جو خدا کی شکل میں تھا۔'' اس کا جواب ہم کیسے دے سکتے ہیں۔کینٹر بری انگلینڈ کے این سیلم (1033-1109) نے شاندار کتاب لکھی جس کا نام لاطینی میں "Cur Deus Homo" (خدا انسان کیوں بنا) رکھا۔ایک جگہ ایک دوست سے بات چیت کرتے ہوئے اس نے کہا کہ نجات دہندہ انسان کیوں بن سکتا ہے:

> خدا چار طرح سے انسان کو پیدا کر سکتا ہے: عام طریقے سے یعنی مرد و عورت سے، یا مرد سے یا عورت سے، جیسے اس نے آدم تخلیق کیا، یا ایک انسان سے جیسے اس نے حوا کو تخلیق کیا، یا ایک عورت سے انسان کے بغیر جو اس نے کبھی نہیں کیا۔ یہ دکھانے کے لیے کہ ایسا کرنا بھی اس کے بس میں ہے اس اس طریقے کو مخصوص رکھا اور اس شخص کو ایک عورت سے مرد کے بغیر پیدا کیا جو انسان کا خدائی نجات دہندہ ہے۔

یہ مجھے منطقی تعمیر کی حیران کن مشق اور انگلش زبان کا موثر استعمال لگتا ہے۔پھر بھی مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ واقع کنواری سے پیدا ہونے کو سمجھ سکا ہو۔آج ہمارے لیے اس بات کو سمجھنا زیادہ آسان ہے کیونکہ ہم ان کے کندھوں پہ کھڑے ہیں جو ہم سے پہلے گزر گئے۔

نجات دہندہ کی کنواری سے پیدائش کی ضرورت

''عورت کی نسل'' نامی ایک کتاب میں، ہم پیدائش کے بارے میں این سیلم سے لیکر اب تک بہت کچھ سیکھ چکے ہیں۔مَیں نے خاص طور سے ایک لڑکے کی پیدائش کے بارے میں جو ایک کنواری سے بنا مرد کے پیدا ہوا، کافی کچھ لکھا ہے۔جینیاتی نظریات سے یہ بات ناممکن ہے۔اگر چہ یسعیاہ 7:14 میں پیش گوئی کی گئی ہے کہ نجات دہندہ کس طرح ہمارے درمیان آئے گا۔''دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور ایک بیٹا جنے گی'' بے شک یہ ایک معجزہ تھا۔میں نے اس لحاظ سے بحث کی ہے کہ عورت کی نسل کو ممنوعہ پھل کے فانی اثرات سے محفوظ رکھنا کیسے ممکن تھا اور کیوں ضروری تھا۔

ممنوعہ پھل کا اثر آدم اور حوا کے اجسام میں ایک جیسا تھا کیونکہ دونوں کی منزل اب موت بن گئی۔لیکن ان کی نسل پر یہ اثر مختلف تھا: آدم کی نسل فانی ہو چکی تھی لیکن حوا کی نسل میں ایسا نہ تھا۔

اس کے جسم کی مخصوص ساخت کی بنا پر اسکا بیج (نسل) فانی جسم میں موجود ہونے کے باوجود فنا سے محفوظ تھا۔اس کی ساخت اس قابل تھی کہ وہ ایک حقیقی ابدی زندگی کو جنم دینے کی صلاحیت کو آئندہ آنے والی سب عورتوں میں منتقل کر دے، اور یہ ابدیت کا دھارا

نسل در نسل چلتا رہے اور چلتا رہے گا۔ اب یہ بات واضح ہوگئی کہ عورت کا بیج مرد کے بیج سے مدغم ہونے سے پہلے انسانی جسم کا ایک حقیقی ابدی حصہ ہے جو کہ زوال سے محفوظ رہا۔ اگر چہ انسانی جسم، نر اور مادہ دونوں میں تمام تر خلیات کے زوال پر مہلک اثر ہوا ۔لیکن عورت کا بیج انسان کا انمول ورثہ ہے جو محفوظ رہا۔

اس طرح کنواری سے پیدا ہوا کوئی بھی بچہ زوال کے جسمانی اثرات سے محفوظ رہے گا، کیونکہ نقصان مردانہ بیج کے ذریعے سے منتقل ہوتا ہے۔ اگر کنواری سے پیدائش طبعی ہو تو ایسے بچے میں ہمیشہ دو خصائل ہوں گے۔ اس میں نہ ختم والی جسمانی زندگی کی صلاحیت ہوگی جیسا کہ بنیادی طور آدم اور حوا میں تھی ۔لیکن ساتھ ساتھ اس بچے کو مرد نہیں بلکہ عورت ہونا ضروری ہوگا۔ یسعیاہ 7:14 میں جس حقیقت کی پیش گوئی کی گئی ہے، یسعیاہ خود سے کبھی بھی نہ جان پاتا لیکن اس نے وحی سے جانا کہ ایک لڑکا ایک کنواری سے پیدا ہوگا۔ یہ صرف ایک معجزہ ہی ہوسکتا تھا۔

جب ہم ایک کنواری کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد کوئی کم سن عورت نہیں، انگلش میں بلا شبہ یہ صحیح ترجمہ ہے متی 1:22,23 میں یسعیاہ کی اس آیت میں یہودیوں کے لیے ایک یونانی لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب بھی یہی ہے۔ جب ہم پہچان جاتے ہیں کہ دونوں بیانات کا مصنف ایک ہی ہے یعنی پاک روح تو ہمیں مصنف کے ارادے کا پتا چل جاتا ہے۔ پہلے حوالے میں جس بات کو یسعیاہ نے واضح کیا دوسرے حوالے یعنی متی میں اس کے لیے یونانی لفظ (Parthenas) استعمال ہوا۔

پرانے عہدنامے سے یہ بات واضح ہے کہ حمل کے وقت سے ہی بچہ آلودہ ہو جاتا ہے۔ ''دیکھ میں نے خطا کی حالت میں صورت پکڑی اور گناہ کی حالت میں اپنے بطن میں پڑا۔'' (زبور 51:5)

داؤد کے زبور لکھنے سے بہت پہلے ایوب نے انتہائی واضح طور پر لکھا، وہ پوچھتا ہے ''کون ہے جو ناپاک سے پاک چیز نکالے؟'' اور اپنے سوال کا وہ خود ہی جواب دیتا ہے ''کوئی نہیں (ایوب 14:4)۔'' بعد میں جب وہ اپنے دوستوں سے بحث کرتا ہے تو بلدد اس سے بڑی چالاکی سے پوچھتا ہے ''پس خدا کے حضور انسان کس طرح صادق اور زن زاد کس طرح پاک ٹھہرے؟'' (ایوب 25:4) بہت بعد میں یسعیاہ اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے، ''ہم سب ناپاک ہیں'' (یسعیاہ 64:60)۔

اس آیت کی روشنی میں اگر انسان اپنے لئے کوئی نجات دہندہ ڈھونڈ بھی لے تو عورت سے پیدا ہونے کے ناطے کیا وہ نجات دہندہ خود قابل شفاعت ہوگا؟ کیا یسعیاہ 7:14 میں اپنے ہی الفاظ کو سمجھتا ہے؟ کیا وہ سمجھتا ہے کیوں نجات دہندہ کا کنواری سے پیدا ہونا ضروری ہے؟ شاید وہ ان میں سے ایک ہے جن کے بارے میں پطرس ذکر کرتا ہے ''وہ جن چیزوں سے متاثر ہوتے ہیں ان پر لکھنے کے لیے غور کرتے ہیں پھر بھی نہ وہ انھیں پوری طرح سے سمجھ پاتے ہیں اور نہ لکھ پاتے ہیں۔''

اس باب میں ہونے والی بات کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ اس کتاب کو سمجھا جا سکے۔ چونکہ ہمارا ارادہ ہے کہ ابواب کو مختصر رکھا جائے، پھر بھی یہ بات اہم ہے کہ جس باب میں جو مسئلہ بیان کیا جاتا ہے اسے واضح طور پر بیان کیا جائے۔ اگر چہ اس کو پڑھنے میں دشواری ہوگی پھر بھی اس باب کو مکمل کرنے کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس بحث کا ڈھانچہ مرتب کرلیا جائے۔

خدا نے کنواری سے پیدائش کا منصوبہ کیسے بنایا؟

اب نجات دہندہ ہم میں سے ہونا چاہیے، عورت سے پیدا ہونا چاہیے اور مقدس بھی یعنی غیر فانی ہونا چاہیے۔ یہاں ہم خداوند کے بدن کی لاثانی فطرت پر بات کریں گے، اور خدا نے ان سب خصائل کی موجودگی کا یقین بھی دلایا ہے۔ میرا مقصد تین بنیادی نکات کی وضاحت کرنا ہے، اور میں دکھاؤں گا کہ کلام مقدس کیسے ان کی تصدیق کرتا ہے۔

۱۔ خدا کا انسان بننا ابتدا ہی سے الٰہی ترتیب میں رکھا گیا تھا۔ اس عظیم منصوبے میں طریقہ تولید شامل تھا جس میں دو طرح کے بیج آپس میں ملاپ کرتے ہیں اور ایک ہی جسم میں نشوونما پا کر نر یا مادہ جسم بن جاتے ہیں۔

۲۔ آدم کی نافرمانی فنا کا باعث تھی اس لیے پاک روح کی مدد سے ایک کنواری سے سے پیدائش ہوئی۔

۳۔ کنواری سے پیدائش آدم کے حقیقی بدن کی صحت یابی تھی یعنی اس کے جسم کی وہ ابتدائی حالت میں وہ تخلیق کیا گیا۔

۱۔ میکانکی تصور کا نمونہ

بہت سال پہلے چارلس اگسٹس برگز نے یہ مشاہدہ کیا:

خداوند یسوع مسیح کی کنواری سے پیدائش قوانین قدرت کے خلاف ایک معجزہ ہے تو اس کی وضاحت نہیں ہوتی۔ یسوع مسیح کا کنواری مریم کے پیٹ میں نمو پانا دوسری سب ماؤں کے بچوں سے مختلف ہے کیونکہ اس کا کوئی انسانی باپ نہیں ہے۔ ایک غیر معمولی اور غیر منکشف طریقے سے قوانین زچگی کی مخالفت کے بغیر خدا نے کنواری مریم کو مقدس بیج سے حاملہ کیا اور یسوع مسیح کے باپ کی جگہ لے لی۔

خدا جب نجات دہندہ کو اس دنیا میں لایا تو اس معاملے کو مختلف رکھتے ہوئے بھی قدرتی ترتیب کے طریقے میں حائل نہیں ہوا۔ مگر اس نے اس قدرتی ترتیب کو ایک اعلیٰ ترتیب دیتے ہوئے پہلے مقام پر رکھا۔ اس نے اس عمل اور پیدائش کو اس طرح مرتب کیا کہ اپنی تخلیق کی خلاف ورزی کیے بغیر اس طریقہ کار کو استعمال کیا۔

اسے فطرت کو ایک طرف رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ سب اجسام گناہ سے آلودہ تھے اور سوائے اس کے ایسا کوئی جسم نہ تھا جسے خدا نے اپنے لیے چنتا۔ خدا حمل سے لیکر موت تک روزمرہ زندگی کے تمام تر حالات اور مقابلہ جات کے لیے انسانی جسم کو رہائش کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ انسای تاریخ میں ایک اعلیٰ جسم نمودار ہوا جو گناہ سے پاک اور خود خدا کے رہنے کی جگہ تھی۔ اور جس کا یہ گھر تھا لوگوں نے اس کی بلا ارادہ، بلا شرم اور بلا ہچکچاہٹ پرستش کی، اگر وہ مقدس تھا تو قبول کیا اور اگر نہیں تھا تو رد کیا۔

سب سے پہلا انسانی جسم خصوصی طور پر اس طرح بنایا گیا کہ دوسرا شاندار جسم (یسوع مسیح) طبعی طریقے میں بلا انتشار نمودار ہو سکے۔ اور اس انسانی جسم نے کسی طور الٰہیت کو خوار نہ کیا۔

۲۔ کنواری کے حمل کا منصوبہ

کنواری سے پیدائش پرانے عہد نامے کے سوالات کا جواب تھا۔ اب ہم دیکھ سکتے ہیں کہ عورت میں اولاد کا بیج، زہر

کے اس دھارے سے جو مرد کے ذریعے منتقل ہوتا ہے اور نسل در نسل طبعی طور پر پیدا ہونے والے سب لوگوں میں منتقل ہو جاتا ہے ، کیسے محفوظ رہا۔ اندرونی علم کی اس دریافت کے لیے ہم اگسٹ ویزمین کے ممنون ہیں جس کی بصارت کی کمی نے اس کو مائیکرو سکوپ اور لیبارٹری چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا ۔ اور پھر اس نے اپنے آئندہ کام کے اوقات اپنے گزشتہ مشاہدات پر ہی گزارے۔

اسکے بعد آنے والوں نے اس کے بنیادی نظریے کی واضح طور پر تصدیق کر دی کہ ہر نسل میں یہ مادہ بیج ہی ہوتا ہے جو پہلے خود پیدا ہوتا ہے اور پھر اس جسم کو تشکیل دیتا ہے جو اس میں رہنے والا ہوتا ہے ۔ مناسب فہم کے لیے اس ترتیب کو سمجھنا بہت اہم ہے ۔ متواتر اجسام عارضی ذرائع ہیں جنہیں موت ایک طرف رکھ دیتی ہے ، لیکن تب تک ایسا نہیں ہوتا جب تک بیج آئندہ نسل میں خود بخود پیدا نہیں ہوتا جاتا اور ماندہ نسل کو دہرا نہیں لیتا ۔ جسم اووم (بیضہ) کو ہمیشہ زندہ رکھتا ہے ۔

اگر ہم اس عمل کو حوا تک لے جائیں ، تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ حوا نے اپنا بیج آدم سے وصول کیا۔ اس طرح بیج کی نسل در نسل منتقلی کا تسلسل بن گیا ، جو ہزاروں سال بعد بھی قائم ہے ۔ یہ ''لاقانونیت' کبھی آدم کے سبب سے ہی تھی ۔ اب ہر نسل میں فنا عورت کے لافانی بیج میں مرد کے ذریعے منتقل ہوتی ہے ۔ جیسے لوتھر اور کیلون حامل ہوئیں ۔ لیکن یہ مہلک زہر تب تک نہیں پھیلتا جب تک عورت کا بیج خود بخود تعداد میں نہیں بڑھتا۔ پھر یہ بیج خود کے گرد ایک جسم بھی بنا لیتا ہے جو اگلی نسل کا گھر ہوتا ہے ۔ یہ عمل شکل 11.1 میں دکھایا گیا۔ اس طرح جہاں حوا تمام زندوں کی ماں بن جاتی ہے (پیدائش 3:20) وہاں آدم تمام مرنے والوں کا باپ ہے (رومیوں 5:12) اس کو آیت 12 واضح طور پر بیان کرتی ہے ''موت ایک انسان سے تمام انسانوں میں منتقل ہوگئی'' جونہی انسان کا بیج عورت کے بیج سے ملاپ کرتا ہے اُسی لمحے لافانی فانی ہو جاتا ہے ۔

پھر ایک دن الٰہی مداخلت سے پاک روح نے کنواری مریم میں ایک بیج متعارف کروایا جو نشوونما پا کر ایک لڑکا بن گیا ۔ تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ عورت کے حمل میں ایک مقدس چیز تھی ۔

لوقا 1:35 ہمیں بتاتا ہے کہ فرشتے نے مریم سے کہا: ''وہ قدوس جو تجھ سے پیدا ہوگا خدا کا بیٹا کہلائے گا۔'' لفظ مقدس یونانی متن کے لحاظ سے موزوں ترین ہے ۔ ایک بار پھر فرشتے نے متی کی اس بات کی تصدیق کی '' کیونکہ جو اس کے اندر پیدا کیا گیا ہے روح القدس سے ہے ۔'' (متی 1:20) ایک بار پھر پر زور الفاظ حقیقی یونانی سے ہی تھے ۔

جب مریم کا وقت پورا ہوا ، تو اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا اور فرشتوں نے کھیتوں میں چرواہوں کو اعلان کیا ، '' آج داؤد کے شہر میں تمہارے لیے ایک منجی پیدا ہوا ، وہ مسیح خداوند ہے (لوقا 2:11)''۔

اس دن جلال کا خداوند ، خدا کا فرزند جسم بن گیا اور اس نے ہمارے درمیان ابن آدم بن کر رہنا شروع کر دیا اس کا جسم عورت کے بیج سے بنا تھا ایک ایسا جسم جو حقیقتاً لافانی تھا۔ کیونکہ اس کا حمل پاک روح سے تھا نہ کہ مردانہ سپرمز سے ، جو جسم میں فنا لاتے ہیں ۔ اس واقعے کو آسمان پر باپ نے بھی تصدیق کیا ، جب یہ اعلان کیا گیا ، ''تو میرا بیٹا ہے تو آج ہی مجھ سے پیدا ہوا (عبرانیوں 1:5 اور 5:5)'' نئے بین الاقوامی ترجمے نے اسے یوں لکھا ، ''تم میرے بیٹے ہو ، آج مَیں تمہارا باپ بن گیا''۔

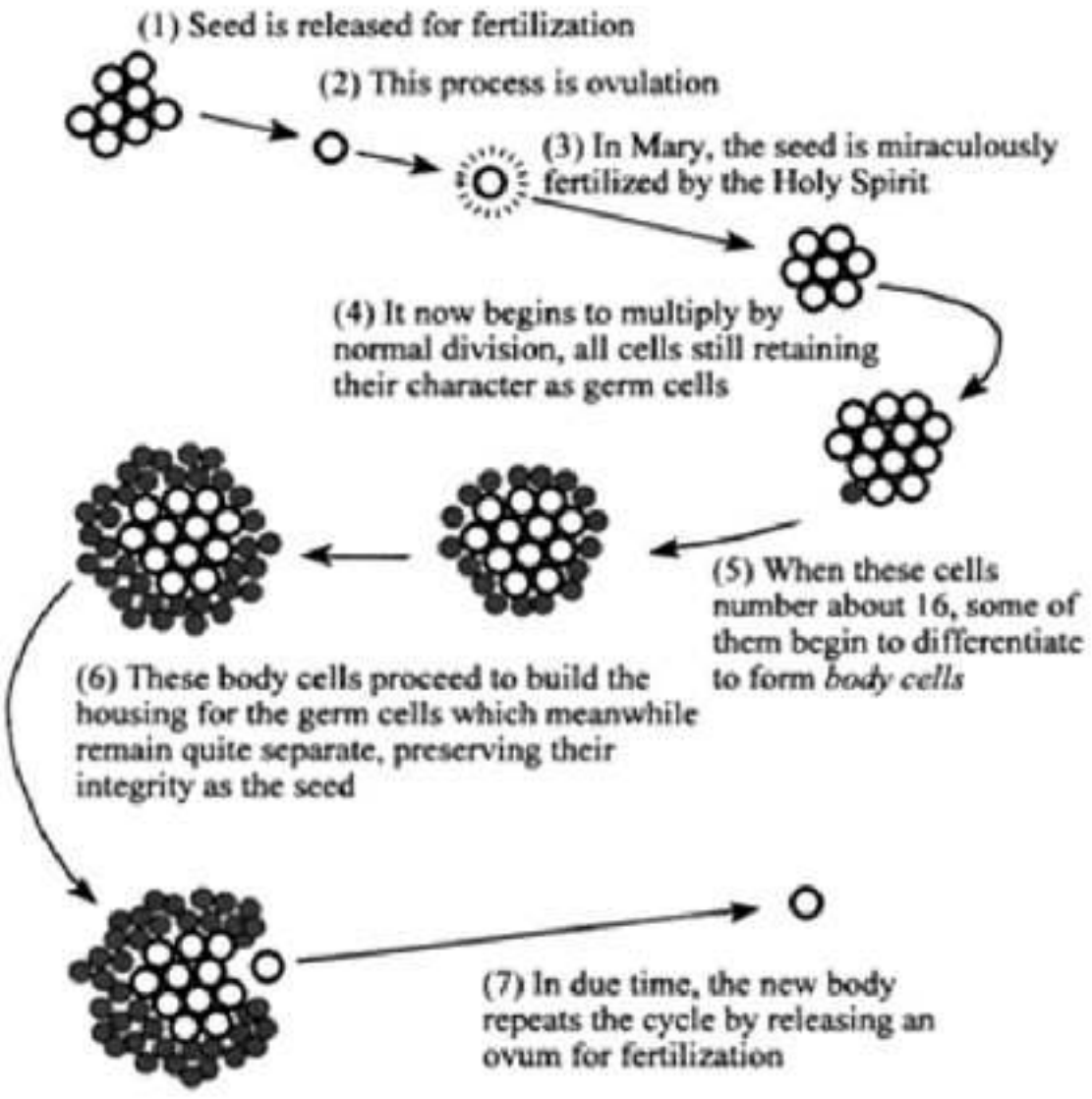

شکل نمبر 11.1

ایک ترکیبی شکل جو بیج یا جرثومے کے آدم سے حوا، حوا سے مریم اور نسل سے نسل تک کے تسلسل کی وضاحت کرتی ہے۔ یہ شکل دراصل دو چیزیں دکھاتی ہے۔ پہلی یہ کہ کیسے عورت کا بیج ایک بار آدم میں تشکیل پا کر اس جسم کی بنیاد بنا جسے خداوند کے لیے تیار کیا گیا۔ دوسری بات جو اس شکل سے ظاہر ہوتی وہ نظریہ ارتقاء واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ یہ بیج ہے جو جسم کو تشکیل دیتا ہے نہ کہ جسم بیج کو۔

۳۔آدم کے حقیقی جسم کی صحت یابی کا منصوبہ

اس لیے وہ دنیا میں آئے ہوئے کہتا ہے...تم نے میرے لیے ایک جسم تیار کیا (عبرانیوں 10:5) اس آیت میں، ''تیار کیا' کے لئے جو یونانی لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ اس متن میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ بنیادی طور پر اس کا مطلب صرف تیار کرنا نہیں بلکہ بحال کرنا، منظم کرنا اور مرمت کرنا ہے۔ جال کی مرمت کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یونانی لفظ (Papyri) یہاں پر مکمل تیاری کے لیے استعمال ہوا ہے۔ قدیم یونانی زبان میں اس کا مطلب مکمل طور پر سجانا ہے۔ کنگ جیمز کے ترجمے میں بھی اس کا مطلب تکمیل ہے۔

عبرانیوں 10:5 میں یہ حقیقت نظر آتی ہے کہ اس جسم نے نوع آدم میں کاملیت کو بحال کیا اور اب تک پیدا ہونے والے سب لوگوں میں گندگی کو صفائی میں بدل دیا۔ اس کا جسم اپنے جنین ہی سے بے عیب اور مقدس تھا اور اس طرح وہ مسئلہ حل ہو گیا جو زبور 51:5 اور ایوب 14:4 میں اٹھایا گیا۔ ہم بلاہچکچاہٹ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کنواری کے حمل سے ایک لاثانی انسانی جسم پیدا ہوا: اصل میں یہ آدم ہی کی نسل تھی کیونکہ ایک وقت میں عورت کا بیج بھی آدم کا بیج ہی تھا۔ لیکن آدم کے زوال سے جو ماندہ نسل میں منتقل ہوا محفوظ تھا۔ اس طرح ایک کامل انسانی جسم سامنے آیا جس میں ابدیت کی وہی صلاحیت تھی جو آدم کا جسم تخلیق کرتے ہوئے اس میں تھی۔

خداوند یسوع مسیح کا جسم ہمارے جسموں کی طرح نہ تو زوال شدہ تھا اور نہ ہی موت کا سزا یافتہ اس کی بجائے ''اس میں غیر اختتام پذیر زندگی کی صلاحیت تھی (عبرانیوں 7:16)۔'' یہ آدم ثانی تھا جو آدم اول کے جسم کی حیاتیاتی خصوصیات کو پورا کر دیا تھا۔ آگسٹن نے اس جسم کو ایسا قرار دیا جس پر خدا قابض تھا، یہ ایک ایسا جسم تھا جسے جسمانی دنیا کے انسان حملے کر کے مجروح کر سکتے تھے لیکن وہ مرنے کو قابل نہ تھا کیونکہ اس کے جسم میں کوئی فانی عمل یا موت متعارف نہیں کروائی گئی تھی۔

اس کے لیے موت کی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے برعکس اس کا جسم بنا بدعنوان کیے اٹھالیا گیا۔ اسے کسی تبدیلی کی ضرورت نہ تھی کہ وہ کسی نئے اصول کے تحت اپنا آسمانی کردار ادا کر سکے۔ جبکہ ہمیں موت تبدیل کر دیتی ہے مگر وہ لوگ جیتے رہیں گے جو خداوند کی آمد ثانی کے وقت زندہ ہوں گے۔ پھر بھی ان کے اجسام میں بھی کچھ تبدیلی کی جائے گی کہ وہ آسمان کے لیے موزوں ہو جائیں۔

کلام خدا کے الفاظ اس اختلاف کی تصدیق کرتے ہیں

نئے عہدنامے نے کنواری سے پیدا ہوئے جسم اور دیگر سب انسانوں کے اجسام کے درمیان فرق پر دو مختلف مگر اہم اطوار سے روشنی ڈالی ہے۔ ہمارے اور خداوند یسوع مسیح کے جسم میں واضح فرق کو نئے عہدنامے میں مَیں یوں واضح کروں گا، یعنی اس کی ترغیبات اور ہماری، اسکی موت اور ہماری اور اسی طرح باقی سب چیزیں بھی۔ ان اختلافات میں زیادہ تر انگلش تراجم میں دھندلاپ ہے۔ حقیقی یونانی میں دو مختلف الفاظ کو احتیاط سے استعمال کیا گیا ہے، ان میں سے کچھ الفاظ (i) کے سابقے کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے جسے یونانی زبان میں iota کہتے ہیں، جبکہ دوسرے الفاظ میں یہ سابقے کے ساتھ استعمال نہیں ہوئے۔ الفاظ کے پہلے گروپ میں Homoi استعمال ہوا جبکہ دوسرے میں Homo استعمال ہوا ہے۔ Homoi کا مطلب مشابہت اور homo کا مطلب شناخت ہے۔

لیکن اگر میں کہنا چاہوں کی مارجرین، مکھن جیسا ہو سکتا ہے تو یونانی زبان میں انگلش لفظ like کے لیے میں

Homoi استعمال کروں گا۔ یہ حقیقتاً مکھن نہیں ہے۔

انگلش میں homo کے سابقے سے بہت سے الفاظ ہیں جیسے کہ ہومولوجی (ویسی ہی ساخت)، ہوموجینیس (ویسی ہی حفاظت)، ہوموسیکشوئل (ویسی ہی جنس)، ہوموینم (ویسا ہی نام)، ہوموزائیگوٹ (ویسی ہی چیز) وغیرہ۔ لفظ ہومو (homo) سے ہمیں محض مشابہت کا ہی نہیں بلکہ واضح شناخت کا تصور بھی ملتا ہے۔

دوسری طرف ہم homoi کے سابقے کے ساتھ انگلش میں زیادہ تر لفظ استعمال نہیں کرتے اس کی وجہ بتانا مشکل ہے، یونانی الفاظ کے استعمال میں نئے اور پرانے دونوں عہدناموں میں تضاد ہے یونانی زبان میں لفظ homoi واضح شناخت کے لیے نہیں بلکہ زیادہ تر محض مشابہت کے لیے استعمال ہوا ہے۔

نئے عہدنامے میں homo یا homoi کیساتھ استعمال ہونے والے لفظ مترجم سے یہ پوچھتے ہیں کہ ان کا مطلب مکمل شناخت ہے یا محض مشابہت۔ ان الفاظ کے متضاد استعمال کے لیے کلام میں خاصی احتیاط برتی گئی ہے۔ تضاد ہمیشہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے لیکن بد قسمتی سے بہت سے اہم تراجم بھی اس سلسلے میں ناکام ہوگئے ہیں۔ انھوں نے ان الفاظ کی جگہ مانند ہونا (like) اور مشابہت (likness) کو استعمال کیا ہے۔ انھوں نے کلام خدا کیا الٰہی صنف کے استعمال کردہ بنیادی تضاد کو نظر انداز کیا ہے۔

مجھے نئے عہدنامے کے ان عام پیروں سے خصوصی وضاحتیں کرنے دیں جن میں لفظی اختلافات ترجمے میں پوشیدہ مگر انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔

(1) Homoi: رومیوں 8:3 میں ہمارے پاس یہ الفاظ ہیں، ''خدا نے اپنے بیٹے کو گنہگار بشر کی صورت میں بھیجا۔'' یونانی میں [کی صورت میں (likness)] کے لیے لفظ Homoi-omati استعمال ہوا ہے اور اس کا صحیح ترجمہ یہی ہے یاد رہے کہ سابقہ Homoi ہے یعنی i بھی اسی سابقے کا حصہ ہے۔ ایسے تمام الفاظ شناخت کو نہیں مشابہت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی خداوند کا جسم ہمارے جیسا تھا ہماری طرح نہیں۔ اس کا جسم آدم کی نسل کے زوال شدہ لوگوں جیسا نہیں بلکہ غیر زوال شدہ آدم جیسا تھا۔ اس کا جسم بدعنوان نہیں تھا جب کہ ہمارے اجسام ہیں۔

عبرانیوں 2:17 میں ہمارے پاس یہ الفاظ ہیں، ''وہ ہر بات میں اپنے بھائیوں کی مانند بنے۔'' کیا وہ اپنے بھائیوں جیسا تھا؟ ہماری طرح اس کا جسم بھی فانی تھا؟ اور کیا وہ بھی ہماری طرح موت کی سزا کے ماتحت ہوگا؟ پہلے سے موت کے سزا یافتہ جسم کی قربانی نا معقول ہوسکتی ہے، قائم مقام نہیں۔ عبرانیوں 4:15 میں، ''گناہ کے سوا وہ سب باتوں میں ہماری طرح آزمایا گیا۔'' حقیقت یہ ہے کہ جب شیطان ہمیں آزمانے آتا ہے تو وہ ایک ایسے قلعہ مین آتا ہے جسے وہ پہلے ہی فتح کر چکا ہے۔

گناہ کی جڑ وہاں پہلے سے اُگ چکی ہے، شیطان تو صرف راز دار تلاش کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ جب شیطان یسوع کو آزمانے آیا، تو اُسے اُس میں ایسا کچھ نہ ملا جسے وہ پکڑ سکے اور اس سے کام لے سکے۔ ہمیں شیطان نے ہمارے اندر رہ کر آزمایا اور خداوند کو باہر سے۔ بلاشبہ ہمین شیطان کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ ہمیں ترغیب دے اس کے لیے ہماری گنہگار فطرت ہی کافی ہے۔ شیطان خداوند کو

کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ اسی وجہ سے آزمائے آیا۔ خداوند کی ترغیبات ہماری نسبت بہت کم تھیں، مگر کبھی بھی اندر سے نہیں اٹھیں۔

رومیوں 6:5 میں، ''ہم اسکی موت کی مشابہت سے اس کے ساتھ پیوستہ ہو گئے۔'' اُسکی اور ہماری موت بالکل مختلف ہے، مرنا اس کے لیے ضروری نہ تھا مگر وہ ہمارے گناہوں کے لیے مرا۔ جب ہم خداوند میں مرتے ہیں تو ہم اپنے گناہوں کی وجہ سے مرتے ہیں، ہماری موت کا متبادل عنصر کلی طور کچھ اور نہیں ہے۔ فلپیوں 2:7 میں ہم پڑھتے ہیں، ''...انسانوں کا مشابہہ ہو گیا۔''

ان اہم پیروں سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ کیا وہ ہماری طرح مردانہ بیج کے فانی عنصر سے گناہ کی حالت میں حمل میں آیا اور پیدا ہوا؟ اس کے نتائج انسانیت کے لیے اور بلاشبہ کائنات کے لیے تباہ کن ہونگے۔ انسانی تخلیق کا تجربہ نجات دہندہ کے بغیر بے معنی ثابت ہو سکتا تھا اگر وہ ہماری طرح سے ہی پیدا ہوا ہوتا تو وہ کبھی ہمارا نجات دہندہ نہیں ہو سکتا تھا۔

(2)Homo: الفاظ کے دوسرے گروپ کا سابقہ homo ہے جو i پر ختم نہیں ہوتا۔ ایسے کوئی 46 حوالے ہیں جہاں پر ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جبکہ ان سے ''ایک جیسا ہونا'' یا ''ایک طرح ہونا'' واضح نہیں ہوتا۔

قدیم یونانی ادب میں Homo اور Homoi کے درمیان فرق کو اسموں اور فعلوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے لیکن نئے عہد ناموں میں ایسا نہیں ہے۔

325 عیسوی میں نائیسیا کے مسیحی عقیدے (Nicene Creed) کے لوگوں میں Homo اور Homoi کے سابقوں پر ایک اہم اور تاریخی بحث ہوئی، ایک گروہ نے خداوند یسوع مسیح کو ''باپ جیسا'' (Homo-Ousios) اور دوسرے گروہ نے ''باپ کی طرح'' (Homoi-Ousios) کہا۔ اسی بات پر مشرقی اور مغربی کلیسیاؤں میں اختلاف پڑ گیا، کسی ایک حرف کی موجودگی پر مسیحیوں کا دوسروں میں بٹ جانا احمقانہ لگتا ہے۔ لیکن حقیقتاً یہ مشابہت اور کامل مساوات پر دو تصورات تھے۔

اس ''i'' کو یونانی میں iota اور عبرانی میں jot کہا جاتا ہے، دونوں لفظ ہم جنس ہیں۔ خداوند کا یہ کہنا بھی اہم ہے کہ، ''کلام کا کوئی حصہ حتیٰ کہ ایک نقطہ بھی نہ ملے گا جب تک کہ سب کچھ پورا نہ ہو جائے۔'' (متی 5:18)

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ خداوند یسوع کو گنہگار بشر کی صورت پر پیدا کیا گیا، یا اسے انسانوں کی مانند بنایا گیا، یا اسکے بھائیوں کے مانند بنایا گیا، تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ مشابہت صرف مشابہت ہے، کامل مشابہت نہیں۔ ہماری طرح ہونا اسے ہماری طرح موت کی سزا کے ماتحت کر دیتا ہے۔

''جسم کی ضعیفی'' اور ''کمزوری'' کے معانی

خداوند کا جسم ہمارے جیسا اس لیے تھا کہ وہ ہماری طرح قابل مجروح تھا۔ اُس کے جسم پر ہماری طرح زخم لگ سکتے تھے۔ وہ ہماری طرح تھکن، بھوک، پیاس، درد اور زخموں میں مبتلا ہوا۔ یہ سب چیزیں کسی بھی جسم کے لیے قدرتی ہیں خواہ وہ جسمانی ہو یا حیوانی۔ یہ سب آگسٹن کی کہاوت کے پہلے حصے کے تحت ہے: وہ موت کا تجزیہ کر سکتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ بالکل ہماری طرح تھا۔ 2 کرنتھیوں 13:4 میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ اسے کمزوری کی حالت میں مصلوب کیا گیا۔ یہ کمزوری گناہ کے سبب نہیں بلکہ جسم کے مجروح ہو جانے کی وجہ

سے تھی کیونکہ یہ غیر زوال شدہ آدم کا جسم تھا۔ یہ گناہ کی علامت نہیں تھی وہ ہمارے حد سے گزر جانے کی وجہ سے زخمی کیا گیا،، ایمبروز نے آگسٹن کے زیر اثر یوں لکھا:

''خدا نے اس یسوع کو جسے تم نے صلیب دی خداوند بھی ٹھہرایا اور مسیح بھی (رسولوں کے اعمال 2:36)۔''

خدا کے سربراہ کو نہیں بلکہ ایک جسم کو مصلوب کیا گیا تھا۔ بلاشبہ یہ اس لیے ممکن تھا کہ جسم نے خود کو مصلوب کرنے کی اجازت دی۔ اس کے ''جسم کی کمزوری' گنہگار جسم کے سبب نہ تھی، مگر وہ جسمانی دنیا کے مطابق قابل مجروح تھا۔

ہم نے اس کا جلال دیکھا: ارتقاء اس کی جوابدہ نہیں

کلام خدا نے ہمیں خداوند کے جسم کے لاثانی ہونے کے بارے میں کافی معلومات مہیا کی ہیں۔ آغاز ہی سے قدرت نے اپنا نظام خراب کیے بغیر اس کو ممکن بنا دیا؛ اس نے غیر زوال شدہ دائمی آدم (یسوع مسیح) بنایا۔ جو کہ ایک منفرد ایمبریو کے ذریعے سے پیدا ہوا جو دیگر سب انسانوں کے برعکس پاک تھا۔ اس طرح دنیا کو آدم ثانی متعارف کروایا گیا، جس کا جسم موت کے لیے نہیں بنا تھا مگر وہ اس کا تجربہ کر سکتا تھا۔ خدا نے ان سب حاصلات کے لیے اسے یوں خلق کیا کہ نظام قدرت میں کوئی خلل نہ آیا۔

اس کامل جسم میں ابن خدا بطور ابن انسان ہمارا نجات دہندہ بن کر آیا، اس نے اس بات کو ترک کر دیا کہ وہ اس سے پہلے کیا تھا۔ صرف اسی طرح منصوبہ نجات بذریعہ متبادل قربانی موثر بنایا جا سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ ایک کامل انسانی جسم میں الٰہی فطرت کی تحقیر نہیں ہوئی۔

یہ تھی اس جسم کی شان، شکل اور گنجائش جس میں آدم خلق کیا گیا۔ فانی دنیا میں روح و جسم کے ساتھ خداوند یسوع مسیح ایک حقیقی شخص تھا جسے ایک بار پھر لافانی شان و شوکت سے فانی دنیا میں پیش کیا گیا۔ اس میں باپ جیسا الٰہی نشانیاں تھیں، وہ ابدیت تھی جس کے ذریعے اس نے کائنات کو خلق کیا اور بے ترتیب مادے کی بجائے اسے نظام کائنات میں رکھا، یوحنا 1:14 کے مطابق، ''وہ انسان بنا اور ہم میں سکونت پذیر ہوا، اور ہم نے اس کا جلال دیکھا، باپ کے وحید کا جلال، فضل اور سچائی سے معمور۔'' اسکا گھر کس قدر جلالی تھا۔

ہم نے حقیقی شخص کو دیکھا: وہ زوال سے پہلے والے آدم جیسا تھا۔ وہ ہمارا نجات دہندہ بننے کے لیے آیا تا کہ منصوبہ نجات بذریعہ متبادل قربانی کو موثر بنایا جا سکے۔

ہر چیز اس جسم کی کاملیت پر منحصر تھی:
ہر چیز اس کے حقیقی انسان ہونے پر منحصر تھی:
ہر چیز اس کے قابل مجروح ہونے پر منحصر تھی: اور
ہر چیز اس کی عارضی لافانیت پر منحصر تھی۔

یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ جسم اپنی موجودہ حالت میں ارتقاء کا جواب دہ ہو سکتا ہے، لیکن اگر وہ آدم کے جسم میں تھا، اور اگر وہ اوپر دی گئی چار شرائط کو پورا کرتا ہے تو ارتقاء ہماری مدد کرنے میں بالکل ناکام ہے۔

☆☆☆

پوشیدہ ظاہر ہوگیا

خدا انسان کیوں بنا

خدا کا راز جسد میں ظاہر ہوگیا۔ 1 تیموتاؤس 3:16

خدا کا جلال یسوع مسیح کی صورت میں۔ 2 کرنتھیوں 4:16

الوہیت کی ساری بھرپوری اسی میں متجسد ہوکر سکونت پذیر ہے۔ کلیسیوں 2:9

جب ولیم ایک فاتح کی حیثیت سے نارمنڈی (Normandy) کا راستہ عبور کرتے ہوئے انگلستان کے جنوبی ساحل پر اترا تو 1066 میں این سیلم کینٹر بری نے اوتار پر اپنا مشہور صحیفہ لکھا جس کا حوالہ ہم پہلے بھی دے چکے ہیں آپ کو یاد ہوگا اس کا موضوع بھی یہی تھا، "خدا انسان کیوں بنا۔"

اس کا جواب بھی وہی تھا جو ہم آج دیتے ہیں یعنی، ''انسان کا نجات دہندہ بننے کے لیے'' اس کے بہت سے دلائل دل و دماغ کو مطمئن کرتے ہیں، لیکن بہت سے سوالات پر اس نے بات نہیں کی۔ وہ جواب جو اس نے دیا اور ہم بھی دیتے ہیں خدا کے ابدی بیٹے کے انسان بننے کا اور ہمارے درمیان رہنے کا اکلوتا سبب نہیں۔

دراصل انسان کی شفاعت کے بہت سے اسباب ہیں، ان میں سے تین قابل قدر اسباب درج ذیل ہیں۔ حیران کن طور پر تینوں میں جسم درکار ہے

۱۔ وہ انسان پر خدا کو ظاہر کرنے کے لیے آیا۔

۲۔ وہ خدا پر انسان کو ظاہر کرنے آیا۔

۳۔ وہ انسان (حقیقی آدم) کو انسان پر ظاہر کرنے آیا۔

اس باب میں ہم دو نکات پر بات کریں گے جبکہ تیسرے پر اگلے باب میں۔

۱۔ وہ انسان پر خدا کو ظاہر کرنے کے لیے آیا

ایک دن مشہور برطانوی مورخ آرنلڈ ٹائن بی اپنے ایک قریبی دوست ڈاکٹر ایڈون بیون سے انسان کے الٰہی علم پر بحث کر رہا تھا، اس بحث کے دوران بیون نے اس سے کہا، ''انسان کا خدا کے بارے میں تصور ایک کتے کا اپنے مالک کے تصور جیسا ہے، کتا اپنے مالک کی محدود جبلت، عادت اور تنظیم جان لیتا ہے، لیکن اسے مکمل طور پر جاننے کے لیے کتے کو اپنی ذاتی فطرت کو انسانی فطرت میں ڈھالنا پڑے گا۔'' مجھے اس بات کا علم نہیں کہ اس نکتے کے بعد یہ بحث کیسے آگے بڑھی لیکن اس روشنی میں میں نے اوتار پر سوچنا شروع کر دیا۔ بلاشبہ کتے

کا انسان بننا خدا کے انسان بننے جیسا نہیں۔ پہلی مثال میں کم تر کا عظیم تر بننا ہے جبکہ دوسری مثال میں عظیم تر کا کم تر بننا ہے یعنی لامحدود کا محدود بننا۔ یہاں پر بیون انسان کے اپنے وفادار پالتو کو سمجھنے کے لیے کتا بننے کا حوالہ نہیں دیتا۔ اگر چہ اس بحث کو آگے بڑھنے کے لیے ہر بات طبعی لگتی ہے۔

دو مختلف اصناف کے درمیان بات چیت کا مسئلہ:

لیکن کیا بیون کا حل واقعی بات چیت کے مسئلے کو حل کرتا ہے؟ فرض کریں کتا انسان بن جاتا ہے۔ کیا پھر اسے دوبارہ کتا بننے کی ضرورت ہوگی؟ کتا جو انسان بن چکا ہے اب وہ کتا نہیں رہا۔ اگر وہ کتا بننا ترک کر دیتا ہے، تو کیا وہ انسان پر کتے کے خیالات ظاہر کر پائے گا۔ انسان بن کر وہ اپنی پچھل ذاتی فطرت کے سب رابطے کھو دیتا ہے۔ اگر وہ نصف کتا اور نصف انسان ہو تو نہ وہ کتا ہوگا نہ انسان، اور اس حالت میں نہ وہ کتے کو انسان پر اور نہ انسان کو کتے پر ظاہر کر سکے گا۔

یہ عمل مشکل بن جاتا ہے جب ماہرین بشریات یا تبلیغی جماعتیں کسی مترجم کا استعمال کرتی ہیں۔ اچھا مترجم ہونے کے لیے ضروری کہ مترجم اپنی ثقافت سے باعلم، لیکن محفوظ ہو اور ماہرین بشریات یا اپنی تبلیغی جماعت کی ثقافت کو بھی سمجھتا ہو۔ اگر مترجم کو اپنی ذاتی ثقافت کا اور غیر ملکی ثقافت کا فہم نہ ہو تو وہ اچھا مترجم نہیں بن سکتا۔ وہ خالص مقامی باشندہ ہونا چاہیے جو اپنی مقامی دریافتوں کا علم رکھتا ہو اور شعوری طور پر غیر ملکی ثقافت میں بھی ڈھل سکے۔

اگر خبر رسانی کے اس مسئلے کا کوئی حقیقی حل نہیں تو پھر جواب کہاں موجود ہے؟ خدا اور انسان کے درمیان وہ کونسا ''پُل'' ہے جس کے ذریعے فطرت تبدیل کی جا سکتی ہے؟ کیا آپ ایک پل تعمیر کر سکتے ہیں جس کے دونوں سرے درمیان میں ہوں؟ کیسے خدا انسان بن سکا اور خدا بھی رہا؟

یہ کیسے ہوا کی خدا کا بیٹا انسان کا بیٹا بن گیا اور اس نے اپنی پچھلی زندگی کو ترک بھی نہیں کیا؟ پھر خدا کیسے انسان بن گیا اور خدا بھی رہا؟ انسان کا کتا بننا اور انسان بھی رہنا محض ایک امکان ہوگا۔

''پُل'': دو فطرتوں کی مطابقت

جواب غالباً یہ ہے، خدا کی اور انسان کی فطرتیں جیسے کہ وہ حقیقی طور پر تخلیق کی گئیں ایک خاص بنیادی مطابقت میں شریک ہوئیں جو کتے اور انسان کی صحبت کے باوجود ان دونوں میں نہیں ہے۔

کیونکہ انسان کو بنیادی طور خدا کی صورت میں اور اس کی مانند بنایا گیا تھا، اس کی فطرت الٰہی فطرت کے مطابق تھی۔ اس صلاحیت نے اس بات کو ممکن بنا دیا کہ الٰہی فطرت خدا کے بیٹے میں ڈھل سکے جو انسان کی مانند تھا اور ساتھ ساتھ وہ اپنے باپ کی واضح شبیہہ بھی تھا۔ اسی وجہ سے ابن آدم اس قابل تھا کہ ہماری موجودہ حالت میں الٰہی فطرت کو واضح کر سکے۔ اس کی یہ دوہری فطرت اس کے ساتھیوں پر بھی ظاہر ہوئی اور نقادوں پر بھی، ساتھیوں نے اس کی عبادت کی اور نقادوں نے اسے رد کر دیا۔ ایک موقع پر اس نے سبت کے دن 38 سالہ

بیمار شخص کو تندرست کیا، جبکہ فریسیوں نے اس پر ایک پاک دن میں کام کر کے شریعت کو توڑنے کا الزام لگایا تو یسوع نے جواب دیا

،''میرا باپ اب تک کام کرتا ہے، اور میں بھی کرتا ہوں (یوحنا 5:17) فریسیوں نے کہا کہ یہ کفر بولتا ہے اور اسے مارنے کے لیے پتھر اٹھائے۔ جب اس نے پوچھا کہ یہ کلمہ کفر کیسے ہے تو انھوں نے جواب دیا، کیونکہ تم انسان ہو کر اپنے آپ کو خدا بناتے ہو (یوحنا 5:18)۔'' انھوں نے یہ دلیل اس لیے دی کہ یسوع نے نہ صرف خدا کو اپنا باپ کہا بلکہ یہ بھی کہا کہ خدا صرف اسی کا باپ ہے۔ یونانی میں اس کا اصل متن یہ ہے۔

اصل میں فریسی دوہری غلطی پر تھے! کیونکہ یسوع نے نہ صرف انسان ہوتے ہوئے خود کو خدا بنایا بلکہ خدا ہوتے ہوئے خود کو انسان بنایا۔ شاگردوں کو اس کے ساتھ شانہ بشانہ چلتے ہوئے تین سال سے زائد ہو گئے تھے، وہ انھیں ہر روز خدا کی مانند حیران کرتا رہا اور ساتھ ساتھ وہ عام انسانوں کی طرح زندگی کے بیرونی ماحول سے ردعمل بھی ظاہر کرتا تھا۔ اکثر وہ تھک جاتا بعض اوقات اسے بھوک اور پیاس لگتی اور انسانوں کی طرح وہ چوٹ بھی کھاتا۔ ایک موقع پر وہ خود کو ہجوم سے بچانے کے لیے بچ کر بھی نکلا۔ یہ سب باتیں اس پر عام انسانیت کی مہر لگاتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایسے کام کرتا کہ شاگرد دنگ رہ جاتے، وہ حیران تھے کہ یہ کس قسم کا شخص ہے۔

ایک دن اسے دوسرے لوگوں کی طرح سے بھوک لگی اور اس نے اپنے راستے سے ذرا فاصلے پر ایک انجیر کا درخت دیکھا جو پھل دار لگ رہا تھا اگرچہ پھل کا موسم نہیں تھا۔ وہ کچھ کھانے کی توقع میں شوق سے اس کی طرف گیا تھا اُس کی بھوک اور توقع ایک انسان کی طرح تھی۔ وہ مایوس ہو گیا کیونکہ درخت پر پھل نہ تھا اسے دھوکہ ہوا تھا۔

اس کے اسباب واضح نہیں ہیں یہ خواہش اس نے غالباً اس لیے کی کہ وہ شاگردوں کو یہ بات سمجھانا چاہتا تھا کہ غلط گواہی کو روک دینا چاہیے، اس نے انجیر کو حکم دیا آئندہ کبھی اس پر پھل نہ لگے۔ اس کے ایسا کرنے کی تصدیق ہو گئی کیونکہ اگلی صبح درخت مرجھا چکا تھا اس بات سے پطرس بہت حیران تھا (مرقس 11:21)۔

یہاں ایک حیران کن تضاد ہے انسانی طور پر اسے بھوک لگی اور الٰہی طور پر اس نے ایک زندگی کو بے جان کر دیا۔

شاگردوں نے اکثر اس قسم کی قربت کا مشاہدہ کیا اور ان پر یہ بات عیاں ہو گئی کہ وہ ایک ایسے شخص کیساتھ ہیں جو ان جیسا ہے مگر ان سے بہت مختلف۔ کبھی وہ اپنے علم میں محدود لگتا تھا اور کبھی یوں لگتا تھا جیسے وہ سب جانتا تھا۔ ایک موقع پر فلپ نے اس سے کہا، ''اے آقا باپ کو ہمیں دکھا کہ ہم تسلی پائیں'' شاید وہ ہمیشہ اس سے سوالات کرتے تھے، یسوع نے اسے جواب دیا، اے فیلبوس میں اتنی مدت سے تمہارے ساتھ ہوں کیا تو مجھے نہیں جانتا؟ جس نے مجھے دیکھا ہے اس نے باپ کو دیکھا ہے۔ پھر تو کس طرح کہتا ہے کہ باپ کو ہمیں دکھا (یوحنا 14:8,9)۔

اس طرح وہ اپنی انسانی اور الٰہی فطرت کو دہراتا رہا، وہ اپنے آپ میں نہ نظر آنے والے باپ کو دکھاتا رہا جو بصورت دیگر دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ یسوع مسیح نے الٰہی اور انسانی خصائل کی قربت مستقل ظاہر ہوتی رہی، یہ سب اتنی سادگی سے ہوتا کہ شاگرد دنگ رہ

جاتے۔انھیں حقیقت کو قبول کرتے ہوئے کوئی مشکل نہ تھی۔

گلیل کے سمندر میں اٹھتے ہوئے خوفناک طوفان کا وہ مشہور واقعہ دیکھیں جب یسوع ایک چھوٹی ماہی گیری والی کشتی کے دنبالے پر سو گیا۔یہ واقعہ تینوں اناجیل نے لکھا ہے،ان حالات نے سب پر گہرا اثر چھوڑا۔مرقس 4:35-41 میں یہ سادہ ترین بیان ہے۔

خدا کے کلام میں زندگی کی حیران کن مشابہت ہے۔انسان کتنا بھی تھکا ہوا کیوں نہ ہو یہ بات مشکوک لگتی ہے کہ وہ رخ بدلتے سمندر میں ایک چھوٹی کشتی میں گہری نیند سو جائے اور اس پر پانی کی پھوار بھی مسلسل پڑ رہی ہو۔ہمیں بتایا گیا ہے کہ وہ دنبالے پر سویا ہوا تھا۔جدید کشتیوں میں یہ جگہ انتہائی بے آرام ہے لیکن ان دنوں میں ایسے دنبالے نہیں تھے بلکہ صرف ایک تختہ ہوتا تھا جس سے کشتی چلائی جاتی،اسے سٹیر بورڈ (Steer Board) کہا جاتا تھا۔جس سے لفظ سٹار بورڈ (Star Board) نکلا ہے۔

اس موقع پر جب خداوند گہری نیند سویا تھا تو ایک بڑا طوفان اٹھا۔اندرون ملک زیادہ تر چھوٹی پہاڑیوں سے گھرے ہوئے سمندروں اور جھیلوں میں ایسے اچانک طوفان آتے رہتے ہیں اور وہ اکثر شدید ہوتے ہیں۔کینیڈا اور امریکہ کی بڑی جھیلیں اس بُری روش کے لیے بدنام ہیں۔ان جھیلوں کو جاننے والے سمندری ملاح ان کی بہت قدر کرتے ہیں۔

6000 سے زائد چھوٹے بحری جہاز تباہ ہو کر ان جھیلوں میں ڈوب چکے ہیں۔9 نومبر 1913 کی ایک خوفناک رات 30 سے زائد جہاز تباہ ہو گئے ان میں سے 10 مکمل طور پر ڈوب گے اور کھو گئے۔تباہ شدہ جہازوں کی فہرست میں زیادہ تر جہاز فولادی تھے اور وہ 524,452,440,270,269 فٹ لمبے تھے۔یہ واقع جھیل ہُرن میں ہوا جو کم گہری ہونے کے باوجود بدکار ہے،بڑی جھیلیں عملے کے لیے زیادہ خطرناک ہو سکتی ہیں کیونکہ ان کا پانی ٹھنڈا ہوتا ہے۔اس یادگار رات ساٹھ سے ستر فٹ اونچی لہریں اٹھیں اور انھوں نے جہازوں کے اوپری حصے،روشن دان اور دنبالے پر بنے عملے کے گھر کا صفایا کر دیا۔ہوائیں آندھی کی شکل میں بلا وقفہ سو لے گھنٹے چل سکتی ہیں اور انسان اور اسکی مشینری کو بے بس کر سکتی ہیں۔

مشرق وسطیٰ کے بہت سے مسافروں نے گلیل کی جھیل میں بھی،چھوٹی ہونے کے باوجود (میل 6x12) ایسی شدت کا مشاہدہ کیا ہے۔مرقس 4 باب میں جس طوفان کا حوالہ ہے وہ ایسا ہی اچانک طوفان تھا جس سے تجربہ کار ماہی گیر بھی دنگ رہ گئے وہ جلد ہی ڈوب جانے کے خطرے میں تھے اور خداوند سویا ہوا تھا۔اس طرح کوئی انسان سستی میں کیسے رہ سکتا ہے۔ مایوس ہو کر شاگردوں نے اسے جگایا اور اس سے درخواست کی،''اے استاد کیا تمہیں پرواہ نہیں کہ ہم تباہ ہو رہے ہیں؟''انھوں نے اس سے کیا کرنے کی توقع کی؟

وہ ان پر خفا نہ ہوا،وہ اٹھا اور بجائے ان کو ڈانٹنے کہ اس نے بڑی سادگی سے ہوا اور پانی کو کہا،تسلی رکھو اور ہوا رک گئی! اور ہمیں بتایا جاتا ہے کہ بڑی خاموشی چھا گئی۔کیا اس نے شاگردوں کو ایمان کی کمی کی وجہ سے ڈانٹا؟ کیا وہ کشتی میں ان کیساتھ نہ تھا؟ بدلے میں وہ پرسکون ہو گئے مگر وہ خوف زدہ بھی تھے کیونکہ انھوں نے ایک دوسرے سے کہا،''یہ کس قسم کا انسان ہے کہ ہوا اور پانی بھی اس کا حکم مانتے ہیں''(مرقس 4:41)۔

اگر وہ خدا نہیں تھا تو پھر کس قسم کا انسان تھا؟ مگر ہم جانتے ہیں کہ وہ پرانے عہدنامے میں خداوند کی جگہ تھا،اس طوفان کو

زبور 107:23-30 میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں اسے غیر معمولی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

> وہ سمندر میں جہازوں پر جاتے تھے تا کہ پانی کی وسعت پر تجارت کریں انہوں نے سمندر میں خداوند کے کام اور عجائبات دیکھے۔ اس کے کہنے پر ایسی طوفانی ہوا اٹھی جس نے اس کی موجوں کو اوپر اٹھایا۔ وہ افلاک تک چڑھتے اور گہرائیوں تک اترتے تھے، اور وہ مصیبت کے سبب پگھل گئے۔ وہ بدمست کی طرح ڈگمگانے اور لڑکھڑانے لگے، اور ان کی ساری مہارت جاتی رہی۔ اپنی تنگی میں انہوں نے خداوند کو پکارا تو اس نے ان کو ان کی تکالیف سے باہر نکالا اس نے تند ہوا کو دھیما کر دیا۔ سمندر کی موجیں تھم گئیں اور وہ خوش ہوئے اس لیے کہ وہ تھم گئیں اور وہ ان کو منزل مقصود تک لے گیا (یعنی دوبارہ گھر)

یقیناً یہ اسی طوفان کی پیش گوئی تھی، کیونکہ یہ وہی خداوند تھا جس نے مکمل اختیار کے ساتھ موجوں کو ایک حکم سے ٹھہرا دیا۔ ایک لمحے ہر یہاں ہمیں پتا چلتا ہے کہ خداوند یسوع کسی انتہائی تھکے ہوئے شخص کی طرح سویا ہوا تھا (یہ سوچنا ناممکن تھا کہ وہ سونے کا بہانہ کر رہا ہے)، اور اگلے ہی لمحے یہی خداوند ہواؤں اور لہروں کو تھم جانے کا حکم دیتا ہے اور وہ فوراً مانتی ہیں۔ شاگرد اس قدر حیران ہوئے کہ انھوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے۔ ایک ہی انسان میں انسانی اور الٰہی رویے کی ایک اور مثال یوحنا 11:1-44 میں تفصیل سے دیکھتے ہیں۔

لعزر ایک بیماری کی وجہ سے مر گیا اور اسے بیت عنیاہ کے باغ میں دفن کر دیا گیا۔ لعزر اور اسکی دو بہنیں مارتھا اور مریم تینوں خداوند کو پیار کرتے تھے، جیسا کہ یوحنا 11:5 میں واضح ہے۔ اگر زمین پر خداوند کا کوئی گھر ہوتا تو وہ ان ہی پیارے لوگوں کیساتھ ہوتا۔ تاہم اس میں ان کی مدد کی پکار پر فوراً جواب نہ دیا اور وہ لعزر کو موت سے بچانے کے لیے بہت دیر سے پہنچا اگرچہ یہ بات واضح ہے کہ وہ ایسا کر سکتا تھا۔

جب یسوع پہنچا تو لعزر چار دنوں سے مردہ حالت میں دفن تھا اور اسکے گلنے سڑنے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ کسی عام شخص کی طرح ناواقف ہوتے ہوئے، یسوع نے پوچھا اسے کہاں دفن کیا ہے؟ پھر وہ اکٹھے قبر پر پہنچے جب وہ راستے میں تھے تو یسوع خود بھی اپنے دوستوں کے غم میں غم زدہ ہو گیا اور اپنے آنسو روک نہ سکا۔

یہاں ہم ایک بار پھر انسانی فطرت کی دو واضح مثالیں دیکھتے ہیں یعنی علم کا محدود ہونا اور جذبات پر قابو نہ پانا۔ جونہی وہ قبر پر پہنچے الٰہی فطرت خود بخود عمل میں آ گئی اس نے پاس کھڑے لوگوں کو پتھر ہٹانے کو کہا۔

اس حکم پر مارتھا نے فوراً کہا، اس کی شکل بگڑ چکی ہوگی، کیا موت اور سڑاہٹ سے دن کی روشنی نمودار ہوگی؟ وہ اس منظر کو دیکھنے سے خوفزدہ تھی۔ کیونکہ جسم اب تک محفوظ نہ ہوگا، ''اے خداوند اس سے تو اب بدبو آتی ہوگی کیونکہ اسے چار دن ہو گئے ہیں (یوحنا 11:39) ہم نہیں جانتے کہ خداوند نے مریم اور مارتھا کو کیسے یقین دلایا ہوگا اس نے بلا ہچکچاہٹ پاس کھڑے لوگوں سے پتھر ہٹانے کو کہا اور انہوں نے اس کی تعمیل کی۔ پھر یسوع نے بلند آواز سے کہا لعزر نکل آ۔'' اور وہ جو مر گیا تھا قبر سے باہر نکل آیا، اس کے ہاتھ پاؤں اور سر لپٹا ہوا تھا جیسا کہ عام طور سے ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ اور جسم ابھی تک چھپا ہوا تھا۔ اس نظارے کا تصور کریں جو مریم اور مارتھا نے دیکھا، ان کے اس خوفکا

تصور کریں جب یسوع نے ان سے کہا، ''اسے کھولو اور جانے دو''۔ (آیت 44)

انہوں نے اس کپڑے تلے کیا دیکھا ہوگا؟ کیا ایک خوفناک فلم کی طرح ایک خوفناک اور بھیانک وضع چہرہ دیکھا ہوگا؟ یا ایک ایسا پیارا چہرہ جو بیماری سے پہلا تھا؟ اس سے پہلے ان کی امید کچھ بھی تھی مگر ان کی توقع یقیناً کچھ اور ہوگی کیونکہ وہ ایک لمبا عرصہ قبر میں رہا تھا۔ ہمیں یہ نہیں بتایا گیا کہ جب انھوں نے اپنے بھائی کو زندہ اور تندرست پایا تو کیا ہوا؟ نہ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ اس کے بعد یسوع نے کیا کہا۔ کیا وہ ان تینوں کیساتھ گھر واپس چلا گیا؟ انہوں نے راستے میں کیا باتیں کیں؟ ان سب باتوں پر پردہ ہے۔ کلام خدا محض تجسس کی تشفی کے لیے کچھ متفکر نہیں ہوا۔ یہ معاملے کا اختتام تھا۔

وہ جس نے مارتھا کو بتایا تھا کہ وہ جی اٹھے گا، یہ دعویٰ صرف خدا کر سکتا ہے، بعد میں وہ رو دیا (آیت 35)۔ جو صرف انسان کرتا ہے، اب وہ ثابت کر چکا تھا کہ اس کا بلند دعویٰ سچا تھا۔ بلاشبہ وہ ابن خدا بھی تھا ابن انسان بھی: وہ دو بیٹے نہیں تھے بلکہ ایک ہی ہستی میں دو بیٹوں کی خصوصیات تھیں۔

مخفی خدا انسانی شکل میں آ گیا

خداوند یسوع مسیح میں ہم الٰہی فطرت کا ظہور دیکھتے ہیں، یعنی پوشیدہ خدا ''ظاہر ہو گیا''۔ اس الہام سے ہم دیکھتے ہیں، کہ خدا کوئی بے پناہ قوت نہیں مگر ایک شخص ہے۔ خداوند یسوع مسیح میں ہم اس شخص کی حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ خداوند ویرانے میں بھوکا تھا: صلیب پر پیاسا تھا: یعقوب کے کنویں کے پاس دوپہر کے وقت تھکا ہوا تھا: اتنا تھکا ہوا تھا کہ طلاطم خیز سمندر میں سو گیا: اس پر غم غالب آ گیا۔ پیلاطس کے سپاہیوں نے اس پر تشدد کیا اور اسے بری طرح زخمی کر دیا، وہ کھوپڑی میں تکلیف کی وجہ سے بُری طرح تھک گیا: یہ سب ایک کامل جسم میں انسان ہونے کی نشانیاں تھیں جو گناہ سے ہرگز آلودہ نہ تھا پر بھی یہ انسان پودوں کو مرجھانے کا، طوفانوں کو رک جانے کا، روٹیوں کو بڑھ جانے کا، پانی کو شراب بن جانے اور سڑے ہوئے مردے کو جی اٹھنے کا حکم دے سکتا تھا۔ اگر یہاں خدا باپ منکشف ہوا پھر ہمارا باپ آسمان پر بھی حیران کن طور پر شخصی اور حقیقی ہے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسان ہے مگر ہم سے کہیں بڑھ کر یہ حیران کن نہیں ہے۔ شاید اس لیے ''کارل بارتھ'' کتاب لکھ سکا جس کا موضوع تھا ''خدا کی انسانیت'' بصورت دیگر وہ انسان کو کس طرح اپنی شبیہہ پر پیدا کر سکتا تھا؟

اس طرح اوتار کا مقصد پورا کر دیا گیا یعنی خدا کی ذاتی فطرت کا الہام اور انسان کے ذریعے اس کی شاندار پیش کش۔ خدا ہماری ضعیفی کے احساس سے بھی متاثر ہوا جب کہ وہ ہمارے گناہوں پر خفا ہے۔ کئی موقعوں پر خداوند یسوع مسیح نے بھی ایسا کیا، حتیٰ کہ اپنے پیاروں پر بھی خفا ہوا۔

2۔ وہ انسان کو خدا پر ظاہر کرنے کے لیے آیا

کیا کسی چیز کو خدا پر ظاہر کرنا سمجھداری ہے؟ کیا ایسی ضرورت کا امکان ہو سکتا تھا؟

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ، کیا کوئی ایسی چیز تھی جو خدا سے پوشیدہ تھی اور اسے ایک انسان کی ضرورت تھی کہ اس پر ظاہر کرے؟

حیران کن جواب یہ ہے کہ بے شک ایسا تھا اور یہ سب تجسم پر منحصر تھا۔ ہمارے منصف خداوند یسوع مسیح نے انسانی ترغیب کا تجربہ کیا۔ ہمیں انسانی ترغیب کی فطرت کو خدا پر ظاہر کرنا تھا۔ یہ ترغیب کی وہ قسم ہے جو انسان کے قابل مجروح ہونے کی بنا پر انسان میں ظاہر ہوئی، ایسا ممکن نہیں کہ اس قسم کی ترغیبات کا تجربہ کوئی خالص روحانی مخلوق جیسے کہ خدا کرے اگرچہ جسم کے مطالبات بے شمار ہیں خدا انسانی ترغیبات مثلاً بھوک، پیاس، جسمانی درد، تھکاوٹ اور جسمانی موت جو اسے زندگی بھر گھیرے رکھتی ہے۔ پھر خدا انسان کا انصاف کیسے کر سکتا تھا جبکہ انسان کو بہت سی ترغیبات درپیش ہوتی ہیں اور جسمانی مطالبات اسے مجبور کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے محسوس کیا کہ یہ مطالبات صرف گناہگار جسم کی وجہ سے نہیں ہیں، بلکہ جسم کے ہونے کی وجہ سے ہیں اگرچہ وہ جسم خداوند یسوع مسیح ہی کا کیوں نہ ہو۔ وہ خود بھوک، پیاس، درد اور تھکان میں مبتلا ہوا۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کے کامل جسم کے باوجود کئی موقعوں پر شیطان نے اس پر حملے کیے۔

یہ شیطان ہی تھا جس نے ویرانے میں اسے بھوک کم کرنے کی ترغیب دی اور جب تک وہ بھوکا نہ تھا اسے کوئی لالچ نہ دیا گیا، پہلے کچھ پیاس کے معاملے میں بھی ہوا جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔

''آسمانی باپ' یہ کیسے جان سکتا تھا کہ محرکات انسان کو کیسے چلاتے ہیں کہ فاقے کی وجہ سے چوری کرے، پیاس کی وجہ سے لڑائی کرے، ناقابل برداشت تشدد کی وجہ سے جھوٹ بولے، محض تھکان کی وجہ سے عبادت میں ناکام رہے اور روح کے طرز عمل سے دور جسمانی مطالبے پر شراب پیے۔ ارادے کی نسبت بھوک سے بے اعتدال ہونا زیادہ مضبوط ہے۔

ہماری زندگیاں نہ تو خالصتاً روحانی ہیں اور نہ ہی خالصتاً جسمانی اس لیے اکثر ان دونوں کے درمیان ایک کش مکش پائی جاتی ہے، اور ہم مختلف قسم کی تحریکات میں گھر جاتے ہیں جن کا تجربہ کبھی کسی فرشتے نے بھی نہ کیا ہوگا کچھ ترغیبات ہمارے کسی جگہ یا کسی وقت پابند ہونے کی وجہ سے ہوتی ہیں، کیونکہ ہم انتظار نہیں کر سکتے۔

ہمارا تعلق جسمانی دنیا کیساتھ ساتھ روحانی دنیا سے بھی ہے ایک خالص روحانی مخلوق صرف نصف بات جان سکتی ہے کہ ہم لالچ میں کیسے آسکتے ہیں؟ اس لیے کیا یہ مناسب نہیں تھا کہ باپ اپنے بیٹے کو بھیجتا اور وہ ہمارے تجربات میں پوری طرح شریک ہوتا مگر وہ ہماری گناہگار فطرت اور اسکی طاقت میں ملوث نہ ہوتا۔ کیا یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ خدا نے اپنے بیٹے کے ذریعے ہمارے زوال کو جسم کے سبب جاننے کی کوشش کی۔ خدا نے اپنے بیٹے کو گناہ آلود ہوئے بغیر واپس پالیا اب وہ انسانی تجربات سے زیادہ باعلم تھا۔ خدا نے اس کے عوض اسے انسان کا منصف بنا دیا۔

پرانے وقتوں میں جب معاشرہ گروہوں میں بٹا ہوا تھا تو ایک قانون یہ بھی تھا کہ انسان صرف اپنے ہم مرتبہ انسانوں کا ہی انصاف کرتا۔ ایسی صورتحال میں کسی ایسے شخص کیساتھ ناانصافی ہو جاتی جس کے بارے میں اس کا منصف نہ جان سکتا تھا کہ وہ کس قسم کی زندگی گزارتا ہے اور اس کے بہکاوے کی فطرت کیا ہے۔ البتہ اس قسم کے گروہی نظام کے منصف کو ایسی زندگی شروع کرنے کا سوال کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اس حقیقت کے معاشرتی ڈھانچے کے حقائق کے بارے عمدہ جان کاری ہو سکتی تھی۔

آج کے سائنسی حلقوں میں ہم یہ بات محسوس کرتے ہیں کہ کسی شخص کے کام کی قدر کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو ایسا پس منظر،

قابلیت یا تجربہ رکھتا ہو۔ ہم اسے ''ہم مرتبہ جائزے'' کا نظام کہہ سکتے ہیں۔ یہ سب ان کاموں کی طرح سے ہے جو انسان غیر کامل طریقوں سے کرتا ہے۔ اس طرح کسی بھی ایسے کام کو غیر منصفانہ تصور کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ خدا کو ہرگز بہکایا نہیں جا سکتا اس لیے وہ تجربے سے اس کا مطلب نہیں جان سکتا جب تک کہ وہ اپنی ذات پر اور دوسروں پر اس کا مشاہدہ نہ کر لے۔ پھر اس کا انسانی رویوں کا فیصلہ منصفانہ کیسے ہو سکتا ہے؟ شاید یہ کہنا بہتر ہوگا کہ کوئی فیصلہ اس وقت تک منصفانہ کیسے ہو سکتا ہے جب تک کہ منصف ان حالات کی ترغیب کا مطلب ذاتی طور پر نہ جانتا ہو۔ ایک منصفانہ جرح یہ مطالبہ کرتی ہے کہ یہ نہ صرف صحیح ہو بلکہ ان کو بھی صحیح لگے جو اس کاروائی کے گواہ ہوں۔ کیا تمام روئے زمین کا منصف ہماری نسبت کم کوشش کرے گا۔

الٰہی حکمت کچھ بھی ہو، کسی بھی سطح پر یہ بات واضح ہے کہ تمام فیصلے اسی کے ذمے ہیں جو خدا کو ترک کیے بغیر انسان بن گیا۔ جیسے خداوند نے سادگی سے کہا ''باپ کسی شخص کی عدالت نہیں کرتا بلکہ اس نے عدالت کا سارا کام بیٹے کو سونپ دیا ہے...اور اپنے بیٹے کو بھی اختیار دیا ہے کہ وہ عدالت کرے (یوحنا 5:22-27)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے صرف اختیار ہی نہیں بلکہ انصاف جاری رکھنے کو بھی کہا گیا ہے۔ اختیار کی یہ نمائندگی کیوں دی گئی؟ جواب بالکل سیدھا ہے ''کیونکہ وہ ابن آدم ہے'' (آیت 27)۔ یہی ہے وہ خاص وجہ کہ وہ ابن آدم ہے۔

پولوس رومیوں 8:34 میں اس بات کی تصدیق کرتا ہے ''کون انصاف کرتا ہے؟ یہ مسیح یسوع ہی ہے جو مر گیا بلکہ جی اٹھا اور خدا کی دہنی طرف ہے اور وہ ہماری شفاعت بھی کرتا ہے'' پس جو ہمارا نجات دہندہ ہے وہ ہمارا منصف بھی ہے جو ہماری وکالت کرے گا۔

اعمال 7:31 میں ہمیں یہی حوالہ پھر ملتا ہے کہ یہ محض وہی نہیں جو زندہ تھا اور مر گیا بلکہ اسے دنیا کا منصف بننے کے لیے اٹھالیا گیا، ''کیونکہ اس نے ایک دن ٹھہرایا ہے جس میں وہ راستی سے دنیا کی عدالت اس آدمی کی معرفت کرے گا جسے اس نے مقرر کیا ہے اور اسے مردوں میں سے زندہ کر کے یہ بات سب پر ثابت کر دی ہے۔''

2 کرنتھیوں 5:10 میں پولوس لکھتا ہے کہ ہم خدا کے بچے ہیں ہمیں بھی مسیح کی نشستِ انصاف کے سامنے حاضر ہونا ہے، جہاں ہماری اچھائیوں کی تعریف ہوگی اور ہماری برائیوں کو اس کے نام کی خاطر رحم کر کے دور کیا جائیگا۔ پولوس پھر زور دیتا ہے کہ یہ انصاف ہمارے بدنی اعمال کا ہوگا جو ہم نے جسمانی طور سے کیے نہ کہ روحانی طور سے۔

اس بات کو اکثر طرطولین نے بھی نوٹ کیا ہے اور ہم نے ایک اور جگہ اس کی کتاب ''جسم کے جی اٹھنے پر'' کا حوالہ دیا ہے۔ اس نے مشاہدہ کیا...

> پس کسی فیصلے کی کاملیت مکمل انسانی دلچسپیوں کو پیش کرنے میں ہے۔ چونکہ مکمل انسان دو فطرتوں کا مجموعہ ہے یعنی جسمانی اور روحانی۔ اسے ان دونوں حالتوں میں ظاہر ہونا ہے۔ اس کا مکمل انصاف اسی صورت ہوگا جب وہ زندگی میں مکمل طور پر داخل ہوگا۔
>
> جس طرح وہ جیتا ہے اسی طرح اسکا انصاف ہوا کیونکہ اس کا انصاف اس کے زندگی گزارنے کے

طریقہ کار پر ہی ہے۔ چونکہ فیصلے کا سبب زندگی ہے اس لیے جب اس کے اعمال رک جائیں گے تو اس میں موجود سب فطرتیں لازماً زیر تحقیق جائیں گی۔

طرطولین یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ جسم کا کسی فیصلے میں کوئی حصہ نہیں، نہ ہی تعریف کے لیے اور نہ ہی الزام کے لئے۔ یہ اس صورت میں ہے اگر جسم اس سبب میں شریک نہیں ہے، چونکہ یہ واضح ہے کہ اس کا انصاف ہوگا لہذا وہ اس وجہ سے بھی شریک ہوگا۔

باپ نے کبھی جسمانی ہونے کا تجربہ نہیں کیا، لہذا بیٹے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اگر وہ ہمارا منصف بنتا ہے تو جسمانی بنے کیونکہ ہمارے رد کیے جانے کے اسباب میں اہم کردار جسم کا ہی ہے۔ بیٹا اسی وجہ سے مجسم ہوا کہ انسان کو خدا پر ظاہر کرے اور باپ پر اس کی فطرت کو ظاہر کرے کیونکہ انسان کے گناہ کا سبب یہی جسم ہے۔

اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ باپ نے بیٹے کی بشریت میں انسانی تجربہ حاصل کیا۔ اگرچہ اس بات کو نظر انداز کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئی ہیں۔ کیا یہ کسی کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں کہ لعزر کی قبر کے پاس خداوند کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، حالانکہ وہ اس بات کو جانتا تھا کہ وہ اس کو زندہ کر دے گا۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ باپ نے انصاف کا سارا کام بیٹے کو سونپ دیا، وہ بشری طور پر بہکایا گیا اس لیے وہ اس تمام صورت حال کو سمجھتا تھا جس کو باپ کبھی سمجھ نہ پاتا۔ ایسا لگتا ہے کہ باپ انسانی انصاف کے کام سے نکل گیا اور اس نے انصاف صرف اسی کو سونپ دیا جو اسے بہتر طور سے کر سکتا تھا۔

ہمارے لیے کوئی صحیح اور مناسب راستہ تلاش کرنا بے شک مشکل ہوگا۔ کیا یہ مناسب راستہ ہو سکتا ہے؟ یسوع مسیح میں خالص انسانی جوہر بھی تھا اور الٰہی بھی، اور اس نے اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر اس جگہ رکھا جہاں دنیا اس کے ساتھ بدترین سلوک کر سکے۔ اس طرح وہ زوال شدہ انسان اور راست خدا کے درمیان ایک کامل منصف بن جاتا ہے۔

ارتقاء انسانیت کا جواب کیوں نہیں دے سکتی؟

بیون اور اس کے کتے کے درمیان حقیقی پل نہ تو انسانی روح کو کتے کے جسم میں لے جا سکا اور نہ کتے کی روح کو انسانی جسم میں۔ اس طرح کا کوئی پل ممکن ہی نہیں کیونکہ کتے کو انسان کی شبیہہ پر خلق نہیں کیا گیا، یہ نہ کتا ہوگا نہ انسان بلکہ کوئی عجیب مخلوق ہوگا۔

پہلا انسان خدا کی صورت پر خلق کیا گیا اور انسان میں کتے کی روح کے برعکس خدا انسانی جسم اختیار کر سکتا تھا۔ وہ اپنی الٰہی فطرت کو بحال رکھتے ہوئے انسان بن گیا، یہ واضح ہے کہ انسانی جسم نے ایسی غیر موزوں آمیزش نہیں بنائی۔ خداوند یسوع مسیح بطور ابن خدا اور ابن آدم انسان کے منصف کے طور پر کھڑا ہو سکتا ہے۔

اس صورت کی وجہ سے انصاف کے لیے منتظر لوگوں میں البتہ پہلا شخص آدم ہے۔ اگر خداوند کو آدم کی صورت پر، آدم کو خدا کی صورت اور آدم کے بعد آنے والے کو آدم کی صورت پر پیدا نہ کیا جاتا تو وہ آدم کی ترغیبات کا مناسب منصف نہ بن پاتا۔ آدم کا جسم ممکنہ طور پر وہ بنیادی جسم نہیں ہے جس کا تقاضا پہلے انسان کے لیے نظریہ ارتقاء کرتا ہے۔ جس طرح پہلے آدم کا جسم خلق کیا گیا اسی طرح آخری آدم کا۔

دوآدم: دوانسان

زوال شدہ انسان بمقابلہ لازوال انسان

پہلا آدم، پہلا حقیقی انسان، فقط ایک بار گناہ کیا

آخری آدم، دوسرا حقیقی انسان، کبھی ایک بار بھی گناہ نہ کیا

کیا آپ پوچھنا چاہتے ہیں کہ پہلا آدم پہلا حقیقی انسان کیسے ہے جس نے ایک بار گناہ کیا، پھر اس حقیقت پر غور کریں۔ جب آدم کو خلق کیا گیا تو اسے خدا کی شبیہہ پر خلق کیا گیا، جب اس نے گناہ کیا تو اس نے اپنی مخصوص شکل اور فطرت کو ترک کر دیا۔ گناہ کر کے وہ ایک نئی طرح کی مخلوق بن گیا۔ وہ خدا کے اس منصوبے سے مختلف تھا جب خدا نے پہلی بار کہا ''آؤ ایک انسان بنائیں'' اور پھر اس نے اپنی تخلیق کی تعریف ان الفاظ میں کی ''ہماری صورت پر'' (پیدائش 1:26)۔ پہلا انسان آدم انسان کا حقیقی نمائندہ تھا مگر اس نے ایک بار گناہ کر کے یہ حق کھو دیا۔ اس کے دوسرے گناہوں کی ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں کیونکہ وہ اس آدم کے گناہ نہیں تھے جس انسان کی تعریف خدا نے اپنے کلام میں کی۔ بطور انسان آدم کا پہلا گناہ اس کا اکلوتا گناہ تھا۔ گناہ کرنے کے بعد وہ حقیقی انسان نہیں رہا تھا۔

زوال کی مختصر تاریخ:

خدائی تخلیق کی صورت دو حقائق سے پیدا ہوئی۔ پہلی یہ جو باب 10 میں بیان کی گئی۔ آدم کے بیٹے اور بیٹیاں یعنی اس کے بعد آنے والے سب جو خدا کی صورت پر نہیں بلکہ آدم کی صورت پر پیدا ہوئے۔ اس خصوصی بیان پر غور کریں کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا مگر اس سے اگلی دو آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ آدم کے بیٹے اور بیٹیاں اس کی صورت پر پیدا ہوئے۔ اور دوسری بات نئے عہد نامے میں بیان کی گئی ہے کہ خدا کی انسان میں شبیہہ پھر سے مرتب کی گئی ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ پیدائش 9:6 میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ ''آدم خدا کی شبیہہ پر بنایا گیا تھا'' ''بنایا گیا ہے نہیں''۔ اس بات پر عبرانیوں کا اصل متن انتہائی مخصوص اور واضح ہے۔ زمانہ حال نہیں بلکہ ماضی استعمال ہوا ہے۔ آدم نے گناہ کر کے اس شبیہہ کو کھو دیا اور اس کے ساتھ ہی خدا کی انسانی تعریف بھی ختم ہو گئی۔ اگرچہ انسان نے یہ شبیہہ کھو دی تھی مگر پھر سے تخلیق ہونے کی صلاحیت نہیں کھوئی تھی۔ کس وجہ سے انسانی قتل مجرمانہ فعل ہے، اس لیے کہ زوال شدہ انسان قابل نجات رہے۔

مگر خداوند یسوع مسیح انسان بن کر پیدا ہوا اور اس نے ایک بار دوبارہ دنیا کو خدا کی صورت پیش کی (عبرانیوں 1:3)؛ پہلے آدم کے برعکس اس نے خدا کی شبیہہ کو نہ کھویا کیونکہ اس نے کبھی گناہ نہ کیا۔ اس طرح انسان بنیادی طور پر خدا کی صورت پر بنایا گیا، اور جسم کی شکل میں وہ خدا کے الہام کا کامل ذریعہ بنا کیونکہ تجسیم ہی خدا کی اس محبت کو پیش کر سکتی تھی جو اسے اپنی مخلوق سے تھی۔ اگرچہ اس مخلوق نے اپنی اصل شبیہہ کھو دی تھی۔ ہم مراحل کی ترتیب اس طرح سے پاتے ہیں۔

انسان کو خدا کی صورت پر خلق کیا گیا، انسان نے گناہ کیا اور صورت کو کھو دیا (پیدائش 1:26)

اب انسان تولید کے ذریعے سے زوال شدہ انسان کی صورت پر پیدا ہوتا ہے (پیدائش 5:3)

خدا انسان کی حقیقی صورت پر بنایا گیا (عبرانیوں 1:3)

انسان کو خدا کی صورت پر پھر سے مرتب کیا جا سکتا ہے (2 کرنتھیوں 3:18)

اب میں تیسری وجہ کی طرف آتا ہوں کہ خدا جسم کیوں بنا، کہ انسان کو انسان پر ظاہر کرے۔ مَیں بائبل کے دو حقائق بیان کروں گا جن کا جواب ارتقا نہیں دے سکتی:

۱۔ زوال شدہ انسان کی تخریبی ترغیبات

۲۔ غیر زوال شدہ انسان کی ارفع شان و شوکت

دونوں آدم انسانی فطرت کے حقیقی نمائندے ہیں، یہ دونوں مخالف کیسے ہیں؟ کیا وہ اصل میں ایک ہی ماخذ سے نکلے ہیں؟ کس قسم کی ماخذ دو شدتوں کو ابھار سکتی ہے یعنی انسان جیسے کہ ہم ہیں اور وہ انسان جو خداوند یسوع مسیح کی ہستی میں ظاہر ہوا، کیا یہ بات اس ماخذ کی انفرادیت کی طرف اشارہ نہیں کرتی؟

ا۔ زوال شدہ انسان

ایک موقع پر سی۔ ایس۔ لیوس نے بوبی برن کی نظم ''انسان نوحہ کرنے کے لیے بنایا گیا' سے ایک مشہور شعر درج کیا ہے۔

''انسانی وحشت بے شمار انسانوں کو رلاتی ہے''

ان لائنوں پر اس کا بیان انتہائی شعوری ہے، اس نے کہا سچائی یہ ہے کہ ''انسانی وحشت انسان کے لیے مسئلہ نہیں بلکہ اس کا مسئلہ انسانیت ہے''۔ اس کا دکھی رویہ اب ''انسانی رویہ' ہے۔ یہ انسان کی موجودہ فطرت ہے۔

انسان کی پیدائشی اچھائی

ایک مقبول نظریہ ہے کہ اچھا انسان سخت موت مرتا ہے۔ انسانی فطرت کی بتدریج ترقی کو تعلیم کی وجہ سے ایک دھچکا لگا۔ جب دو عالمی جنگوں نے یہ ظاہر کیا کہ دنیا کی سب سے تعلیم یافتہ اقوام نے بے مثال ظلم کی روش اختیار کی۔ یہ رویہ اس قدر برا تھا کہ انسان نے آج تک ایسا نہ دیکھا تھا۔ انہوں نے انسانیت کی سطح سے گر کے بے شمار لوگوں کو زخمی کیا۔ بے شک آج بھی کچھ ملکوں میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔

یہ رویہ تھا جو غیر مہذبانہ شرافت پر قائم رہا اس نے دلیل دی کہ وہاں پر غیر خراب شدہ انسانی فطرت کی شکل تھی جسے صرف تہذیب نے تباہ کیا تھا۔ اس نے اسے پیدائشی شرافت کا صلہ کہا اور بہت سوں نے اس کی کوشش بھی کی۔ اس میں سے کسی تبدیلی نے بھی انسان کی پیدائشی خود غرضی کے مسئلے کو حل نہ کیا اور مجروح ایمان کا قہر معاشرے اور افراد پر ایک جیسا رہا۔ جنگ عظیم دوئم میں بہت سے نازی کیمپوں کا مطالعہ کیا گیا، وہ لوگ خوشی سے تکلیف دینے اور ناقابل یقین ظلم عائد کرتے۔ بعد میں وہ فنون لطیفہ، کلاسیکی موسیقی اور ادب کا مزہ لینے گھروں میں چلے گئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ زوال نے انسانی فطرت کو کتنے خطرناک طریقے سے خم دیا۔ اجتماعی نازی خیمے

اور تشدد خانے انسانی ایجاد ہیں۔ ماندہ فطرت دور دور تک ایسا کچھ پیش نہیں کرتی جس سے اس کی بنیاد کا پتہ چل سکے۔

ان کیمپوں کا خوف اتنا غم ناک تھا کہ عام مہذب لوگ جنہوں نے اسے دیکھا ان کی آنکھیں ان کا یقین نہیں کر رہی تھیں۔ یہ ردعمل سیاحوں کا نہ رہا بلکہ وہ خوف کا شکار ہو گئے۔ ایک ڈاکٹر نے کچھ فاصلے پر ایک بڑی آگ کے بھیانک شعلے دیکھے اس نے سوچا شاید کوڑا جلایا جا رہا ہے، پیچھے ایک ٹرک تھا جس پر سے آدمی کھڑ نچوں کے ساتھ کوڑے کے گٹھے شعلے میں پھینک رہے تھے۔ یہ رات کا وقت تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ آدمی شیطان تھے اور جہنم کے شعلوں کو خوراک دے رہے تھے۔

اچانک اس نے محسوس کی کہ کوڑے کے وہ چھوٹے چھوٹے گٹھے دراصل کیا تھے! وہ بچے تھے، اور اسے یقین تھا کہ ان میں سے چند ابھی تک زندہ تھے۔ وہ کھڑ نچوں پر حرکت کر رہے تھے جونہی اس نے یہ دیکھا تو اس کیساتھ کیا ہوا اس کی آنکھ کھل گئی یہ سب ایک خواب تھا۔ اس نے اس تصور کو جلاوطن کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سچ ہے اس نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ وہ کچھ جانتا بھی ہے۔ بنی نوع انسان اس طرح کی کاروائیوں کے قابل نہیں ہیں۔ اسے یقین تھا کہ یہ ایک خواب ہی ہوگا۔

ایک اور منظر میں حاملہ عورتوں سے ظالمانہ سلوک کیا گیا۔ ان کے پیٹ پر ٹھوکر ماری گئی، ان کو بالوں سے پکڑ کے گھسیٹا گیا۔ ان کی ایک ٹانگ چولہے میں ڈال دی جاتی اور مزید جسمانی اذیت دینے کے لیے زندہ رکھا جاتا۔ لوگ اسے دیکھ کر بھی اس پر یقین نہ کرتے تھے، بعد میں وہ جان جاتے کہ کام واقعی ہوا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ تمام مخلوقات میں انسان اکلوتی مخلوق ہے جو اپنے شکار کو تلاش کر کے ارادے سے، شوق سے، غصے سے یا مکاری سے موت کے ناقابل یقین ذرائع استعمال کرتا ہے۔ یہ مہذب قومیں ہی ہیں جو ایسے حربے استعمال کرتی ہیں۔ وہ کم و بیش تشدد کرتی ہیں اور دکھ دیتی ہیں۔ وہ انسانی جسم کے ذاتی اور حساس حصوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ شکار کے ردعمل کی نسبت انکے حربے زیادہ ذلیل ہوتے ہیں، لیکن اب تک شاید سب سے خطرناک انسانی فضلہ ہے جو منہ، ناک اور آنکھوں میں ڈالا جاتا ہے اور اسے کھانے اور پینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ ناقابل یقین ہے۔

مہذب اور غیر مہذب تمام قومیں مجرم رہیں ہیں۔ اگر ہم شیطان پر یقین نہیں رکھتے تو یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم اس بات سے غافل ہیں کہ نفرت میں آکر انسان انسان کیساتھ کیا کر سکتا ہے۔

ولیم ٹیمپل بالکل صحیح تھا۔ اس نے کہا کہ بدترین کام زیادہ تر چند بدکار لوگوں کیوجہ سے نہیں ہوتے بلکہ ہماری وجہ سے ہوتے ہیں کیونکہ ہم سب ایسے ہیں۔ ایسے حالات میں نرم ترین انسان جانور سے بھی بدتر بن جاتا ہے کیونکہ جانور ایک دوسرے کو محض اس لیے نہیں چیرتے کہ ان کی چیخیں سن کر خوش ہوں

نازی دور میں ہم نے ایک آسان ہدف اور وضاحت کا ایک تیار ذریعہ دیکھا ہے لیکن نازی اتنے برے نہیں تھے جتنے ہم ہیں۔ جانور نفرت نہیں کرتے صرف انسان کرتا ہے،۔ انسانی نفرت شیطان سے متاثر ہے۔

جارج سٹیز صحیح تھا جب اس نے ان خوف ناک جگہوں کے بارے میں کہا، ''فن، شعوری تلاش، قدرتی سائنسوں کی ترقی

اور وظیفے کی بہت سی شاخوں نے ذبح خانوں اور موت خانوں کی قربت میں ہی نشوونما پائی ہے''۔ یہ ایک حقیقت ہے ان چیزوں کا کھوج اور ان کی پیروی عقیدت کیساتھ کی گئی اور حیوانیت کے ان خوفناک کیمپوں کی قربت میں ہی ان کا مزہ لیا گیا۔ وہ اس نزدیکی سے پوری طرح واقف تھے۔

جمالیاتی حس۔ غضب ناک ذہنیت، اجادیت، سائنسی اہلیت، کسی کاروائی کے لیے ذہنی تیاری حتیٰ کہ دوسروں کے لیے تفکر بھی ان خوفناک جگہوں پر ساتھ ساتھ پائے جاتے تھے۔ انسان کا اخلاقی احساس بالکل متضاد ہے جیسے کوئی فرد اُدھم مچائے اور جھوٹ بولے اور یہ ثابت کرے کہ وہ معصوم معزز اور دیانت دار ہے۔

یہ تضاد اس حقیقت سے پیدا ہوا کہ ان کیمپوں کے ماحول میں رہتے ہوئے بہت سے عام اور قابل لطف پڑوسیوں نے ان سب باتوں کو نہ جاننے کا بہانہ کیا۔ ان ہی میں سے بہت سے لوگوں نے اپنے رہائشی کمروں کے فرنیچر بالائی منزلوں میں رکھے تا کہ وہ بہتر نظارہ لے سکیں۔ جب اس کی وجہ پوچھی گئی تو ان کے پاس جواب نہ تھا وہ خاموش رہے ہم اپنے آپ کو نہیں جانتے حقیقتاً ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا۔ ہمارے خیال میں جرمن لوگ ہی تھے جنہوں نے یہ ظالمانہ حرکت کی یہ بات جھوٹ ہے۔ ڈوس ٹوائسکی روس کا ایک واقعہ لکھتا ہے یہ چھوٹی سطح کا واقعہ تھا لیکن بالکل اسی طرح کا اور اسقدر ظالمانہ۔

ایک دن ایک لڑکے نے جو کہ آٹھ سال کا تھا کھیل کھیل میں ایک پتھر پھینکا اور مقامی جنرل کے پسندیدہ کتے کا پاؤں زخمی کر دیا اس نے پوچھا، '' میرا پسندیدہ کتا لنگڑاتا کیوں ہے'' اسے بتایا گیا کہ ایک لڑکے نے ایک پتھر پھینکا اور اس کا پاؤں زخمی ہو گیا۔ اس نے حکم دیا ''اسے لے آؤ' بچے کو اس کے ماں سے علیحدہ کر دیا گیا اور تمام رات بند کر دیا گیا۔ اگلے دن صبح سویرے جنرل اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر آیا اس کیساتھ اس کے شکاری کتے اور ان کے رکھوالے بھی تھے۔ اس کیساتھ شکاری بھی تھے اور وہ سب شکار کے لباس میں تھے۔ اخلاقی اصلاح کے لیے نوکروں کو بھی بلایا گیا تھا اور ان سب کے سامنے بچے کی ماں کھڑی تھی، بچے کو لایا گیا یہ خزاں کا ایک افسردہ سرد اور دھند آلود دن تھا لیکن شکار کے لیے موزوں تھا۔ جنرل نے حکم دیا کہ بچے کے کپڑے اتار دیئے جائیں اور بچے کو ننگا کر دیا جائے۔ بچہ سردی سے کانپ رہا تھا، مگر مارے خوف کے چیخ نہ سکا۔ جنرل حکم دیتا ہے اسے دوڑاو، کتے کے شکاری چلائے، ''دوڑو دوڑو''۔ بچہ دوڑتا ہے اس بچے پر جنرل اور اس کے تمام شکاری کتے چڑھ دوڑتے ہیں اس کی ماں کی آنکھوں کے سامنے شکاری کتے اسے پکڑ لیتے ہیں اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔

وہ ہم نہیں تھے روسی تھے کیا اس مزے میں جو اس ظلم سے حاصل کیا گیا اور اس مزے میں جو مرغوں کی لڑائی میں حاصل کیا جاتا ہے کوئی فرق ہے، یہ ظالمانہ کھیل امریکہ کی مختلف ریاستوں میں کھیلا جاتا ہے اور اسے قانون کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ کیا ذاتی خوشی کے لیے جانوروں پر ظلم انسان کے پیدائشی زوال کی نمائش ہے۔ محض تفریح کے لیے کوئی جانور کسی جانور سے یہ سلوک نہیں کرتا۔

اس قسم کی بدی ہمارے معاشرے میں ہر جگہ ہے یہ چونکہ ظاہر نہیں ہوتی اس لیے ہمارے لیے مجرمانہ نہیں لیکن یہ موجود ضرور ہے اس کی گواہی غریبوں میں ملتی ہے جو فلاحی نظام کو گالی دیتے ہیں، اور ان سست لوگوں میں ملتی ہے جو بے روزگاری کو گالی دیتے ہیں۔

یہ ان معزز لوگوں میں بھی دیکھی گئی ہے جو ایسے ''عطیات' دیتے ہیں جو وجود نہیں رکھتے اور انھیں آفیسر سے انکم ٹیکس کاٹ لینے کی رسید وصول ہوتی ہے۔ ٹیکس کی بچت میں پھر کسی بلا منافع تنظیم کو شریک کیا جاتا ہے جو رسید جاری کرتی ہے، یہ سب پہلے سے منظم ہوتا ہے۔

گناہگار رویے کی ہمہ گیریت

اصل میں کچھ گناہ بہت خطرناک ہوتے ہیں کیونکہ وہ عوام میں کیے جاتے ہیں جبکہ زیادہ تر گناہ تنہائی میں ہوتے ہیں اس لیے انہیں پوشیدہ رکھا جاتا ہے یا بہت سے لوگ ان کی نگرانی کرتے ہیں۔ انسان کا زوال گہرا اور کشادہ ہے، یہ ان سب کے لیے ہمہ گیر ہے ''جنہوں نے گناہ کیا'' (رومیوں 3:3)۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ہم ذاتی طور پر ایسے خوفناک کام کرتے ہوئے بچ گئے ہوں کیونکہ ہمیں کبھی بھی ایسی جگہ پر رکھا نہیں گیا تھا جہاں ہم نفرت یا غصے کے قابو میں ہوں۔ اور اگر ہم اس حالت میں ہوں بھی تو ہم اپنے غصے یا نفرت کی حالت میں ایسا کام کرنے کے لائق نہیں ہوتے۔ سلاطین جو چاہتے تھے سو کرتے تھے کیونکہ رسماً ان پر قانون لاگو نہ تھا۔ داؤد اسرائیل کا سب سے بہتر بادشاہ اور آحب اسرائیل کا سب سے بدتر بادشاہ دونوں نے پوشیدگی میں قتل کیا۔ ایک نے دوسرے کی بیوی کو ہتھیایا اور اسکے شوہر کو قتل کر دیا جبکہ دوسرے نے انگوروں کا باغ ہتھیایا اور اس کے مالک کو قتل کر دیا (2 سیموئیل 27-11:1 اور 1 سلاطین 16-21:1)۔ یہ ہے ہماری صلاحیت ہماری اچھائی اور برائی ایک ہی جیسی ہے۔ داؤد بہت پچھتایا آحب غیر اہم رہا تاہم دونوں نے اس لیے قتل کی کہ وہ زوال شدہ انسان تھے۔

لیکن ان لوگوں نے احتجاج جاری کیوں نہ رکھا جو کہ ابھی تک آزاد اور نازی کیمپوں سے باہر تھے جبکہ ان کے رشتے داروں اور دوستوں کے ہاتھ پیر خوفناک طریقے سے کاٹے جا رہے تھے۔ کیا یہ سچائی سے نفرت تھی یا نتائج کا خوف پورے طور پر نہیں لیکن کسی حد تک اسکا جواب ہاں ہے۔ بعض اوقات وہ جانتے تھے اور انھیں کوئی خوف بھی نہ تھا کیونکہ وہ بیرون ملک اور محفوظ تھے لیکن انھیں نے یا ہم نے احتجاج کیوں نہیں کیا۔ مجھے لگتا ہے کیونکہ وہ یا ہم ایسا یقین نہیں رکھتے کہ انسان انسان کیساتھ اس طرح کا غیر انسانی سلوک کر سکتا ہے۔ شکار ہوئے لوگ خود بھی یقین نہیں رکھتے تھے جب انھیں بھیڑوں کی طرح ذبح خانے لے جایا گیا، انھوں نے کوئی احتجاج نہ کیا کیونکہ بہت دیر ہو چکی تھی۔

جیسا کہ ایک آکسفورڈ مورخ ''ہربرٹ بٹرفیلڈ نے مشاہد کیا:

> غیر پڑتال شدہ انسانی ضابطے ہمارے لیے دکھ ہی دکھ پیدا کرتے ہیں یہ ضابطے اب بھی ہم میں موجود ہیں مگر تاریخ ان کی حمایت نہیں کرتی... وہ لوگ جو اس بات پر یقین نہیں کرتے وہ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ انسانی تاریخ زوال کے حالات و واقعات کی مرہون منت ہے۔

ہم ایک منفرد بیماری میں مبتلا ہیں جو انسانی فطرت کے سوا کہیں نہیں دیکھی گئی یہ بیماری دو کام کرتی ہے۔ یہ ہمیں نا قابل یقین بدی کے قابل بناتی ہے جو حیوانی دنیا میں نہیں: اور یہ ہمیں اندھیرے میں رکھتی ہے کہ ہم ایسی بیماری میں مبتلا نہیں۔

یہ بیماری انسان میں ہمہ گیر ہے، اور ہم سب کامیابی سے اس کی نمائش کرتے ہیں۔ اگر کوئی پوچھتا ہے، ''بچپن کی

خوشگوار معصومیت کتنی جلدی کھو جاتی ہے" تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسان جتنی جلدی کرسکتا ہے گناہ کرتا ہے! پیچیدہ تہذیب کے بڑھتے ہوئے ہزاروں سالوں نے بھی اس تصویر کو نہیں بدلا ہم اسی طرح بیمار ہیں جس طرح ہمارے آباؤ اجداد تھے۔ کائن ایک قاتل تھا، ہم سب تباہی کے ہتھیاروں سے اپنے بڑائی کو لیس کرتے ہیں۔ یہ بیماری زمین پر اس لیے رہتی ہے کہ انسان خود بیمار ہے۔ معاشرے کا باغی، معاشرے کے لیے کافی برا ہوتا ہے غالباً اس سے بری کوئی چیز نہیں کہ اگر سارا معاشرہ ایک ہی قسم کی پست فطرت کے تابع ہے۔ ثقافت کے خراب ہو جانے سے پورا معاشرہ خراب ہو جاتا ہے۔ ہر جگہ حکومت کی جڑیں اس حد تک کھوکھلی کیجاتی ہیں کہ لاقانونیت، تباہی، تشدد، زنا بالجبر، قتل، چوری اور ظلم کے کوئی موثر کنارے نہیں ہوتے مگر نتائج بے پایاں ہوتے ہیں۔ کسی بھی سماجی گروہ میں مجموعی طور پر ایسا ہوسکتا ہے۔ جب کوئی ہجوم قائم شدہ حکومت کی پہچان کو نظر انداز کر دیتا ہے تو اس کا مزاج بدتر سے بدترین ہو جاتا ہے۔ پھر وہ کسی اچھائی کی طرف نہیں آتا کیونکہ اس کے اندر برائی بھر جاتی ہے۔ انسانی چال چلن آزاد ہے اور گناہ کے مساوی ہو جاتا ہے۔ ہجوم کے مزاج سے لوگوں کا صفایا کر دیا جاتا اور افراد اچانک سے اپنی فطرت کا بدترین پہلو پیش کرنے کے لیے خود کو آزاد پاتے ہیں۔ اکثر وہ اپنے ماضی پر حیران ہوتے ہیں۔

برائی کی طرف مائل ایک جیسی آوازوں کا شور بہت ڈراؤنا اور خوفناک ہوتا ہے، یہ شیطانی کام ہے ہجوم بدکار ہو جاتے ہیں اور افراد کا رویہ بالکل بدل جاتا ہے۔ ان گروہوں میں کچھ لوگ حتیٰ کہ شرفاء بھی کافی حد تک پُرتشدد اور قاتل بن جاتے ہیں اور تاریخ ایک المیہ دکھاتی ہے یعنی تشدد کے دور میں عورتیں بھی برابر شریک ہو جاتیں ہیں جیسا کہ فرانسیسی انقلاب کے دوران پُرتشدد کھیلوں کو دیکھتے ہوئے بھی عورتوں کی فطرت کا یہ غیر متوقع پہلو اچانک ظاہر ہو جاتا ہے پھر انسان مرد ہو یا عورت کہتا ہے "مجھے کیا ہو گیا تھا؟" اس کے اندر کچھ دخل نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر سے نکلتا ہے یعنی انسانی فطرت کی سچائی ظاہر ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ خداوند یسوع نے بھی کہا ایسا ہوگا۔

انسان فطرت میں مخل اور ارادۂ تخریبی ہے

دنیا پر انسانی حکومت تباہ کن رہی ہے۔ بے شک ہم انسانی تجربے کے انجام کے بہت قریب ہیں۔ اس ڈوبتے سفینے سے صرف خدا ہی بچا کھچا سامان نکال سکتا ہے۔ تمام تر انسانی معاشرہ اخلاقی دیوالیے کی قریب ہے۔ تکنیکی طور پر دنیا کے وسائل (ہوا، پانی، نمکیات) یا تو ختم ہو گئے ہیں یا آلودہ، اور وہ اس قابل نہیں رہے کہ زندگی کو مزید سہارا دے سکیں۔ حتیٰ کہ بیرونی خلا بھی جہاز کے پرانے رسے کی طرح ہو چکی ہے۔

ہوا یہ ہے کہ انسان کمال کا تخریب کار بن چکا ہے۔ اس نے اپنی ہی سلطنت کو تباہ کر دیا ہے۔ اس نے اچھی چیزوں سے بھرپور باغ تمدن کو ویرانے میں بدل دیا ہے اور اپنے لالچ اور حماقتوں کے ملبے سے بھر دیا ہے۔ کچھ لوگ تو یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ دنیا کا ہر ایک ویرانہ انسان کے غلط ذہنی استعمال کی وجہ سے ہے۔ ان کے دلائل کی بنیاد ڈبلیو سی لوڈرملک پر ہے جو کہتا ہے کہ زیادہ تر ویرانوں میں شہروں کے آثار ہیں جو اب ریگِ رواں تلے دفن ہیں۔ دوسرے ویرانے انسان کے آبی وسائل کے غلط استعمال کی وجہ سے ہیں۔ حالانکہ کبھی وہ ایک زندہ ماحول کا حصہ تھے۔ سر سیموئیل ہال افریقہ میں ایک چالیس ہزار ایکڑ سے زائد علاقے پر پھیلے ہوئے صحرا کا حوالہ دیتا ہے جو ایک گودام

کی چھت سے پانی بہنے سے شروع ہوا انھیں ایک چھوٹا نالہ کھودنے کی اجازت تھی ،مگر کسانوں کی سستی کیوجہ سے پانی کا راستہ بڑھتا گیا۔ایک مقامی باشندے نے کہا:''چالیس سال پہلے گرے ایک قطرے نے اب ملک کا ایک تہائی گھیر رکھا ہے''۔

اولیور پیرسن کہتا ہے کہ ماحول پر انسان کا اثر غالباً سب میملز (دودھ دینے والے جانور) کے اثر سے زیادہ ہے۔سالوں تک انسان زمینی دولت کو ہی اپنی روزی کے لیے استعمال کرتا رہا۔بہت سے دوسرے جانوروں کا انحصار بھی زیادہ تر زمینی آمدنی پر تھا۔

اینڈریو آئی وی نے حال ہی میں کہا کہ''زمین کا کٹاؤ اور بنجر پن باغات کی صحرا میں منتقلی کا باعث بنا۔یونان،شام،شمالی اٹلی، میسوپوٹامیہ اور چین کے بالائی علاقوں میں ایسا ہی ہوا۔ہم نے اناج کی فروانی کے علاقوں والگہ ویلی،جنوبی افریقہ،آسٹریلیا،امریکہ اور کینیڈا میں بھی آندھیوں کے بارے میں سنا ہے۔لارا تھامسن نے مشاہدہ کیا،''نظام حیات میں انسان سب سے بڑا عنصر نہیں ؛وہ مقامی علاقے میں صرف ایک عامل ہے جو مستعدی سے کسی پروگرام کو نافذ کرتا ہے''۔

خرابی کا ذمہ دار وہ تنہا ہے اور وہ تنہا ہی اسے ٹھیک کرتا ہے۔دکھ کی بات یہ ہے کہ انسان کسی ایسے اصلاحی عمل میں خود کو مصروف کرنے میں مکر کرتا ہے جہاں اس کے ذاتی آثار کی اہمیت ہو۔اے جی کارلسن نے مزاحیہ انداز میں لکھا''اس صورت حال میں کیا ہم مماثلت کا دعویٰ کر سکتے ہیں''۔انسان بڑا عقلمند ہے،یہ ایک ایسی مخلوق ہے جو ایسا کہلوانے پر بہت خوش ہوتا ہے۔لیکن دوسری مخلوقات اگر اسکی عدالت کرنے کے لائق ہوں تو وہ انتہائی بیوقوف ہے۔

انسان محض غفلت کی وجہ سے ہی فطرت میں مخل نہیں ہے وہ ارادۃً تخریبی ہے کیونکہ وہ تخریب کو بچپن سے ہی ترجیح دیتا ہے۔اس کی فطرت میں ہی کچھ غلطی ہے۔انسان کی شہوت پرستی کسی قابل نفرت انسان کی نہیں۔الفریڈ لارڈ ٹینی سن نے اپنی نظم ان میموریم میں مشہور محاورہ''فطرت دانتوں اور پنجوں کی سرخ ہے''استعمال کیا۔یہ نظم ڈارون کی کتاب''اصناف کی بنیاد''سے دس سال پہلے شائع ہوئی۔حالیہ سالوں میں بہت سی اہم کتابیں لکھی گئیں ہیں،جن سے واضح ہوتا ہے کہ فطرت ایسی نہیں ہے یعنی جانور ایک دوسرے کیساتھ جارحانہ نہیں ہیں۔انسان کے برعکس حیوانی معاشرے میں تائید یا تردید نہیں،مگر سالوں کی تحقیق کے بعد پرنس پیٹر کروپوٹکن نے لکھا کہ''فطرت کی خصلت باہمی مدد کی بنا پر ہے''۔یہ واضح ہے کہ انسان کی بدکرداری اس وجہ سے نہیں کہ اس کی فطرت میں کچھ حیوانیت ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اس کی فطرت میں زوال ہے۔جب پروفیسر گے لارڈ سمپسن اور رول ڈورنٹ جیسے معروف لوگ انسانی ارتقاء کے دفاع پر ڈٹے رہتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ''انسان ابھرا ہے گرا نہیں''تو وہ ناقابل اعتبار اور ناسمجھی کی بات کرتے ہیں۔پرانے وقتوں سے موجودہ وقت تک تاریخ منفی نظر آتی ہے۔

2:غیر زوال شدہ انسان

جیسے ارتقاء زوال شدہ انسان کی جوابدہ نہیں،ویسے ہی وہ غیر زوال شدہ کی بھی نہیں۔مگر غیر زوال شدہ انسان کا مشاہدہ کرنے لے لیے ہم کہاں کھڑے ہیں کہ جہاں ہم اس بات کا جواب دے سکیں جسکا نظریہ ارتقاء نہیں دے سکتا۔غیر زوال شدہ انسان ہمیں یسوع مسیح کی شکل میں ملتا ہے۔

یہ ایک سچا انسان تھا، جسکا جسم اسقدر خوبصورت تھا اور جلالی تھا کہ جب وہ آگے بڑھا تو اسے گرفتار کرنے والے پیچھے جا گرے اگرچہ وہ اپنے دشمنوں کے زیر عتاب تھا پھر بھی اس کی شخصیت کا حسن نا قابل بیان اور بے عیب تھا۔

اس کا اختیار اور طاقت کا استعمال

1887ء میں لارڈ ایکٹن نے بشپ مینڈل کریگٹن کو لکھا، ''طاقت بدعنوان ہوتی ہے اور کامل طاقت بدعنوان ہو جاتی ہے''۔ اگر آپ انسانی فطرت کی بدعنوانی ثابت کرنا چاہتے ہیں تو کسی شخص کو اس کے ساتھیوں پر طاقت اور اس کے نفاذ کے وسائل دیکر دیکھیں۔ طاقت جتنی زیادہ ہوگی بدعنوانی کا اظہار بھی اسی قدر زیادہ ہوگا۔ لیکن ایک شخص ایسا بھی تھا جس کے پاس زمین اور آسمان کی سب طاقتیں تھیں، وہ اپنی خواہش کے مطابق سب کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی اپنی فطرت میں بے عیب رہا۔ اگرچہ اس نے اپنی زندگی میں لگاتار مقابلوں کا سامنا کیا مگر پھر بھی یہ بدعنوان نہ ہوا۔

اس کے اختیار کی گواہی کلام میں ہر جگہ ملتی ہے، لیکن وہ سب مثالوں میں ہے جنہیں ہم آج انسانی دکھاوے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ جو کچھ وہ تھا اور جو کچھ اس نے کیا ہم اسے دوسری چیزوں کیساتھ رکھ کر عجیب قسم کی توقع کرتے ہیں۔ کسی ایک شخص کے اختیار، حکم اور وسائل سے آج تک کسی قوم نے انسانی کمزوری سے نجات نہیں پائی اگرچہ ذریعہ شیطانی کیوں نہ ہو۔

تعلقات میں اسکی حکمت اور خدا ترسی

جب ہم اس کا مخالفین کیساتھ برتاؤ سکون سے دیکھتے ہیں تو ہم اسکی پرسکون حکمت سے دنگ رہ جاتے ہیں۔ ایک دن فقیہوں اور فریسیوں نے اسے اپنے جال میں پھانس کر غداری کا الزام لگانے کے لیے اس سے پوچھا کہ، کیا قیصر کو خراج دینا مناسب ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہتا کہ نہیں، تو لوگ اس پر چلا اٹھتے اور اس کا بیان فوراً قیصر تک پہنچ جاتا اور اگر وہ جواب میں ہاں کہتا تو لوگ فوراً اس کے خلاف ہو جاتے اور فقیہی اور فریسی جیت جاتے۔

اس نے کیا کیا؟ اس نے کہا کہ مجھے ایک سکہ دکھاؤ سوال یہ اٹھتا ہے کیا اس کے پاس ایک سکہ بھی نہ تھا جبکہ اس کے چھوٹے سے گروہ کا بھی ایک خزانچی تھا۔ اپنے خزانچی یہوداہ اسکریوتی سے سکہ نہ مانگنے کا اس کا ایک مقصد تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فلسطین میں دو طرح کے سکے چلتے تھے۔ رومیوں نے یہودیوں کو اجازت دے رکھی تھے کہ وہ اپنے سکے خود ڈھال لیں کیونکہ وہ ہیکلوں میں شہنشاہ کے سکے استعمال کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن ہیکل کے احاطے میں سکے تبدیل کرنے والے بھی موجود ہوتے تھے۔

چونکہ اکائین اور فریسیوں کا جھکاؤ اپنے حکام کی طرف تھا اس لیے وہ کاروبار کے لیے رومن سکوں کو ہی ترجیح دیتے تھے۔ اسی لیے خداوند ان کی طرف مڑا اور کہا ''مجھے ایک سکہ دکھاؤ'' وہ اس بات سے آگاہ نہیں تھے کہ وہ کیا کرنے والا ہے، لیکن جب انھوں نے اسے رومی سکہ دکھایا تو اس نے سب کو دکھایا اور پوچھا ''یہ تصویر اور بیان کس کا ہے انھیں یہ کہنا پڑا قیصر کا''۔ وہ خود اپنے جال میں پھنس چکے تھے کیونکہ ان کے پاس رومی سکوں کا ہونا فلسطین پر رومیوں کے اختیار کا ثبوت تھا۔ پھر اس نے کہا، ''قیصر کی چیزیں قیصر کو دو اور خدا کی خدا کو (مرقس 12:7) اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ قیصر کے سکے استعمال کرتے ہیں تو آپ کو قیصر کی خدمت کرنی چاہیے۔

اس موقع پر اسے اور بھی بہت سے مخالفانہ سوال کیے گئے لیکن اس نے ہر ایک کا انتہائی پر اثر اور آسان جواب دیا کچھ کاتبین نے شکست بھی تسلیم کر لی اور کہا ''استاد تم نے بالکل ٹھیک کہا'' (لوقا 12:7)۔ انھوں نے پھر کبھی سوال کرنے کی جرات نہ کی۔ زنا کے وقت پکڑی گئی عورت کے واقعے میں ظاہر ہونے والی خداوند کی غیر معمولی حکمت اور شرافت شاید کسی دوسرے واقع میں نہیں ملتی یہ کہانی یوحنا 8:2-11 میں دی گئی۔ یہ وہ واقعہ ہے جسے آج کے بہت سے علماء سمجھتے ہیں کہ یہ اصل میں یوحنا کی انجیل کا حصہ نہیں ہے، کیونکہ ان کے کچھ قدیم پسندیدہ نوشتوں نے اسے ترک کر دیا ہے۔ شاید انھوں نے اس واقعے کو اس لیے ترک کر دیا ہے کہ لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ خداوند نے زنا کاری کو معافی دے دی ہے۔ میرا خیال ہے کہ خداوند زنا کاری کو معاف نہیں کر رہا تھا بلکہ اس شخص کا انصاف کرنا چاہتا تھا جو اس شخص سے زائد گناہ گار نہ ہو جس کے ساتھ وہ عورت فعل میں پکڑی گئی تھی (آیت 4)۔ اس شخص کو جسے اس عورت کیساتھ انصاف کے لیے لایا گیا تھا۔ کوئی یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ، اس گناہ میں عورت زیادہ گنہگار کیوں ہے؟

شریعت زانیہ کو سنگسار کرنے کو کہتی ہے اس لیے فریسی اس عورت کو لائے اور اسے خداوند کے سامنے کھڑا کر دیا اور دوسرے لوگ اردگرد کھڑے تھے۔ انھوں نے عورت پر الزام عائد کیا اور یہ بھی بتایا کہ شریعت اس کے بارے میں کیا کہتی ہے، اور پھر سوال کیا، ''لیکن تم اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' لفظ ''لیکن'' پر غور کریں!

اگر خداوند یہ کہتا ہے کہ ''اسے جانے دو'' تو فریسی اس پر موسیٰ کی شریعت کی تحقیر کرنے کا الزام لگا دیتے اور اگر وہ یہ کہتا کہ اسے سنگسار کرنا چاہیے تو ہجوم اسے صحیح مگر بے رحم سمجھتا۔

اس لیے یسوع نیچے بیٹھ گیا اور اپنی انگلی سے خاک پر کچھ لکھنے لگا، وہ خاک سلیمان کی ڈیوڑی میں جمع تھی جہاں ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے تھے۔ اس نے اسے نظر انداز کیا وہ اس سے ناراض تھے اور اس سے یہی سوال پوچھتے رہے۔ کافی دیر بعد یسوع کھڑا ہو گیا اور کہا، ''اس عورت کو پہلا پتھر وہ شخص مارے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو''۔

زیادہ تر مدعی ہی پہلا پتھر مارنے کا ذمہ دار ہوتا تھا، یہودی حکمت کو یہ ایک خراج تحسین ہے۔ الزام لگانے والے بہت سوں نے ایسی جرات نہ کی اگر وہ خود ہی اس کو سزا دینے کے لائق ہوتے تو وہ ناک میں دم کر دیتے۔

اس دعوت نے ان سب کو سوچنے پر مجبور کر دیا اور وہ اپنی حالت کے بارے میں سوچنے لگے۔ بوڑھوں سے جوانوں تک وہ سب ایک ایک کر کے جانے لگے حتیٰ کہ سب جانے لگے خداوند کھڑا ہو گیا اور جب دیکھا کہ کوئی باقی نہ رہا تو اس عورت سے کہا ''تمہارے الزام لگانے والے کہاں ہیں؟ کیا کسی شخص نے تمہیں رد نہیں کیا؟'' اور اس نے جواب دیا ''خداوند کسی نے نہیں''۔

خداوند کے انصاف کے بارے میں آپ سوچ سکتے ہیں بلاشبہ وہ بنا کسی مدعی کے قانون کے سامنے تھی مگر کوئی قانوناً اسے ثابت نہ کر سکا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کے لیے حالات مخصوص تھے اور خداوند ان مخصوص حالات کو جانتا بھی تھا اس نے کہا ''میں بھی تجھ پر کچھ ثابت نہیں کرتا پھر کبھی گناہ نہ کرنا''۔

یہ کہانی اس شخص کی سچائی کے دائرہ کار کو پیش کرتی ہے جس نے سلیمان سے بڑھ کر غیر معمولی حکمت اور مہارت کا مظاہرہ کیا۔

اپنے دشمنوں اور دوستوں کیساتھ تعلقات میں اس نے اپنی کاملیت برقرار رکھی۔ اس کی یہ کاملیت اپنی ماں کیساتھ تعلق میں بھی منعکس ہوتی ہے۔ وہ اپنی ماں کے مناسب دعووں کا جواب دینا اور غیر مناسب دعووں کو پہچانا اور ان پر مزاحمت کرنا جانتا تھا۔

اس کا بے عیب کردار

ایسی صورت جو انا جیل ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں واقع نا قابل ایجاد ہیں۔ ادبی طور پر ایسے کردار کی تخلیق پر صرف تاریخ سے نہیں بلکہ ایمان سے یقین ہوتا ہے۔ وہ مکمل طور پر ہم سے مختلف ہے لیکن اس حقیقت کو اس کے دشمنوں نے تسلیم نہیں کیا۔ جو لوگ اس کی پاکیزگی کی روشنی کو برداشت نہیں کر سکے انھوں نے اسے عدالت میں جرح کے لیے پیش کیا۔ ہر طرح کے لوگ اس کے خلاف گواہ کے طور پر پیش کیے گئے لیکن ان کی گواہیاں ایک دوسرے کے برعکس تھیں حتیٰ کہ یہ بات واضح ہوگئی کہ گواہ جھوٹے تھے۔ ایسے لوگ بھی بہت سے تھے جو اس کی معصومیت کے غیر رضا کارانہ گواہ تھے کبھی کبھی انھوں نے صرف خاموشی اختیار کی۔ یوحنا 8:46 میں خداوند نے ایک بار اپنے الزام لگانے والوں سے پوچھا، ''تم میں سے کون مجھ پر گناہ ثابت کرتا ہے؟'' اور کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔

جب یسوع کو گرفتار کیا گیا اور پیلاطوس کے سامنے لایا گیا تو پیلاطوس کی بیوی نے اپنے شوہر کو یہ کہتے ہوئے خبردار کیا، ''اس بھلے انسان کیساتھ کچھ نہ کرنا (متی 27:19)''۔ پیلاطس نے خود تین بار سرکاری طور پر اعلان کیا کہ وہ اس میں کوئی غلطی نہیں پا سکا تیسری مرتبہ اس نے پرزور طریقے سے دعویٰ کیا، ''میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں'' (متی 27:24)۔

حتیٰ کہ یہوداہ اسکریوتی جس نے اسے دھوکہ دیا تھا سردار کاہنوں کے پاس چلا گیا اور اس رقم کو جو اس نے دھوکہ دہی کے سبب لی تھی واپس کرنے کی پیش کش کی، ''میں نے گناہ کیا ہے کیونکہ میں نے ایک معصوم کو دھوکہ دیا'' (متی 27:4)۔

مصلوب لوگوں میں سے ایک نے جو جسمانی اذیت میں تھا اپنے ساتھی کو ڈانٹا اور جھڑکتے ہوئے کہا، کیا تو خدا سے بھی نہیں ڈرتا؟ حالانکہ اسی سزا میں گرفتار ہو اور ''ہماری سزا تو واجبی ہے کیونکہ اپنے کاموں کا بدلہ پا رہے ہیں لیکن اس نے کوئی بے جا کام نہیں کیا'' (لوقا 23:40,41)۔ اس نے یہ کیسے جانا؟ وہ یہ اس لیے جانتا تھا کیونکہ یہ ہر کوئی جانتا تھا....

صلیب دینے کے انچارج رومی صوبیدار نے خداوند یسوع مسیح کے رویے کا مشاہدہ کیا اور جب یسوع مر گیا تو اس نے کہا، ''یقیناً یہ ایک راست باز شخص تھا، حقیقتاً یہ خدا کا بیٹا تھا'' (متی 27:54) اور (لوقا 23:47)۔

رسولوں میں سے سب سے ذہین پولوس نے کہا، ''وہ کسی گناہ کو نہ جانتا تھا'' (2 کرنتھیوں 5:21)۔ مستعد پطرس نے کہا، ''اس نے کوئی گناہ نہیں کیا'' (1 پطرس 2:22) اور یوحنا جو اس سے سب سے زیادہ پیار کرتا تھا اس نے کہا، ''اس میں کوئی گناہ نہیں'' (1 یوحنا 3:5)۔

کسی شخص کی کامل معصومیت کا اس طرح کا ثبوت کبھی نہیں دیکھا گیا۔ یہ گواہی اس قدر پرزور تھی کہ آخر میں یہودی حکام نے خود بھی تسلیم کر لیا۔ تصلیب کے بعد انھوں نے صورتحال پر بحث کی اور کہا، ''حکم کرو کہ گور کن تین دن تک نگرانی کریں کہ کہیں رات کے وقت اس کے شاگرد اسکو کہیں چرا کر نہ لے جائیں اور لوگوں سے کہیں وہ مردوں میں سے جی اٹھا اور یہ پچھلا دھوکہ پہلے سے بھی برا ہو' (متی 27:64)۔

یسوع نے حقیقی انسان کو عام انسان کیسے ظاہر کیا

خداوند یسوع مسیح خدا کو انسان پر ظاہر کرنے کے لیے آیا وہ اس لیے بھی آیا کہ انسان کو انسان پر ظاہر کرے۔ یہ کام اس نے دو مختلف طریقوں سے کیا۔ اس نے دکھایا کہ ایک حقیقی انسان کیسا ہو سکتا ہے اور کیسا ہونا چاہیے۔ وہ اس دنیا میں پیدا ہوئے ہر انسان کے لیے ایک روشنی بن کر آیا۔ وہ حوالے کے معیار کے طور پر آیا۔ وہ ایک عمودی قطار کی طرح تھا جیسے اماؤس کہتا ہے۔ اگر ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمیں کیسے ہونا چاہیے، تو ہمارا عکس بحال کرنا ہوگا۔

دوسری طرف اگر ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہم کیا بننے کے قابل ہیں تو ہمیں موقع دیا جانا چاہیے۔ کیا انسان ضرورتاً اچھا ہے؟ کیا انسان سچ سے پیار کرتا ہے؟ کیا انسان راستباز، پاکیزہ یا بے غرض یا کامل ہے؟ یہاں پھر ہمارے پاس جواب یہ ہے، آج تک ایک ہی کامل انسان گزرا ہے جسے صلیب دے دی گئی۔ اسے کسی برائی یا جرم کے بدلے صلیب نہیں دی گئی بلکہ اس لیے کہ اس نے اپنے بارے میں سچ بولا تھا کہ وہ خدا بھی ہے اور انسان بھی۔

انسان کی ارتقائی بنیاد کے وکیل اس بات کو عالمی طور پر تسلیم کرتے ہیں، کہ بلاشبہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ یہ بات کتنی عجیب ہے کہ اس تخلیق گو اور سب سے حیران کن نمائندہ کو سونے کا نہیں بلکہ کانٹوں کا تاج دیا گیا۔ کیا انسان کا خود کے بارے میں یہی انصاف ہے؟

یہ غلطی کیسے سرزد ہوئی۔ یانا قبیلے کا ایک باشندہ ایک دفعہ کیلیفورنیا پہنچا۔ وہ اشی کے نام سے (انسان کا متبادل لفظ) جانا جاتا تھا۔ Passion Play فلم میں وہ اپنے لوگوں میں سے بچ جانے والا واحد شخص تھا وہ تصلیب کی کہانی سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے کہا کہ یسوع مسیح ضرور کوئی بہت برا شخص ہوگا جس کو ایسا مقدر ملا۔

سچائی اس کے بالکل متضاد ہے پہلی بات یہ کہ کیا وہ برا شخص تھا، خدا اس پر ہمارے گناہ نہیں ڈال سکتا تھا: کیا وہ خدا کو قربانی کے برّے کے طور پر قبول تھا: دوسری بات یہ کہ وہ دنیا کے لیے قابل قبول رہا ہوگا لیکن دنیا نے اسے رد کیا اور مصلوب کر دیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایک برا شخص تھا بلکہ اس لیے کہ وہ ایک کامل انسان تھا۔ اس کی کاملیت ہی تھی جس نے اسے خدا کے نزدیک قابل قبول قربانی بنا دیا۔ مگر دنیا کے نقطہ نظر سے وہ نا قابل قبول شخص تھا۔ اس کی برائی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی اچھائی کی وجہ سے ہم انسانوں نے اسے رد کیا اور موت دی۔ اس کی آزمائش میں ہم سب شریک تھے۔ اصل میں خداوند یسوع مسیح کی آزمائش اس کی آزمائش نہیں بلکہ زوال شدہ انسان کی آزمائش تھی۔ آزمائش میں وہ نہیں بلکہ انسان تھا اور نتیجتاً تردید اس کی نہیں بلکہ ہماری تھی۔

دو انسان آدم کہلائے: کیا اس کی یہی بنیاد ہے؟

زوال شدہ انسان اور جانوروں کے درمیان پل تعمیر کرنا ممکن نہیں۔ خداوند یسوع مسیح اور زوال شدہ انسان کے درمیان کونسا پل بنایا جائے گا۔ اگر خداوند یسوع مسیح اور زوال شدہ انسان دونوں انسان ہی ہیں تو اس کی پاکیزگی کے مابین پل کیسے بنائیں گے: کیا ایسا پل بنانا ممکن تھا۔

جواب ہاں ہے اس پل کو تعمیر کرنے کے لیے ہم پہلے آدم کی طرف واپس جاتے ہیں جس طرح وہ تخلیق کیا گیا، اور اسے ایک ایسا آدم بنایا ہے کہ جو زوال شدہ انسان کی طرح ہو۔ زوال اس پل کی محراب ہے، پہلا آدم جیسے وہ خدا کے ہاتھوں سے آیا تھا جو کہ آخری آدم کا حقیقی نمائندہ تھا وہ بھی زوال شدہ آدم بن گیا۔ جو انسانی تاریخ نے کہیں نہ کہیں پیش کیا۔ نئے تخلیق شدہ انسان کی صلاحیت ایک ایسے انسان کو پیش کر سکتی تھی۔ جسے انسان کی المیہ تاریخ نے پیش کیا اور وہ خداوند کی شکل میں خدا کا جلال بھی پیش کر سکتی تھی۔ یہ کیسی مخلوق تھی جس میں ہماری بدعنوان فطرت کی صلاحیت بھی تھی اور اپنی کاملیت کی بھی۔ اس کا جواب ارتقاء کے پاس بالکل نہیں۔ آدم کہلانے والے دونوں انسان لافانی تھے دونوں اس دنیا میں معجزاتی طریقے سے آئے۔ ایک تخلیق سے تو دوسرا کنواری کے حمل سے تھا۔ دونوں انسان مر گئے مگر دونوں میں سے کسی کو ایسا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

ارتقاء اور مسیحی عقیدہ متضاد ہیں

زوال شدہ انسان کی خودکشی کے مماثل بیماری اور خداوند یسوع مسیح کی قربانی کا جواب صرف بائبل ہے جو پہلے اور آخری آدم کی تاریخی بنیاد پیش کرتی ہے۔ نہ تو ان کی بنیادیں اور نہ ہی ان کی اموات حیاتیاتی طریقے کی تھیں اور نہ ہی طبعی طریقے کی۔ تاہم خداوند کے لوگوں کے لیے یعنی مسیحی عقیدے کے لیے دیا گیا، انسان کا ارتقائی جسم خطرناک ہے کیونکہ اس سے تجسیم سے لاتعلقی اور نجات اور خداوند یسوع مسیح کی موت اور زندگی فتح کی بجائے حادثہ بن جاتی ہے۔ جسمانی طور پر جی اٹھنا بے معنی ہو جاتا ہے کیونکہ ان دونوں باتوں کو عقل نہیں مانتی ان دونوں باتوں کا جواب ارتقا کے پاس نہیں ہے۔

کیا میں اس بات کا اختتام اس نتیجے پر کر سکتا ہوں کہ اس پوری کتاب میں اس حصے کو لکھنا زیادہ مشکل ہے۔ اسے کئی بار مکمل طور پر بھی لکھا گیا۔ اس کو لکھتے لکھتے میں اتنا مایوس ہو گیا کہ ایک دو بار سوچا کہ میں اس حصے کو نکال ہی دوں لیکن یہ ہو چکا تھا۔ پھر یہ اتنا مشکل کیوں تھا؟ ایسا اس لیے تھا کیونکہ زوال شدہ انسان کی لامحدود بدی نا قابل فہم تھی۔ جبکہ غیر زوال شدہ انسان کے کردار کی خوبصورتی نا قابل بیان ہے، کون ان کاموں کے لیے کافی ہو سکتا ہے؟

☆☆☆

موت پر فتح

غیر زوال شدہ انسان کے ذریعے زوال شدہ انسان کی نجات اگر ہمارا نظریہ درحقیقت مسیحی رہے تو ایمان کا عنصر جھک نہیں سکتا اگر ہم آج کے ترقی یافتہ علم کی اہمیت کو سمجھتے ہیں تو ہمارے ایمان کو جھکنے کی ضرورت بھی نہیں۔

زوال شدہ انسان کا مرنا ایک المیہ

انسان دو زندگیاں جیتا ہے اور دو ہی اموات مرتا ہے
روحانی طور پر وہ خودکشی کرتا ہے: اور جسمانی طور پر اسے پھانسی دی جاتی ہے

موت کا موضوع لامحدود ہے، اور اس کا علم بہت وسیع ہے کوئی تیس یا چالیس سال پہلے مجھے یاد ہے ایک سائنسی اخبار شروع ہوا انھوں نے کہا کہ مادے پر اب تک 600 سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن موت کی تفہیم کے لیے کوئی ایک جھلک بھی نہیں ماسوائے بیماری حادثے یا شکار کی موت کے۔ یہ مسئلہ آج بھی موجود ہے کوئی محض سالوں کے گزرنے کی وجہ سے نہیں مرتا۔

انسان میں یہ مسئلہ کافی الجھا ہوا ہے جانور تو صرف جسمانی موت مرتے ہیں مگر انسان دو طرح کی موت مرتا ہے ایک جسمانی اور ایک روحانی۔ چونکہ ہم دو طرح کی زندگی جیتے ہیں لہذا مرتے بھی دو طرح سے ہی ہیں۔

نظریاتی طور پر دونوں اموات کا کردار لفظ ''واحد'' علیحدگی سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ جسمانی موت جسم سے روح کی علیحدگی ہے اور روحانی موت روح کی خدا سے علیحدگی ہے۔ ہر معاملے میں انجام واقع ہوتا ہے جسے صرف خدا لوٹا سکتا ہے۔ جسمانی زندگی کے اختتام کا واحد علاج جسم کی نجات ہے اور روحانی زندگی کے اختتام کا علاج روح کا نئے سرے سے پیدا ہونا ہے۔

لیکن جسمانی موت کا یہ نظریہ انتہائی سادہ ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ موت ایک واقعے یا عمل کی صورت میں پہچانی جاتی ہے۔ قانونی اور طبی نقطہ نظر سے یہ ایک مرحلہ ہے اور اس کے وقوع کا وقت عام طور پر بیان کر دیا جاتا ہے۔ ساختی اعتبار سے یہ دراصل ایک عمل ہے جیسا کہ ہم باب 6 میں پڑھ چکے ہیں۔ یہ عمل زندگی بھر جاری رہتا ہے اور ہماری پیدائش بلکہ حمل سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ موت کے بعد کیا ہوتا ہے؟ یہ انتشار کا اگلا مرحلہ ہے اور موت کے پہلے ہی دن شروع ہو جاتا ہے۔ انسانی جسم آغاز ہی سے بدعنوان ہے اور تدفین اس کھیل کا آخری حصہ ہے۔

تاہم ہمیں علم ہے کہ ایسا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارے پاس ایک ایسا حقیقی انسانی جسم بھی ہے جس نے نہ زندگی میں بدعنوانی دیکھی نہ موت میں اگرچہ اس کے دفن کے حالات لعزر کے برعکس تھے کیونکہ اس کا جسم سڑنا شروع ہو گیا تھا۔

انسان کیوں مرتا ہے: سائنس اور علم الٰہی کے جوابات

انسان کی جسمانی موت کے فوری اسباب یہ ہو سکتے ہیں فاقہ، بیماری، ڈی این اے کی غلطیوں کی بہتات، زہر خوری، خودکشی، ڈر، ٹھنڈ، حرارت، حادثہ، انتہائی خوشی یا قہقہہ اور حتیٰ کہ ہچکیاں بھی۔ میڈیکل کے لوگ ممکنہ طور پر ہر معاملے میں موت کا سبب جان لیتے ہیں۔ حیران کن طور پر کبھی کبھی کسی فرد کی موت بلا سبب یعنی طبعی طور پر ہوتی ہے مگر اس کا سبب بھی بڑھاپہ قرار دے دیا جاتا ہے۔

سائنس کہتی ہے کہ انسان اس لیے مرتا ہے کہ حیوانی دنیا میں سب مرتے ہیں۔لیکن معاملہ یہ نہیں ہے ۔ ارتقاء کہتی ہے کہ یک خلوی جاندار تقریباً آغاز ہی سے موجود ہیں اور لافانی ہیں ۔اگر یہ بات سچ ہے تو انسان کا آغاز لافانیت سے ہی ہوا ہے۔وہ ابتدا سے فانی نہ تھا ان جانداروں کو مارا جاسکتا ہے مگر ان کی موت وراثتی نہیں ہے۔یہ بات سچ نہیں ہوگی کہ حیوانی دنیا میں موت انسانی موت کی وجہ سے ہے۔

انسان کا ایک ہی جدِ امجد سے سردار صنف بن جانے کا دعویٰ موروثی تصور لگتا ہے،اس کے لیے کوئی تجرباتی ثبوت نہیں ہے۔اگر ہم الٰہی ڈیزائنر کی موجودگی سے انکار کردیں تو اس زوال کی شہادت ماحولیاتی لگتی ہے اور وزن رکھتی ہے۔اس ڈیزائنر نے ایک ہی جیسا عمل استعمال کیا اور تخلیق سے ایک جسم خلق کیا جسے جسمانی بقاء کے حالات میں زندگی جاری رکھنی تھی۔ایسے کسی بھی ثبوت کی غیر موجودگی کبھی کبھی عوام کو سائنسی بحث میں لے آتی ہے اور وہ بلا تکلف تسلیم کر لیتے ہیں۔

اصل میں انسان کی بنیاد کوئی سائنسی ثبوت نہیں بلکہ جزو ایمان ہے۔حتیٰ کہ عوامی تصورات پر لکھی گئی کتابیں بھی اسی بات پر زور ڈالتی ہیں۔جینیاتی طور پر یہ ثابت کرنا ناممکن ہے کہ اس فوسل میں جو انسان جیسا تھا اور انسان میں جو فوسل جیسا تھا کیا تعلق ہے۔اس کو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔اس کی صرف خوشنما دلیل دی جاسکتی ہے یہ کہا جاتا ہے کہ تمام فوسل لاوارث بچے ہیں اور وہ اپنے تعلقات قائم کر رہے ہیں جو تا حال ممکن نہیں جب تک کہ دیگر شواہد جیسے کہ لکھی ہوئی تحریریں یا کتبے نہ مل جائیں۔فوسلز مکمل طور پر ہڈیوں کے بنے ہوتے ہیں اور ہڈیوں سے خونی تعلقات قائم نہیں کیے جاسکتے۔

مزید برآں حیوانی موت اس مخصوص جانور کا اختتام ہے انسانی موت محض اختتام ہے یہ نہ تو اس فرد کے جسم کا اختتام ہے اور نہ ہی روح کا، یہ اختتام نہیں بلکہ خلل ہے اگر یہ کسی ایک میں طبعی ہے تو دوسرے میں غیر طبعی ۔انسانی موت کو طبعی کہنا غلط بات ہے۔تقریباً ہر معاشرے کا قانون موت کے ممکنہ سبب کا مطالبہ کرتا ہے۔یہ ایک حقیقت ہے جو انسان کی طبعی موت سے انکاری ہے۔بلاشبہ طبعی موت کو قانونی قصہ کی اصطلاح دی گئی ہے۔

جیسے کہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ انسان کسی بھی حالات میں طبعی یا قدرتی طور پر نہیں مرتا بلکہ موت ممنوعہ پھل کو کھانے کی نافرمانی کے نتیجے کے طور پر متعارف کروائی گئی۔خرابی خوراک کے برعکس اس واقعے میں آدم میں ایک مہلک اثر پیدا ہوا جو زندگی بھر نہ صرف اس میں بلکہ اس سے پیدا ہوئے سب لوگوں میں منتقل ہوا۔پس موت ممنوعہ پھل کھانے کے گناہ کے سبب دنیا میں داخل ہوئی جس کے نتیجے میں نسل انسانی غیر طبعی طور پر فانی ہوگئی۔

انسان کی موت نافرمانی کا نتیجہ یا سزا ہے۔ان دو متبادلوں میں سے کونسا صحیح ہے اس کا فیصلہ مذہبی بحث پر منحصر ہے۔پیدائش 2:17 سے ہم پُر یقین نہیں ہیں، کہ خدا نے آدم کو نافرمانی کی سزا کے طور پر موت دی یا اسے طبعی نتیجہ بنا دیا یا شاید یہ دونوں تھا۔

ایک نقطہ نظر سے یہ بات اہم ہے کہ جسمانی موت ایک علاج تھی یعنی رحم کا عمل۔جیسے میتھیوڈیس (سن وفات 311) نے مشاہدہ کیا اور بہت دیر بعد فرینکلاوسن ٹریٹن (1623-1687) نے بھی اس ناقص جسم سے نجات پائی جو کہ ہماری زوال شدہ فطرت کا بنیادی

سبب ہے۔ پولوس لکھتا ہے کہ جسم کی کمزوری کے سبب قانون غیر موثر ہے۔ اسی بنیاد پر خداوند نے اپنی مصیبت کی خاص گھڑی میں اپنے دوستوں کی ناکامی پر معافی مانگی۔ ہم جسم کے بغیر کام نہیں کر سکتے لیکن ایسا وقت آئے گا جب ہم ایسا کریں گے کیونکہ یہ ہماری روحانی ناکامی کا ذریعہ ہے۔ گناہ سے خلاصی گناہ گار جسم سے خلاصی پر منحصر ہے، جسمانی موت ہی نجات کی ضمانت ہے۔

کیا موت ایک متبادل کا ترجمہ ہے؟ اور کیا موت ضروری چیز ہے؟

یہ دلیل دی جا سکتی ہے ہے کہ انسانی جسم کی مشینری بھی دوسری مشینوں کی طرح ناکام ہو کر ختم ہو سکتی ہے اس لیے موت انسان اور جانوروں دونوں کے لیے ناگزیر ہوگئی۔ اب ہم یہ جانتے ہیں کہ اصل معاملہ یہ نہیں کہ یک خلوی مخلوقات جیسے کہ ایبا میں یہ بات (موت) سچ نہیں۔ ان مخلوقات کی خوردبینی جسامت کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ سائز کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ ایبا کے لیے زندگی کا دورانیہ ہی زندگی ہے۔ ایچ ایس چنگیز (1910) لکھتا ہے کہ ایبا کی انتہائی مستعد آگاہی بالکل ہماری طرح ہے وہ پوری طرح آگاہ ہیں۔ زندگی کے مقابلوں پر ان کے ردعمل ہمارے بچوں کے خوف، امید اور مایوسی جیسے ہیں۔ ہم بڑے یہ بات بھول جاتے ہیں ہماری نسبت کہ بچوں کی مایوسیاں کس قدر حقیقی ہوتی ہیں لیکن یہ بے نتیجہ ہوتی ہیں۔ میں پھر یہ بات دہراؤں گا کہ سائز کا اس صورتحال سے کوئی تعلق نہیں۔

اس لیے یہ بات واضح ہے کہ خدا نے مخلوقات کو طبعی موت کے لیے نہیں بنایا بلکہ اس لیے کہ وہ زندگی کا بھرپور مزہ لے سکیں۔ یہ کہنا بہت بڑی غلطی ہوگی کہ یہ خوردبینی جانور چھوٹے ہونے کی وجہ سے پیچیدہ نہیں ہیں۔ تمام جاندار ناقابل یقین طور پر نہ صرف ساخت کے طور پر بلکہ رویے کے لحاظ سے بھی انتہائی پیچیدہ ہیں۔ جاندار کے بظاہر ایک جیسے سیل بھی ایک جیسے نہیں۔ کوئی زندہ چیز سادہ نہیں ہے۔

انسانی جسم کی مشینری اس طرح کیوں نہیں بنائی گئی کہ وہ بنا ناکامی کے کام کر سکے۔ بلاشبہ ہم جانتے ہیں کہ یہ کامل طور پر کام کر سکتا ہے کیونکہ دنیا گواہ ہے، اور انھوں نے ایک ایسا کامل انسان دیکھا ہے یعنی خداوند یسوع مسیح۔ ہماری نجات جسم کی کاملیت پر منحصر ہے۔ اگر یہ جسم غیر کامل ہوگا جیسا کہ ہمارے زوال شدہ اجسام تو اس کی منزل موت ہوگی اور جسم کی قربانی قبل از وقت موت کے سوا کچھ نہ ہوگی یہ ایک متبادل قربانی ہو سکتی۔ تجرباتی ثبوت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جانوروں کا مقرر دورِ حیات ہے اور عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ نہ اس سے کم جیتے ہیں نہ زیادہ اور ہر صنف کا کردار یہی ہے۔ کسی ایک صنف کی آبادی میں اضافے کو روکنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

جب اضافہ آبادی فطرت کو دھمکاتا ہے ہے تو تلافی کرنے کے بہت سے طریقہ کار ہیں۔ کچھ اصناف بچے پیدا کرتی ہیں تو کچھ پر (جیسے کہ سبز مکھی) جو انہیں علاقہ چھوڑنے کے قابل بناتے ہیں؛ کچھ جانور جو تعداد میں بہت زیادہ بڑھتے ہیں قریبی علاقوں سے شکاری جانوروں کو دعوت دیتے ہیں اور یہ شکاری شکار کو اسقدر کم کر دیتے ہیں کہ اشیاء پھر ایک توازن پر پہنچ جاتی ہیں (جیسے کہ بھیڑیوں اور ہرنوں کی مثال)۔ کچھ جانور جیسے کہ ہاتھی تعداد میں اس لیے کم ہو جاتے ہیں کہ ان کے جنسی فعل کا دورانیہ بہت لمبا ہوتا ہے۔ اس طرح دنیا میں جانوروں کی آبادی خوراک اور خوراک کھانے والوں کے درمیان متوازن رہتی ہے اگر کوئی انسان اس میں دخل اندازی نہ کرے تو۔

غیر زوال شدہ انسان کو اپنی جسمانی ابدیت کیساتھ بڑھنے اور زمین کو معمور کرنے کا حکم دیا گیا۔ کیا وہ غیر کامل طور پر نہیں بڑھتا رہا؟ کس طریقہ کار نے اس کے اضافہ آبادی کو روکا؟ کیا انسانوں میں اضافہ آبادی کو روکنے کے لیے اس میں موت کا طبعی طریقہ نہیں رکھا گیا؟

اگر ایسا ہے تو طبعی موت گناہ سے پہلے داخل ہو چکی تھی۔ یہ ایک مفروضہ ہے جو رومیوں 5:12 کے متضاد ہے لیکن اس سوال کا جواب نہیں۔

غیر زوال شدہ نسل میں اضافہ آبادی کو روکنے کے لیے طبعی موت نہیں بلکہ زندگی کے اعلیٰ درجے میں منتقلی مہیا کی گئی۔ یہ تبدیلی بلا جسم نہیں ہوسکتی بلکہ جسم کیساتھ ہی ہوسکتی ہے جیسے کہ خداوند کا جسم جی اٹھنے کے بعد۔ وہ موت نہیں بلکہ "پیوند" تھی۔ الٰہی منصوبے میں انسان کی منزل یہ تھی کہ وہ کبھی موت نہ چکھے اگر چہ اس پر پابندی تھی لیکن اس کی آزادی نے منصوبہ ختم کر دیا۔

آدم کے سامنے (اور اس کے بعد آنے والے سب لوگوں کے سامنے) زندگی گزارنے کا ایک نمونہ رکھا گیا تھا۔ اگر گناہ نہ کیا ہوتا تو میرا خیال ہے ہم کبھی نہ مرتے بلکہ صرف تبدیلی ہیئت کا ہی تجربہ کرتے۔ اگر چہ وہ آسمان پر بھی جا سکتا تھا لیکن ہماری خاطر خداوند یسوع مسیح نے لطف اٹھانے کی بجائے ارادۃً یروشلیم جانے اور خود کو موت کے حوالے کرنا قبول کیا۔

ایسے لوگ جسم کیساتھ جی اٹھیں گے جیسے کہ خداوند یسوع مسیح۔ اس پر ہم باب 17 میں بات کریں گے، اور اس صورت میں ہمارے اجسام فرشتوں کی مانند ہونگے ہم اضافہ آبادی کا باعث نہیں ہونگے ایسا لگتا ہے کہ ہمارا مقام تو ہوگا مگر ہم جگہ نہیں گھیریں گے۔ اسی طرح لافانیت کی شکل میں بھی اضافہ آبادی کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ جلد از جلد ہر فرد کو اس کی بقا کے ذریعے بالغ بنا دیا جاتا اور منتقلی اسے ایک ایسی حالت میں لے جاتی جہاں وقت اور جگہ کی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن وہ لوگ جو ایسے کامل نہیں ہیں ان کیلیے ایسی منتقلی بھی نہیں اور ان کے لیے موت ضروری ہے، یا تو خداوند یسوع مسیح جیسی زندگی ہوگی یا پھر ہمارے جیسی، جیسا ہم پر الزام ہے۔ کامل بننے کی اصطلاح صرف خداوند پر ہی لاگو ہوسکتی ہے کیونکہ وہ پیدا ہی معصوم ہوا۔ زندگی کے تجربات میں بھی اس نے صرف نیکی کی، ہم ایسی کاملیت کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ کامل ہونے کا مطلب صرف خداوند یسوع مسیح میں نظر آنا ہے۔ وہ کبھی بھی غیر کامل نہ رہا بلکہ اس کے بچپن کی پاکیزگی بھی کامل مثبت مردانیت میں بدل گئی۔

انسانی اور حیوانی موت میں فرق کو جاننے کے لیے ہمیں انسانی اور حیوانی زندگی میں فرق جاننا ہوگا۔ آدم کی موت جانوروں کی وراثت سے تھی اور نہ ہی جانوروں کی موت آدم کے گناہ کے سبب۔ جب تک ہم موت کا اصل مقصد نہیں پہچان لیتے ہم زندگی کا بھی مقصد نہیں پہچان سکیں گے۔ انسان گناہ کے سبب سزائے موت کے ماتحت ہے۔ وہ اس سزا کے تحت اپنی ساری زندگی جسمانی آزمائش میں گزارتا ہے۔ روح اور جسم دونوں موت کی سزا تلے ہیں۔ لہذا انسان موت کا تجربہ دوسری مخلوقات کی طرح دوہری فطرت سے نہیں بلکہ اپنے ہی سبب کرتا ہے۔

جسمانی اور روحانی موت

جسمانی موت کو دیکھنے کے لیے ساختی پہلوؤں کو دیکھنا ہوگا۔ حیوانی اور انسانی موت کے درمیان ایک یقینی متوازیت ہے، مگر یہ اس لیے ہے کہ انسان کو اسی دنیا میں کام کرنے کے لیے بنایا گیا۔ لیکن اس متوازیت میں ایک بنیادی فرق بھی ہے، کیونکہ انسان کو موت کے لیے نہیں بنایا گیا تھا۔ انسان ویسی زندگی نہیں گزارتا جیسی خدا کے ارادے میں تھی۔ اس کی صلاحیت کو ایک خاص وقت کے لیے پھر سے

محسوس کیا جائے گا۔

لہذا انسان جانتا ہے کہ اس کو مرنا ضرور ہے مگر وہ اس سوچ سے بھی نفرت کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے آخری لمحے جانور بھی اس بات سے نفرت کرتا ہے، لیکن جانوروں کو نہیں پتا ہوتا کہ مرنا ان کیلیے ضروری ہے۔ جب کوئی شکاری جنگلی جانوروں کے ریوڑ پر حملہ کرتا ہے تو ایک ساتھی کی کمی سے دوسرا جانور آگاہ ہو جاتا ہے وہ بچ نکلنے کے لیے بے قابو ہو جاتے ہیں، ان میں یہ جوش وحشت کی وجہ سے نہیں بلکہ تحریک کی وجہ سے ہوتا ہے۔ باقی ریوڑ دوڑنا بند کر دیتا ہے اور وہ اپنے چارے یا کھیل کی طرف پلٹ آتا ہے۔ ان کا ایک ساتھی پر تشدد موت جھیل چکا ہے مگر اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا اور عام حالات کے تحت شکاری اور شکار دونوں ایک دوسرے میں مزید دلچسپی نہیں لیتے۔

انھیں اس بارے میں کوئی علم نہیں کہ انھیں ملے ہوئے ایام مقرر ہیں۔ جبکہ انسان اس بارے میں سوچتا ہے اور کھوج کرتا ہے تا کہ اگر ممکن ہو تو موت کو ملتوی کر سکے۔ شعبہ طب کبھی کبھی انسان پر مشروط طوالت نافذ کرتا ہے جسے اگر جانوروں پر نافذ کیا جائے تو وہ ظالمانہ ہو گی۔ جانوروں کی موت سے یہ بظاہر مماثلت موت کی طرف انسانی رویے جیسی ہرگز نہیں۔ طبعی طور پر بیرونی اثر کے تحت دونوں طرح کی اموات کی اصطلاح ایک ہی ہے لیکن اندرونی طور پر دونوں میں واضح فرق ہے۔

کیونکہ اس کے جسم کی منزل موت نہیں، اس لیے روح و جسم کے بنیادی اتحاد کی تحلیل موثر طور پر انسان کی کلی معطلی ہے۔ موت کی طرف انسانی رویہ واضح ہے اور اس کی ایک سمت ہے جو کسی طور حیوانی دنیا کو تکلیف نہیں دیتی۔ انسان کے لیے موت ایک خوف ناک چیز ہے۔ اس کی زندگی کی تباہی ہے اور وہ تقریباً تمام زندگی اسی خوف میں گزارتا ہے۔

جانوروں کے لیے موت طبعی طور پر واقع ہوتی ہے جبکہ انسان میں یہ کلی طور پر غیر طبعی ہے۔ جب گناہ انسان کے تجربے میں داخل ہوا تو موت بھی ساتھ ہی داخل ہو گئی جو کہ ایک مکمل بیرونی عنصر تھی۔ بلاشبہ جیسے کہ مارٹن لائڈ جونز نے مشاہدہ کیا، کہ اگر یہ بات زیادہ مناسب نہیں تو مناسب ضرور ہے کہ ہم لفظ ''داخل ہوئی' کی بجائے ''حملہ آور' ہوئی استعمال کریں۔ جس بات کی طرف وہ اشارہ کرتا ہے اصل یونانی بھی اسی مضبوط فعل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

انسان میں جسم و روح آپس میں اسقدر گھلے ملے ہوئے ہیں کہ تھامس ایکوینز ان کی علیحدگی کی سوچ ''قطعی مکروہ' لکھتا ہے۔ ''جیمز اور' معاملے کو یوں بیان کرتا ہے: موت جارحانہ شکستگی یا پھاڑ کر الگ الگ کرنا ہے یعنی فطرت کے دونوں عناصر کو الگ کرنا جو کہ خالق کے ڈیزائن میں ارادۃً کبھی بھی الگ الگ کرنے کے لیے نہیں بنائے گئے تھے۔

وہ ابدیت جو انسان کے لطف اٹھانے کے لیے بنائی گئی تھی اس میں جسم ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ حقیقی ابدیت محض روح ہی کی نہیں جسم کی بھی ابدیت ہے۔ کیونکہ یہ لافانی روح کو اپنے اظہار کے لیے ایک ناگزیر اور مناسب ذریعہ مہیا کرتی ہے۔

جیمز ڈینی نے قیاس کیا اور لکھا: ''جو نچلے درجے کے جانوروں میں محض جسمانی ہو گی اس وجہ سے اگرچہ متبادل بھی جلالی تھا حتیٰ کہ اسے لفظوں میں لکھا گیا، کلام میں ظاہر ہوئے چند نامکمل فقرات میں سے ایک کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسان میں ایسی نہیں''۔ جبکہ سائنس متفقہ طور پر یہ کہتی ہے کہ انسانی جسم میں زندگی کا حصول کسی دوسرے جانور سے مختلف نہیں۔ مگر نوشتے کہتے ہیں کہ ایسا ہے۔ یہ اس لیے مختلف ہے

کہ انسانی جسم روح کا گھر ہے اور اس کی منزل بالکل مختلف ہے، یہ ایک ایسی منزل ہے جس کے لیے جسم ضروری ہے۔ موت کے وقت حیوانی جسم اپنا کام پورا کر کے ابدی آرام کرتا ہے، جبکہ انسانی جسم اپنے مقاصد پورے کرنے کا کام شروع کرتا ہے۔ ابدیت کیساتھ موازنہ کرتے ہوئے زندگی محض عارضی ہے جبکہ انسانی جسم کی اگلی ابدیت میں وقت کی کوئی حد نہیں۔ اس کی اہمیت مکمل مختلف ہے انسانی موت جسمانی سے زیادہ روحانی مرحلہ ہے کیونکہ یہ روحانی فیصلے کا نتیجہ ہے اس کے برعکس حیوانی موت کوئی عدالتی حکم ہے کیونکہ ایک گنہگار مخلوق کے لیے لامحدود جسمانی زندگی کے نتائج ناقابل تصور تھے۔ جانوروں میں موت ایک دانش مند فراہمی ہے جس کا مقصد ان کے بے قابو اور بے پایاں بڑھوتری کو روکنا ہے۔ زوال شدہ انسان میں اگر زندگی کی طوالت پر حدود نہ لگائی جاتیں تو بدی کے اجتماعی تجربات جاری رہتے، تو اسکی بدعنوان فطرت کی خوفناک کمک ہوتی۔ یہ اس لیے ضروری تھی کہ زندگی کی طوالت کے باعث دنیا اس قدر بدعنوان ہو جاتی کہ اس کے اختتام کے لیے انسان پر ''سیلاب'' لانا پڑتا۔ اس کے بعد ایک سو بیس سال کی حد عام دوران زندگی کے لیے مقرر کی گئی جو کہ کئی صدیاں پہلے تھیں۔

اسی طرح اور اسی وجہ سے یہ ضروری تھا کہ باغ عدن میں انسان کی شجر حیات تک پہنچ کو روکا جائے، تا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ وہی جسمانی ابدیت حاصل کرے جیسے اسے غیر زوال شدہ حالت میں ملی تھی۔ اس وجہ سے اگر چہ متبادل اس قدر جلالی تھا کہ اسے لفظوں میں لکھنا کلام کے چند نامکمل فقرات میں سے ایک کی طرح تھا۔ یہ بات کبھی کبھی مجھے دلچسپ لگتی اور متاثر کرتی ہے جیسے میرے عبرانی کے پروفیسر ڈاکٹر ٹی جے میک نے، جو کہ پیدائش کے دہرائے گئے معیاری ترجمے کا ذمہ دار تھا اس عدم تکمیل کو دورانیے کی بجائے لمبی ڈیش استعمال کر کے ظاہر کیا۔ اگر چہ ڈاکٹر میک خود بائبل اور اس کے پیغام پر ایمان نہیں رکھتا تھا پھر بھی بہت سے حالیہ مترجمین جو اس طرح کے ایمان کی پیش گوئی کرتے ہیں، اس فقرے کی غیر مکمل ساخت کی اہمیت کو نہیں دیکھتے۔

یہ بات جاننا بھی اہم ہے کہ اگر آدم فرمانبردار رہا ہوتا تو اسے ابدیت انعام کے طور پر نہ ملتی۔ اگر چہ وہ اشرف المخلوق تھا۔ اس کی فرمانبرداری صرف اس چیز کو محفوظ کرتی جو اس کے پاس پہلے ہی تھی۔ جب آدم نے گناہ کیا اس نے اپنی زندگی کو مختصر نہیں کیا بلکہ اس میں ایک المیہ عنصر یعنی موت، متعارف کروایا۔ یہ عنصر تب تک اس کے لیے مکمل طور پر بیرونی تھا۔

اس پر سزا نافذ نہیں کی گئی کہ اس کی زندگی مختصر ہو جائے اور وہ وقت سے پہلے مر جائے۔ بلکہ موت متعارف کروائی گئی تھی اور یہ مکمل طور پر نیا اور غیر ڈیزائن شدہ طریقہ کار تھا۔ ابدیت کا وعدہ کبھی بھی اسے انعام کے طور پر نہیں ملا بلکہ وہ اس کا مطلب پہلے سے ہی لے رہا تھا۔ مگر اس کا نقصان بلا شبہ سزا کے طور پر آدھمکا۔ صرف ایک خاص مد میں اس کی حراست ایک انعام تھی۔ لیکن یہ حراست تھی اور ابدیت کا حصول فرمانبرداری کا انعام تھا۔

اس طرح انسان جانوروں کے برعکس سادہ طور پر ختم نہیں ہوتا۔ انسان کی موت ایک جج کیساتھ تقرری کی طرح ہے، جس کے تحت اس کی زندگی سزا پاتی ہے، اس لیے موت عدالت کے بلاوے کے مساوی ہے۔ یہ بلاوا اپنے ساتھ یہ یقین دہانی لاتا ہے کہ ایمان کو بچا کر حکم عدالت جرح شروع ہونے سے پہلے صرف ایک جرم ہو سکتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی ساری زندگی موت کے پروانے کے سائے تلے

گزارتا ہے اور جب وقت آتا ہے تو اسے ختم کر دیا جاتا ہے۔ یہ وجہ موت کو نجات کے بغیر خوفناک بنا رہی ہے اس لیے یہ انسان کے لیے کسی بھی دوسری مخلوق کی موت سے بالکل مختلف ہے۔

انسانی معاملے میں ہم نے دو زندگیوں اور اموات کی بات کی ہے اور اب یہ ضروری ہے کہ کچھ الفاظ روحانی موت کے بارے میں بھی کہے جائیں۔ جسمانی طور پر انسان کو مارا جاتا ہے مگر روحانی طور پر وہ خود موت چُنتا ہے۔ روحانی موت کے معاملے میں انتخاب کی اس مشق کا مطلب موثر طور پر یہ ہے کہ انسان روحانی طور پر خودکشی کرتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم گناہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہی فطرت انسانی فطرت ہے اور یہ بات پہلے بھی لکھی جا چکی ہے کہ ہم گناہ کرتے ہیں ''جتنی جلدی ہم کر سکتے ہیں''۔

ہم اس راہ پر مرضی سے جاتے ہیں۔ ہمیں قائل نہیں کیا جاتا۔ ہمیں روحانی زندگی چننے کی دعوت دی جاتی ہے مگر ہم آفاقی اور نہ ختم ہونے والی روحانی موت چنتے ہیں۔ ایک طبعی انسان کی یہ طبعی توجہ ہے۔ اگرچہ پہلے پہل ہم آگاہ ہوتے ہیں کہ اس راستے پر نہیں جانا چاہیے اور ہمارا ضمیر ہمیں تنگ بھی کرتا ہے۔

جب ہم گناہ کرتے ہیں، ہم آزاد ہوتے ہیں۔ کلام بیان کرتا ہے کہ زوال کے بعد جو آزادی ہمارے لیے چھوڑی گئی وہ گناہ کی آزادی ہے۔ پیراشوٹ کے ذریعے آزادانہ گھومتے ہوئے ایک شخص کی طرح ہم اپنی اصل قید سے اس وقت تک آگاہ نہیں ہیں جب تک ہم اچانک کسی دوسرے راستے پر جانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہم کسی دباؤ کے بغیر گناہ نہیں کرتے، بلکہ اندرونی مجبوری کی وجہ سے گناہ کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی مجبوری ہے جو ہماری روحانی زندگی کے لیے ایک خودکشی بھی ہے۔ اس کے برعکس جسمانی موت کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ کوئی شخص صحت میں نہیں مرنا چاہتا۔ ہماری روحانی زندگی مرضی سے دست بردار ہو جاتی ہے جبکہ جسمانی زندگی ایسا کچھ نہیں کرتی ہمیں ختم کیا جا سکتا ہے، ہم غیر ارادی شکار ہیں۔ موت ہم پر واقع ہوتی ہے اور ہم پر قابو پا لیتی ہے۔ بری عادتوں سے ہم اس عمل کو تیز کر سکتے ہیں، لیکن بری عادتیں اسے تیز کرنے کے لیے ہم ارادۃً نہیں اپناتے۔ ہم تیزی کے بغیر ہی بری عادتوں سے لطف اٹھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

انسانی اور حیوانی موت میں تضاد

ہم ذاتی طور پر مرنے کا خوف کیوں رکھتے ہیں اور اس خوف کو دوسروں کی موت تک بھی پھیلاتے ہیں، حالانکہ یہ ان پر رحم کی طرح ہے کہ انھیں ایسا کرنے کی آزادی اور اجازت ہے۔ ایک وقت تھا جب میڈیکل کے لوگ صحت کو فروغ دینے یا محفوظ کرنے یعنی زندگی کو طویل کرنے کی تلاش میں تھے۔ ان کا مقصد زندگی کو سالوں میں جمع کرنا تھا نہ کہ سالوں کو زندگی میں۔

سطحی طور پر انسانی اور حیوانی موت ایک جیسی لگتی ہے تاہم ان کے جوہر اور فطرت میں ایک واضح فرق ہے۔ انسان ابدیت کی شرائط تلے زندگی گزارتے ہیں جبکہ اس کے برعکس جانور مقررہ زندگی گزارتے ہیں۔ جس سے ممکنہ طور پر وہ آگاہ نہیں ہو سکتے۔

انسان کے لیے موت کا نفاذ ایک اندھیرے سائے کی طرح اس کے شعور پر منحصر ہے جانور اس موت کے سائے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ زوال شدہ انسان اور غیر زوال شدہ جانوروں کے درمیان موت میں فرق ہے اس کے باوجود کہ دونوں کے لیے موت کسی

چیز کا اختتام ہے۔

انسان جسم سے الگ ہونے کی سوچ میں مشکل پاتا ہے۔جسم کی موت ذاتی تسلسل میں ایک رکاوٹ کا احساس ہے۔

موت پھاڑ کر الگ کرنا بھی ہے اور شناخت کے خاتمے کی صلاحیت بھی۔

مگر خدا نے ابدیت کو انسان کے دل میں قائم کیا ہے، پرانے دور ہی سے انسان اس گہرے احساس جرم کا گواہ ہے کہ وہ اپنے مُردوں کا خیال رکھتا ہے جبکہ جانور ایسا نہیں کرتے۔انسان اپنے مردے کو ارادۃً دفن کرتا ہے اور اکثر دنیا میں اس کے آرام کا خیال بھی رکھتا ہے۔اس بات سے ماہرین بشریات تقریباً عالمی طور پر متفق ہیں کہ جہاں کہیں فوسلز کو مستقبل کی زندگی کے لیے دفن پایا گیا تو معاملہ خواہ کتنا ہی سادہ اور الگ کیوں نہ ہو۔ان فوسلز کے باقیات انسانی اصناف سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

البتہ جہاں ایسا ثبوت نہیں پایا جاتا وہاں باقیات کو حقیقتاً انسانی ہی مانا جاتا ہے کیونکہ کبھی کبھار لوگ حادثاتی طور پر بھی دفن ہو جاتے ہیں۔لیکن برتنوں، مرتبانوں، رقاصوں یا کسی قسم کی خوراک خواہ وہ انتہائی ابتدائی حالت میں دفن ہو، کو عام طور سے مابعد کی زندگی کے شعور کے ثبوت کے طور پر لیا جاتا ہے۔ہمارے بنیادی ہم عصر جنہیں ماضی میں ہمارے آباء کے ہم عصروں کے طور پر دیکھا گیا ہو۔ممکنہ طور پر قبر میں ایسا ثبوت چھوڑ دیتے تھے جبکہ ہم اپنے آپ کو ان کی نسبت ترقی یافتہ تصور کرتے ہیں۔کوئی بھی جانور اپنے مردے کے لیے اس قسم کا تفکر ظاہر نہیں کرتا۔واضح طور پر موت انسانوں اور جانوروں میں بہت مختلف معاملہ ہے۔

موت کی تعریف: ارتقاء بمقابلہ مسیحیت

جانوروں کی موت کے لیے ارتقاء بہتر جواز مہیا کر سکتی ہے۔لیکن انسانی موت کے معاملے کے لیے جسے ہم دکھ اور دہشت سے تجربہ کرتے ہیں، دراصل ارتقاء کے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔یہ ایک مختلف طریقہ کار ہے اور یہ غیر طبعی ہے۔اس لیے اس کو جانوروں کی موت کے تجربے سے اخذ نہیں کیا جا سکتا ہے۔اس کا تعلق کسی دوسری درجہ بندی سے ہے اور صرف الہام ہی انسان کے لیے۔اس کے معانی پر حقیقی روشنی ڈال سکتا ہے۔

میں ان لوگوں کا انتہائی معترف ہوں جنہوں نے ارتقاء کے خلاف تخلیق کا دفاع کیا۔میں مدد نہیں کر سکتا مگر محسوس کرتا ہوں اس کام کو ارادۃً کرنے کے لیے انھوں نے اس معاملے کو مسیحی عقیدے سے الگ کر کے محض سائنسی واقعے کے طور پر کیا۔بظاہر یہ انسانی عقل مندی ہے مگر مجھے خدشہ ہے کہ یہ لادینیت میں روحانی دست برداری ہے

اس معاملے کی لڑائی اُن کی بنیادوں پر نہیں بلکہ ہماری بنیادوں پر کی گئی۔اگر اسے ان کی بنیاد پر جیت لیا جاتا اور تخلیق کی تعلیم کی اجازت دے دی جاتی تو یہ ذہانت کی فتح ہوتی، مگر یہ اپنی روحانی اہمیت کلی طور پر کھو دیتی۔تخلیق کے نظریے کو اس کی روحانی الجھاؤ سے الگ کر کے ارتقاء کے متبادل کے طور پر کبھی بھی وفاداری سے پیش نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆

غیر زوال شدہ انسان کا قربان ہو کر مرنا

یسوع مسیح کا مرنا

جانور منصوبے کے تحت طبعی طور پر مرتے ہیں۔

انسان غیر طبعی طور پر مرتا ہے یعنی اسے مارا جاتا ہے۔

خداوند یسوع مسیح اپنے ارادے سے مافوق الفطرت طریقے سے مرا۔

انسان دو طرح کی موت مرتا ہے

اس لیے اس کا نجات دہندہ بھی دو طرح کی موت مرتا ہے، پہلی روحانی موت جیسے کہ انسان مرتا ہے اور دوسری جسمانی۔ اس طرح نجات دہندہ کے لیے دونوں اموات متبادل فطرت، سبب اور اثر کے لحاظ سے منفرد ہیں۔ اگر دونوں اموات کی فطرت اور سبب نجات دہندہ اور زوال شدہ انسانوں میں ایک جیسی ہے تو وہ متبادل نہیں ہو سکتیں، کیونکہ ہمارے معاملے میں دونوں طرح کی موت ذاتی جرم کا ثبوت ہے۔ دونوں اموات علیحدگی کے افعال ہیں۔ روح کی الٰہی موجودگی سے علیحدگی یعنی روحانی موت اور روح کی جسم سے علیحدگی یعنی جسمانی موت۔

آیئے دیکھیں کہ نجات دہندہ کی دونوں اموات کو خدا کا کلام کیسے مکمل طور پر کردار اور اثر کے لحاظ سے انسان کی روحانی اور جسمانی موت جو کہ آدم کی نافرمانی کا نتیجہ ہے سے منفرد اور متضاد کرتا ہے۔

ا۔ یسوع مسیح کی روحانی موت

جب انسان گناہ کرتا ہے تو وہ اپنے انتخاب سے کرتا ہے اور اس طرح وہ روحانی خودکشی کرتا ہے۔ یہ آزادی کا عمل ہے: وہ اس کو چنتا ہے اور کرتا ہے اور اسی طرح اس کی قیمت بھی ادا کرتا ہے۔ ''جو جان گناہ کرتی ہے وہ مرے گی'' (حزقی ایل 18:4,20)۔ اس کے بعد روحانی طور پر اسے مردہ تصور کیا جاتا ہے۔ ''خطاؤں اور گناہوں کے سبب سے مردہ'' (افسیوں 2:1) وہ خدا کے لیے مردہ ہے جس کا سامنا وہ آسمانی باپ کے طور پر نہیں بلکہ اپنے منصف کے طور پر کرے گا۔ اب اس کی رسائی فوری نہیں ہے جیسے کہ پہلے تھی اور جونہی وہ اپنی زوال شدہ حالت میں بڑھتا ہے تو خدا کی موجودگی کا احساس بتدریج کم ہو جاتا ہے، اور وہ ایک قائم مقام خدا بنا لیتا ہے جو اسکی شکل کا، اس کی اہلیت کا اور اسکی فطرت کا ہوتا ہے کیونکہ وہ اسے خود ہی بناتا ہے۔

انسان نے خود کو خدا سے اور خداوند یسوع مسیح کے باپ سے بالکل الگ کر لیا ہے جیسے کہ یسعاہ 59:2 میں لکھا ہے جب تک کہ وہ اپنے نقصان سے بے توجہی اور اپنی تنہائی سے آگاہ نہیں ہو جاتا۔ پولوس اس روحانی موت کو یوں بیان کرتا ہے، ''خدا کی موجودگی سے دوری ابدی ہلاکت'' (2 تھسلنیکیوں 1:9)۔

انسان ہونے کا لمحہ اور تجربہ ''اسی نے گناہ کروایا''

یہ پوچھا جا سکتا کہ خداوند یسوع مسیح کی زندگی میں اس قسم کی موت کب نمودار ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ صلیب پر اندھیرے کے ان تین گھنٹوں میں - جیسے کہ لکھا ہے جب وہ اپنی جان کنی اور جدائی کے لیے چلایا، ''میرے خدا، میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟'' (متی 27:46 ،مرقس 15:34)۔ ہمارے گناہوں کی قربانی بنتے ہوئے اس نے اپنی ابدیت میں پہلی بار اچانک ''خدا سے دوری میں ہلاکت'' کا تجربہ کیا۔ یہ ایک ایسی ہلاکت تھی جسے وہ جانتا تھا کہ سب کے لیے حتمی ہے۔ ہماری طرح یہ اس کے اپنے انتخاب سے نہیں آئی، لیکن اس پر عائد کی گئی جب اسے گناہ گار ٹھہرایا گیا۔ جب اس پر تمام انسانی بدی جو ہابل کے قتل سے شروع ہوئی مگر اس پر خوف اور دہشت کا الزام لگا دیا گیا۔

جب یہ فیصلہ اس پر صادر کیا گیا تو قتل، تشدد، زنا، عضو کاٹنا، تذلیل، اور انسان کا انسان پر مکمل ظلم اس کی ذمے داری بن گئے۔ جب گناہ کے سبب انسان کی بیماری کے حالات اس کی جان پر ڈالے گئے تو اس نے ان کی ذمے داری لے لی، ہمارے مصائب کیساتھ وہ خود بھی مصیبت زدہ ہو گیا۔ یہ وہ پیالہ تھا جس کی پیش بینی اس نے گتسمنی میں خوف کیساتھ کی، جب وہ چلا اٹھا، ''اے باپ اگر تو چاہے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے تاہم میری نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو'' (لوقا 12:42)۔

یہاں ہم اپنے اور اس کے تجربے کے مابین پہلے بنیادی فرق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہم اپنی مرضی سے گناہ گار بن جاتے ہیں: وہ اپنی مرضی کے مکمل طور پر خلاف ہے وہ صرف اس لحاظ سے رضامند ہے کہ اس نے باپ کی مرضی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے کہ اسے یہ بوجھ اٹھانا تھا۔ گناہ کے سبب باپ سے اس کی علیحدگی کے تجربے کا ہر حوالہ ''فعل غیر مستعد' کی شکل میں اشارہ کر رہا ہے کہ وہ کام کر نہیں رہا بلکہ اس سے ہو رہا ہے۔ یہ اس پر عائد کی گئی یہ اس نے اپنی مرضی سے نہیں بلکہ تابعداری سے قبول کی۔

تو بھی اس نے ہماری مشقتیں اٹھالیں اور ہمارے غموں کو برداشت کیا۔ پر ہم نے اسے خدا کا مارا کوٹا اور ستایا ہوا سمجھا۔ حالانکہ وہ ہماری خطاؤں کے سبب سے گھائل کیا گیا اور ہماری بدکرداری کے باعث کچلا گیا۔ ہماری ہی سلامتی کے لیے اس پر سیاست ہوئی تا کہ اسکے مار کھانے سے ہم شفا پائیں۔ وہ ظلم کر کے اور فتویٰ لگا کر اسے لے گئے پر اسکے زمانہ کے لوگوں میں سے کس نے خیال کیا کہ وہ زندوں کی زمین سے کاٹ ڈالا گیا؟ میرے لوگوں کی خطاؤں کے سبب سے اس پر مار پڑی (یسعیاہ 53:4,5,80)۔ 2 کرنتھیوں 5:21 میں درج ہے کہ ہمارے لیے گناہ کا چڑھاوا بنا، یہاں بھی فعل غیر مستعد ہی استعمال ہوا ہے یہ اسی طرح چلتا ہے اور غیر مستعد ہی رہتا ہے۔ وہ کسی طور بھی ہمارے گناہوں میں ملوث نہ تھا پر اس نے انھیں ہماری خوشی کے لیے بخوشی قبول کیا۔

جب انسان اشتیاق سے گناہ میں ملوث ہو گیا تو خداوند نے اس شدید نفرت کے نظارے کا سامنا کیا۔ اور جب جرم کی چادر اچانک اس کی جان پر آ گری تو وہ ویرانے میں اپنے باپ کے سامنے نہیں، بلکہ اس راست باز خدا کے سامنے جو اس کا منصف تھا چیخ اٹھا۔ جب گناہ کے اندھیرے نے اسے اس طرح ڈھانپ لیا، ''وہ ہمارے گناہ اپنے جسم پر لیکر مصلوب ہوا'' (1 پطرس 2:24)، اس کی مایوسی کی چیخ اس کی مکمل ترک کردہ چیخ تھی بے شک، ''اگرچہ ہمارے لیے نہیں مگر وہ قطع کیا گیا'' (دانیل 9:26)، وہ زندوں کی زمین

سے کاٹ دیا گیا اور روحانی طور پر مردہ لوگوں کے درمیان گنا گیا۔

ہم اس شخص کا ذرا بھی اندازہ نہیں کر سکتے جو معصوم ہو مگر اس نے یہ تجربہ کیا ہو۔ یہ اچانک اور مکمل آلودگی تھی۔ ہم خود پہلے سے ہی گناہ گار ہیں اور جب ہم مزید گناہوں سے برائی میں اضافہ کرتے ہیں تو ہم ذرا شرم محسوس نہیں کرتے۔ کیونکہ ہم ان اثرات کے عادی ہو جاتے ہیں۔ مگر اُس (خداوند یسوع مسیح) کے لیے جرم کا یہ سبب سے پہلا ذاتی تجربہ تھا۔

اب میں جانتا ہوں کہ میری زندگی کی کوئی وضاحت یہاں درحقیقت مدد نہیں کرے گی۔ تاہم ایک بار میں نے ایک اچانک آلودگی کے اثر کا تجربہ کیا۔ اُس وقت میں نسبتاً اس لحاظ سے معصوم تھا کہ کوئی نوجوان معصوم ہو سکتا ہے اگر اسے گناہ کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ میں نہیں مانتا کہ میں نے اس وقت تک کبھی کوئی ''کبیرہ گناہ'' کیا ہو۔ میرا شعور آزاد تھا اور میں اندرونی طور پر پاکیزگی محسوس کرتا تھا۔ میں کچھ سالوں سے خدا کا بچہ تھا اور کچھ نوجوان لوگوں کیساتھ میری فعال منسٹری تھی۔ اس واقعے کے بعد بھی میں نے اسے کئی سال تک جاری رکھا۔

لیکن ایک کنسلٹنٹ انجینئر کے طور پر مجھے انتظامی سٹاف کی ایک رکن میں کشش محسوس ہوتی تھی، جہاں میں کام کر رہا تھا۔ ایک دوپہر کھانے کے وقت میں نے اپنے آپ کو عمارت کے ایک حصے میں اس لڑکی کیساتھ تنہا پایا اور نادانی کرتے ہوئے میں نے اسے بوسہ دیا۔ اس نے بالکل مزاحمت نہ کی۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بہت سے دوستوں کے نزدیک یہ ایک چھوٹی سی بات ہو گی یقیناً میری دنیا کے لوگوں کے لیے ایسا ہی ہو گا۔ لیکن میں فوراً اپنے دفتر سے اور اس عمارت سے باہر نکلا اور تیزی سے پچھلی گلیوں کی طرف چلنے لگا اور اپنے آپ کو تنہا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

یہ دوپہر کے کھانے کا وقت تھا اور مجھے بچ کر نکلنا تھا۔ میں نے اندرونی طور پر خود کو معیوب اور قطعی بیمار محسوس کیا۔ میں اپنے کیے پر پریشان تھا۔ یہ میرے محسوسات کا ایک سادہ بیان ہے۔ میں نے خود کو علیل، آلودہ اور سزاوار محسوس کیا۔

میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا کہ کس طرح شرم اور گناہ کا احساس میری روح پر پھیل گیا۔ باہر بہار کا موسم تھا مگر میرے اندر ایک سرد تکلیف دہ اور افسردہ دن تھا۔ ایسا لگتا تھا سورج چھپ گیا ہو۔ عمارات خالی اور سنسان دکھائی دیتی تھیں۔ دنیا ابر آلود اور مخالف تھی۔ میں اپنا سر اپنی چھاتی پر جھکائے شکستہ روح کیساتھ چلتا تھا۔ میں نے اس قدر بیماری محسوس کی کہ گلی میں قے کرنے لگا۔ میں حقیقتاً پریشان تھا میں نے محسوس کیا میرا مستقبل تباہ ہو گیا۔ میری نوکری خطرے میں تھی۔ ہر شخص میرے لیے شرمندہ تھا۔ مجھے شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ میں اپنا جرم کسی کو بتا سکوں، اس کا اعتراف کر سکوں اور اس پر رو سکوں۔ میں اس دن اپنی روح کی تاریکی مکمل طور پر بیان نہیں کر سکتا۔ خدا کے احساس نے بتدریج مجھ میں موجودگی ظاہر کی اور میں ایک متقی اور پاکیزہ انسان کی طرح دفتر واپس چلا گیا۔

کسی نہ کسی طرح خدا نے اپنے فضل سے اس سب کو ڈھانپ لیا۔ زوال شدہ انسانی دنیا میں اس طرح کا فعل بمشکل ہی جنبش کا باعث ہو گا۔ اگرچہ میرے لیے (میرے خیال میں) یہ کافی تباہ کن تجربہ تھا۔ یہ سب بنا پیش بندی، توقع اور منصوبے کی تیزی سے واقع ہو گیا۔ یہ ایسے تھا جیسے اچانک برف کے سے ٹھنڈے پانی میں چھلانگ لگا دی جائے۔

اگر ایک انسان جو پہلے ہی سے زوال شدہ فطرت سے پوری طرح آگاہ ہے، اس طرح کے فعل سے تباہ ہو سکتا ہے تو گناہ

کی ناپاکی کا خداوند یسوع مسیح پر کیا اثر ہوگا، جبکہ وہ لاجواب کاملیت، تخلیص اور تقدیس رکھتا تھا۔ نئی کار پر پہلی خراش، نئی کابینہ پر پہلا دھبہ اور نئی دیوار پر یا چھت پر پانی کا داغ خصوصی طور پر پریشان کن ہوتا ہے۔ جب اس پر گناہ لادا گیا تو اس کی روح پر پہلا اثر کیا ہوگا؟ جب اچانک پوری انسانی تاریخ کے شدید اور بے شمار گناہوں کا ذمے دار اور شناختی، وہ ذاتی طور پر خود بن گیا تو اثر کافی شکستہ ہوگا۔

میرے خیال میں جب ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے ہمارے گناہ اٹھا لیے تو ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ اس نے اس جرم کو شعوری طور پر اپنے دل و دماغ میں یوں لے لیا جیسے اس نے واقع یہ کام کیے ہوں۔ اس کی حساس فطرت اور اس دنیا میں اپنے اردگرد گناہ کو جانچ لینے کی صلاحیت کی وجہ سے یہ شعوری اثر لامحدود طور پر بڑھ گیا۔

کتنی دیر تک اس نے باپ سے علیحدگی کو برداشت کیا؟

جب سانس نکلی، تو باپ نے اپنے بیٹے سے منہ موڑ لیا اور اسے اندھیرے میں چھوڑ دیا۔ جب دن کی روشنی ختم ہوگئی تو اس کے ارد گرد کی دنیا غیر طبعی اندھیروں میں گھر گئی۔ مگر کتنی دیر کے لیے؟ تین گھنٹوں کے لیے؟ نہیں، یقیناً نہیں بلکہ تجرباتی ابدیت کے لیے۔ بے شک ہماری گھڑیوں نے تین گھنٹے بتائے مگر اس کے لیے وقت کا دورانیہ برداشت کی شدت کی موجودگی نے نگل لیا۔ وقت کا دورانیہ اس کی طرف سے ایک شعوری اشارہ تھا کہ اختتام نزدیک ہے، یعنی ہر چیز بے نور ہو جائے گی۔ ابدیت کے گہراؤ کے لیے کونسا تجربہ شروع ہوا۔

جیسے کہ لوتھر نے اسے اپنی صاف گوئی کیساتھ لکھا،

> مسیح سب گناہ گاروں سے بڑھ کر ملعون ٹھہرا۔ میرے گناہ اس بات کا سبب بنے کہ وہ خدا کا غصہ برداشت کرے اور لعنتی بنے تاکہ جہنم کی روحانی اذیت اور ایک تلخ موت کا تجربہ کرے... مسیح کے پاس محسوس کرنے کے لیے ایک معصوم اور نازک دل تھا۔ گناہ کے خلاف خدا کا غصہ اور فیصلہ، ہمارے لیے دوزخ کا عذاب اور ابدی موت چکھنا یعنی وہ سب برداشت کرنا جس کا ایک رد کیا ہوا گنہگار مستحق ہے، اور ان میں ہمیشہ کے لیے مبتلا ہونا ہے۔

جونتھن ایڈورڈ نے اس معاملے پر یوں لکھا، ''گناہ کی سزا لامحدود ہونی چاہیے... خدا کے جاہ و جلال کو اس کی تائید درکار ہے۔ اس کی تائید مناسب طور پر نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اس تائید کے بغیر خدا انصاف کرسکتا ہے''۔

گناہ کی تشفی مساوی گناہ کا مطالبہ کرتی ہے اور یہ سزا اس وقت تک پوری طرح سے نہیں دی جاتی جب تک باپ اپنا منہ دوبارہ اپنے پیارے بیٹے کی طرف نہیں موڑتا۔ یونانی لفظ جس کا ترجمہ ہم ''تمام ہوا'' کرتے ہیں، یہ معلوم ہوا ہے کہ قدیم یونانی زبان کی بنیاد میں اس کا واضح مطلب ''پورا قرض چکانا'' ہے۔ ''پوری ادائیگی'' کی یہ پکار فتح کی پکار تھی، جس نے اس کی روحانی موت کا اختتام کیا یہ ایک ایسا اختتام تھا جسے وہ ممکنہ طور پر اس وقت تک نہیں دیکھ سکتا تھا جب تک وہ جان کنی میں مبتلا نہ ہو۔ چونکہ کوئی اختتام بھانپ لینے کے لائق نہ تھا اس لیے اس کا موثر تجربہ ابدیت کے طور پر کیا گیا۔

یہ سب کچھ اچانک ہوگیا۔ سورج غم زدہ ہو کر چھپ گیا، باپ کی رفاقت پھر مل گئی اور اس سیاہ رات ''میرا خدا'' اس کے صلیب پر

بولے آخری لفظوں یعنی اے باپ میں اپنی روح تیرے ہاتھوں میں سونپتا ہوں کے مطابق ''میرا باپ'' بن گیا۔

''اُس'' کی اور ہماری روحانی اموات کا موازانہ:

یہ تھی وہ روحانی موت جو خداوند یسوع مسیح نے انسان ہو کر انسان کے لیے تجربہ کی۔تا کہ انسانی گناہوں سے معافی کا راستہ کھولا جا سکے۔گناہ گار سے جو کچھ پوچھا جاتا ہے اب وہ یہ ہے کہ وہ اس بات پر ایمان رکھے، اور نجات دہندہ کی روحانی موت کو کامل اور گناہوں کے لیے تسلی بخش قربانی کے طور پر قبول کرے۔

ہم نے مشاہدہ کیا ہے کی جب انسان روحانی طور پر مرتا ہے تو اس کی موت ارادی کاروائی کا براہ راست نتیجہ ہوتی ہے۔کم از کم پیش بندی میں گناہ میں چلنا خوشی کا باعث ہے۔کبھی کبھی ایسں لگتا ہے کہ گناہ گار ہونے کی تعریف یہ ہے یعنی ''ایک ایسی چیز جو خوشی دیتی ہے''۔ ہمارے خصوصی گناہ کسی بھی حالت میں واقع ہوں وہ ذاتی ترجیح کے مطابق ہر فرد میں مختلف ہوتے ہیں۔گناہ آزادی سے کیے جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو ہم اپنے آپ کو اپنی ''مرضی کے خلاف'' کرنے کے لیے قائل بھی کرتے ہیں۔ہم سب روحانی طور پر مرتے ہیں، یا یہ کہنا بہتر ہو گا کہ روحانی طور پر خود بخود تباہ ہوتے ہیں اور یہ ہمارا اپنا انتخاب ہوتا ہے۔چونکہ یہ رضا کارانہ ہے اس لیے انسان میں روحانی موت بلا شبہ خودکشی جیسی ہے۔

دوسری طرف خداوند یسوع مسیح مکمل نفرت کیساتھ ہمارے گناہوں میں ملوث ہو گیا اور اس نے زبور 139:22 کی گہرائی کو پورا کر دیا۔یہ بات اس کے لیے زیادہ خوفناک تھی کیونکہ جسمانی موت کا تجربہ عام طور سے ایک ہی بار ہوتا ہے جبکہ روحانی موت مسلسل مرنے کے برابر ہے۔

اس روحانی موت میں وہ انسان کے گناہوں کے لیے مر چکا تھا۔انسان کے گناہ کے لیے ایک موت باقی تھی۔

۲۔یسوع مسیح کی جسمانی موت:

اس کے لیے روحانی موت مکمل طور پر غیر ارادی معاملہ تھا یعنی ایک ایسی چیز، جسے دہشت آگھیرتی ہے۔یہ اس کے لیے ایک پھانسی تھی۔مگر اب سے اپنے کام کو مکمل کرنے کے لیے جسمانی موت کو بھی چکھنا تھا۔یہاں ہمارے پاس ایک مکمل تنسیخ ہے۔انسانوں کے لیے روحانی موت خودکشی کی ایک شکل ہے لیکن جسمانی موت ایک واضح پھانسی ہے۔خداوند کے لیے روحانی موت ایک واضح پھانسی تھی جبکہ جسمانی موت موثر طور پر خودکشی کی ایک شکل ہے۔یہ ہے دو آدموں میں دو طرح کی موت کا تضاد آیئے اس بیان کا ثبوت دیکھتے ہیں۔

اُس کی جسمانی موت ایک انتخاب: درحقیقت مددگار

سب سے پہلے ہمیں دماغ میں یہ بات جاننی ہے کہ اپنے اوتار کے سبب اس نے خود کو قابل مجروح بنایا اور وہ حادثاتی طور پر خدا کی اجازت سے انسانی ہاتھوں میں دیا گیا۔تاہم وہ اپنے مافوق الفطرت وجود کے باعث اس فانی عمل سے بچ نکلا جو ہم سب کو ورثے میں ملا ہے اور ہمیں ضرور ہی قبر تک لے جاتا ہے۔دراصل وہ ایسی حالت میں تھا کہ اس کے لیے عین ممکن تھا کہ وہ کبھی موت کا تجربہ نہ کرتا۔

اپنی شکل میں تبدیلی کے بعد وہ اس جلال میں جا چکا ہے جہاں وہ کبھی موت سے نہ گزرے گا اور نہ اپنی زمینی زندگی کی طرف واپس آئے گا۔ اس کی بجائے وہ اوپر سے نیچے آیا اور خاص طور پر یہ کام کیا یعنی موت کو چکھا۔

مگر نیا عہد نامہ کسی حد تک اس نظریے کی تائید کرتا ہے کہ اسکی جسمانی موت مکمل طور پر بلا دباؤ ایک مستعد انتخاب تھی۔ کیا اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ اسکی موت محض رضامندی نہیں بلکہ زندگی سے ارادی دستبرداری تھی جس میں کوئی بیرونی یا ماحولیاتی مجبوری کا عمل نہیں تھا۔ نیا عہد نامہ اس غیر معمولی حقیقت کی گواہی دیتا ہے جو بڑی حد تک کئی طرح سے بے پہچان رہی جس پر پچھلی صدی میں تبصرے ہوئے مگر ابتدائی چرچ فادران نے بلکہ چند ایک مصلحین نے بھی اسے واضح طور پر پیش کیا۔ آج اس معاملے پر تناسبی خاموشی کیوجہ یہ ہے کہ اس معاملے کو وضاحت اور قبولیت کیساتھ پیش کرنا، بنا تکلیف اٹھائے مشکل ہے اور اس سچائی کی تکلیف اٹھانا کسی حدت تک غیر واجب بھی ہے۔ سچائی کی قبولیت بڑی حد تک قاری پر چھوڑ دی گئی ہے۔

ذیل میں تین نقطہ نظر ہیں جس کی وجہ سے اسکی موت سمجھی جا سکتی ہے۔

۱۔ تاریخی حقیقت

۲۔ اخلاقی حقیقت

۳۔ الٰہی حقیت

یہ تین تصورات علیحدہ علیحدہ بیان کیے جا سکتے ہیں جس طرح کے کلام میں ان کا حوالہ ملتا ہے۔

تاریخی حقیقت:

سادہ ترین اصطلاحات میں یسوع مسیح کو مصلوب کیا گیا اور قتل کیا گیا۔ ان دو الفاظ (مصلوبیت اور قتل) کی ترتیب پر زور دینا نسبتاً غیر اہم ہے تاہم یہ بات واضح ہے کہ مصلوبیت ایک طرح کی سزائے موت تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس ترتیب سے یہ محاورہ کلام میں بہت کم پایا گیا ہے کیونکہ یہودیوں کی مشق میں رد کیے ہوئے انسان مصلوب اور قتل نہیں کیے جاتے تھے بلکہ پہلے قتل کیے جاتے اور بعد میں مصلوب کیے جاتے۔ یہودی لوگ مردے کو ذلیل کرنے کے لیے صلیب دیتے تھے نہ کہ موت دینے کے لیے۔

تصلیب عام طور سے ''کارتھیجی' ایجاد سمجھی جاتی ہے، جسے زیادہ سے زیادہ سزا کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور عظیم ترین ممکنہ ظلم سے موت حائد کی جاتی تھی۔ صلیب پر بقاء کا غیر معمولی وقت بھی ظلم کا کم عنصر نہیں تھا، جب تک کہ شکار کو موت نہ آتی اور وہ اسے جان کنی سے آزاد نہ کر دیتی۔ مردوں اور عورتوں کو نو دن تک بھی صلیب پر رکھا جاتا جب تک انھیں موت آزادی نہ دے دیتی۔ کئی واقعات میں مردوں کو اس طرح صلیب دی جاتی کہ وہ کافی دیر تک زندہ رہتے، پرندے ان کی آنکھوں میں چونچیں مارتے اور بلاشبہ وہ اپنا دفاع کرنے کے قابل نہ ہوتے۔ بلاشبہ یہ پھانسی کی دردناک قسم تھی۔

رومی اس قسم کی سزا باغیوں کے لیے یا عام لوگوں میں کم جرائم کے لیے بھی منتخب کرتے۔ لیکن فلسطین میں یہودی حکام انھیں رعایت دینے کے لیے بھی قائل کرتے۔ یعنی یہودی دن (شام 6 بجے) کے خاتمے تک شکار کو مارنے کی اجازت دی جاتی تا کہ سورج

غروب کے بعد جسم کو صلیب سے اتار لیا جائے۔ یہودی لوگوں نے تصلیب کی مشق بہت عرصے تک کی۔ پرانے عہدنامے میں اسے درخت پر لٹکانا کہتے ہیں۔ لیکن موسوی شریعت نے سورج ڈھلنے کے بعد صلیب پر جسمانی حراست کو ممنوع قرار دیا تا کہ زمین ناپاک نہ ٹھہرے۔ کئی دفعہ دن کے خاتمے سے پہلے ہی تدفین درکار ہوتی نتیجتاً شکار کی موت کو سورج غروب سے پہلے ہی یقینی بنایا جاتا۔ اس کے لیے ٹانگیں توڑنے کا ایک سادہ طریقہ استعمال کیا جاتا جس سے دم گھٹ جاتا کیونکہ تمام جسم کا وزن چھاتی اور کندھوں پر آ جاتا۔

جہاں تک ہم جانتے ہیں یہودیوں نے خود کبھی زندہ انسانوں کو صلیب نہیں دی ان کے نزدیک یہ پھانسی کی قسم نہیں تھی اگرچہ ان کے اردگرد یہ طریقہ صدیوں تک استعمال ہوتا رہا۔ رومی پیشواؤں سے پہلے اس کے مقاصد روحانی تھے یعنی مردے کی بے حرمتی۔ مراحل کی ترتیب ہمیشہ یہی رہی، یعنی پہلے قتل کرنا اور پھر صلیب دینا۔

ان کے نظریے میں اور موسوی شریعت کے مطابق ہر وہ شخص جو صلیب پر لٹکایا جاتا دو طرح سے ملعون ٹھہرتا یعنی خدا اور معاشرے دونوں کی طرف سے۔ خداوند کے معاملے میں کوئی شک نہیں کہ یہودی حکام یہ چاہتے تھے کہ عام لوگ یہ دیکھیں کہ یسوع مصلوب ہو کر خدا کی طرف سے لعنتی ٹھہرا۔ اس طرح اس نے ان کے مسیحی دعوؤں کو مسخ کر دیا۔ تصلیب کی حقیقت نے ایسے کسی بھی دعوے کو باطل کر دیا۔

لیکن ایک اور اہم وجہ بھی ہے کہ خداوند کی تصلیب کیوں ضروری تھی اور کیوں کوئی دوسری قسم کی موت اسکا مقصد پورا نہ کر سکی۔ اسے دو طرح کی موت مرنا تھا اور اسکی پھانسی کو کافی طویل ہونا تھا تا کہ وہ روکی گئی حالت میں دونوں مقاصد کو پورا کر سکے جیسے کہ کنارے کے دن دو بکرے (احبار 16 باب) دو قسم کی موت کو پورا کرنے کے لیے ہوتے تھے۔ ایک کو کہیں دور ویرانے میں بھیج دیا جاتا جو کہ صلیب پر اندھیرے کی گھڑیوں کا پیش خیمہ ہے۔ اس لیے یہ کلوری کے مقام پر دونوں چیزوں کی تکمیل کا وقت تھا یعنی نجات دہندہ کی دونوں اموات کا وقت۔ یہودیوں کی اس وقت کی موت کی سزائیں (گلا دبا کر مارنا، گردن موڑنا اور سنگسار کرنا وغیرہ تھیں) کوئی معجزہ ہی خداوند کو زندہ رکھ سکتا تھا تا کہ وہ کنارے کے دونوں کاموں کو پورا کر سکے، جبکہ انھوں نے کئی گھنٹوں تک یہ کام کیا۔ یہ ایک معجزہ ہی تھا کہ اس نے جب چاہا وہ مر گیا اور یہ محض اس لیے تھا کہ وہ صلیب دینے کے لیے روکا گیا۔ اس کی موت کی کوئی دوسری ترتیب ان چیزوں کو پورا نہیں کر سکتی تھی جس کے تحت اس کی حقیقی قربانی گناہ اور گناہوں کا چڑھاوا بن جاتی۔

اس لیے یہ تصلیب نہیں تھی جس نے حقیقتاً اس کی زندگی کا اختتام کر دیا، وہ صلیب پر مرا ضرور مگر صلیب سے نہیں۔ صلیب اس کے مرنے کا سبب نہیں موقع تھا۔ تقریباً ان سنے حالات میں وہ چھ گھنٹے کے دورانیے میں مر گیا۔ اس وقت کے مصنفین لکھتے ہیں کہ صلیب کی موت کا کم از کم دورانیہ 32 گھنٹے اور زیادہ سے زیادہ اس سے پانچ گنا تھا۔ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ اس کی تصلیب کا صوبے دار انچارج اور موت کی تصدیق کرنے والا دونوں حیران اور ناقابل یقین تھے کہ وہ اتنی جلدی مر گیا۔ وہ دونوں رومی تھے اور دونوں کو غالباً ایسے معاملات کا خاصا تجربہ ہوگا ان کے لیے یہ کافی الگ تھلگ واقع تھا۔

اخلاقی حقیقت:

اس غیر معمولی صورتحال کو نیا عہدنامہ کیسے بیان کرتا ہے؟ جزوی طور پر کلام میں اکثر متضاد بیانات کا استعمال قاری کی توجہ مبذول

کرواتا ہے۔

جب پطرس نے خداوند کی موت کے بارے اپنا پہلا خطبہ پیش کیا تو اس نے اپنے ہم عصروں کو الزام دیا کہ ''خداوند کو بے شرع لوگوں نے صلیب دیا اور قتل کیا'' (اعمال 2:23)۔ جب اس نے اپنا دوسرا خطبہ پیش کیا تو اسی جرم کے لیے دوبارہ الزام دیتے ہوئے اس نے کہا ''جسے تم نے لکڑی پر لٹکایا اور قتل کیا'' (اعمال 5:30)۔ اس مرتبہ ترتیب کا الٹنا قابل غور ہوگا۔ پہلے انھوں نے خداوند کو صلیب دی اور پھر مارا اب وہ بتاتا ہے کہ انھوں نے خداوند کو قتل کیا اور صلیب دی۔ پہلے حوالے میں وہ مراحل کی تاریخی ترتیب بتاتا ہے لیکن دوسری جگہ وہ واقعات کی اخلاقی ترتیب بتا رہا تھا جو کہ سچائی اور حقیقت کے زیادہ قریب ہے۔ فریسیوں نے بلاشبہ اسے تصلیب کے مطالبہ کردہ وقت سے پہلے ہی مار دیا وہ اس سے نفرت کرتے تھے اور ان کی نفرت نے ہی اسے مار دیا، کیونکہ نفرت قتل ہی ہے۔

اصل میں اسے صلیب دینا ان کے ذہنوں میں نہ تھا اور نہ ہی اسے موت دینا بلکہ وہ اسے ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو مرضی سے موت کے حوالے کیا اور صلیبی موت کے تصدیق کنندے نے اسے کوئی ہیرو یا شہید سمجھا ہوگا۔ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ اگر وہ صلیب پر مر گیا تو بلاشبہ وہ دغاباز ثابت ہوگا اور اس کو عدالت میں لانا ان کے لیے اعزاز ہوگا۔

پطرس کی الفاظ کی تبدیلی ''مصلوب کیا اور قتل کیا'' کو کچھ تراجم نے جیسے کہ کنگ جیمز کا ترجمہ وضاحت کیساتھ پیش کیا ہے۔ اس کا ترجمہ یوں ہے، ''جسے تم نے تصلیب کے ذریعے قتل کیا'' اس طرح پہلے اور دوسرے خطبے میں موافقت ہے۔ یہ ایک ممکنہ انجام دہی ہے مگر یہ اس سے متضاد ہے جو ہم یہودیوں کے تصلیب کے رویے کے بارے میں جانتے ہیں۔ انھوں نے صلیب دیکر قتل نہیں کیا۔

ترتیب کی اس واپسی کا مشاہدہ اعمال 10:39 میں بھی کیا گیا ہے۔ یہاں پطرس نے دوبارہ اپنے پہلے خطبے میں تضاد پیدا کیا اور موت کو تصلیب سے پہلے رکھا۔ موت کو تصلیب سے پہلے جگہ دینا کلام پاک میں ایسے مراحل کی تصدیق کرنا ہے۔ پطرس کی سماعت میں خداوند نے خود کہا تھا کہ وہ اسے ''ماریں گے اور صلیب دیں گے'' (متی 23:34) ان سب باتوں سے جو میں سمجھا ہوں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اس معاملے میں پطرس کی تفہیم کافی تیز تھی کیونکہ بعد میں اس نے خداوند کے کچھ خصوصی بیانات پر غور کیا۔ خداوند نے کہا کی کوئی شخص اِس سے، اِس کی جان نہیں لے سکتا، مگر وہ خود اسے دینے جا رہا ہے۔ اب ہم تصلیب کے تیسرے پہلو کیطرف آتے ہیں۔

الٰہی حقیقت:

متی، مرقس اور لوقا مراحل کی ترتیب کو بہت کم الٰہی تبصرے سے پیش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے یوحنا کی انجیل بالکل مختلف ہے، یہاں ہمیں خداوند یسوع کے الفاظ یوں ملتے ہیں۔

میں بھیڑوں کے لیے اپنی جان دیتا ہوں... اس لیے میرا باپ مجھ سے محبت کرتا ہے کیونکہ میں جان دیتا ہوں جسے میں پھر لے لوں گا۔ کوئی شخص اسے مجھ سے نہیں لیتا بلکہ اسے میں خود ہی دیتا ہوں۔ میں اسے دینے کی طاقت بھی رکھتا ہوں اور پھر اسے واپس لینے کی بھی۔ یہ حکم میرے باپ سے مجھے ملا۔

زبان کا مطالعہ کرنے والے کسی بھی شخص کے لیے ان آیات کا یونانی متن انتہائی واضح، مفصل، سادہ اور خوبصورت مشق مہیا کرے

گا۔اس کے بارے میں ایک اہم چیز الفاظ کا تکرار ہے یعنی،''میں اپنی جان دیتا ہوں''۔یہ فقرہ آیت 15 اور 17 اور دو بار 18 میں آتا ہے۔یہ بات مشکوک ہوتی اگر اس نے کبھی اپنے شاگردوں سے کوئی بات زیادہ زور دیکر کہی ہوتی،مگر وہ صرف سادہ لفظوں میں یہ کہتا ہے،''میں اپنی جان خود ہی دیتا ہوں۔''

جونہی میں ان الفاظ کو پڑھتا ہوں میں یہ دیکھتا ہوں کہ خداوند اپنے شاگردوں کو یہ کہہ کر متاثر کر رہا ہے کہ اس کہ زندگی اس سے لی نہیں جارہی اگر چہ وہ مرنے جارہا ہے۔یہ اس کا فعل ہے وہ دوسرے انسانوں کی طرح مجبوری کے تحت نہیں مرے گا۔نہ ہی وہ اس وقت کو چنے گا کہ وہ دوسرے لوگوں کو اجازت دے کہ وہ اسے موت دے دیں۔حالات سے قطع نظر سادہ ترین ممکنہ اصطلاحات میں مرنے کا عمل اس کا اپنا انتخاب ہوگا۔

جب یوحنا اپنی انجیل میں خداوند کی موت لکھنے لگا،تو اس نے ایک لفظ استعمال کیا جو قدیم یونانی بائبل میں کبھی کسی شخص کی موت کے لیے استعمال نہیں ہوا۔یوحنا 19:30 میں ہمارے پاس یہ الفاظ ہیں:''جب یسوع نے سرکہ وصول کیا اس نے کہا تمام ہوا''اور اس نے اپنا سر جھکایا اور جان دے دی''۔

کوئی اس سے یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس نے حالات کے دباؤ تلے اپنی جان دے دی،جیسا کہ عنینیاہ اور سفیرا دونوں نے کہا کہ''اپنی جانیں مہیا کیں''۔لیکن''دے دی'کے لیے یونانی لفظ جو یوحنا اس حوالے میں استعمال کرتا ہے خاتمے کے لیے کوئی عام لفظ ہرگز نہیں ہے۔یہ لفظ Paradidomi ہے جس کا مطلب دستبردار ہونا نہیں بلکہ برخاست کرنا ہے۔اس کے برعکس دوسرے اناجیلی مصنفین متی،مرقس اور لوقا نے وہ لفظ استعمال کیے ہیں جو عام طور پر انسان کے گزرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔پطرس نے بھی اعمال میں ایسا ہی کیا ہے۔پولوس اس لفظ (Paradidomi) کو انتہائی اہم موقعوں پر خداوند یسوع مسیح کی موت کی بات کرتے ہوئے استعمال کرتا ہے۔

جب خداوند نے کہا کہ وہ اپنی جان دینے کا اختیار رکھتا ہے،تو اس نے اپنی بات آگے پہنچادی،اور کہا''میں اسے پھر واپس لینے کا اختیار بھی رکھتا ہوں۔یہ واضح کر دیتا ہے کہ جب کوئی شخص خودکشی کرتا ہے تو وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ وہ اسے پھر لینے کا اختیار نہیں رکھتا''۔

خداوند کے پاس یہ دونوں اختیار تھے یعنی دینے کا بھی اور لینے کا بھی۔اگر ہم معاملے کو ذرا مختلف طریقے سے دیکھیں تو وہ دونوں طرح سے اس عمل کا مکمل انچارج ہے۔اس نے اپنی مرضی سے اپنی زندگی برخاست کی اور اپنی مرضی سے ہی اسے بعد میں واپس لے لیا۔

اپنی زندگی پر مکمل اختیار کی اس مشق میں اس نے اپنی زندگی اس طرح سے نہیں دی جیسے دوسرے لوگ دیتے ہیں۔اس نے اسے ارادۃً برخاست کیا اور اس کی اپنے جسم کی زندگی سے موت میں تبدیلی اسقدر فوری تھی کہ مورخ حیران رہ گیا۔

حیرانی کی بات نہیں،اس لیے کہ یہ ایسا شخص تھا جس کے پاس اختیار تھا جو یہ حکم دے سکتا تھا''جاؤ!اور وہ جاتا تھا''۔جس نے اچانک محسوس کیا کہ وہ اتنا طاقتور ہے کہ وہ اپنی روح سے بھی''جانے'کو کہے تو وہ بھی اس کی فوراً تابعداری کرے۔اس طرح یہ شخص ایک منفرد انداز میں مرا۔نہ ہی کسی حاکم کے بلاوے سے اور نہ ہی تابعداری سے بلکہ اپنے ہی حکم سے۔وہ فاتح ہوا اور چلا اٹھا''سب کچھ پورا کیا

گیا''اس نے اپنی روح اپنے باپ کے ہاتھوں سونپ دی اور اپنی مرضی سے ''شمع بجھا دی''۔ جب وقت آیا تو یہ سب کچھ منٹوں میں ہو گیا۔

جو کام اس کے باپ نے اسے دیا اس نے جزوی طور پر ابدیت میں اور حتمی طور پر مقررہ وقت میں مکمل کر دیا۔

اِس منفرد موت کو ابتدائی مبصرین نے بھی نوٹ کیا

تاریخی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یسوع کو مصلوب کیا گیا اور مار دیا گیا۔ اخلاقی نکتہ نظر سے انہوں نے اُسے اپنی نفرت سے مارا اور اس بات پر صلیب کی مہر کر دی۔ مذہبی طور پر صلیب ایک مرحلہ تھا جہاں خداوند رضا کارانہ طور پر اپنا ہی مارنے والا بن گیا۔ تصلیب کے یہ پہلو جن پر جدید مبصرین نے بہت کم بات کی ہے، ابتدائی وقتوں سے ہی پہچان لیے گئے تھے۔

طرطولین (C.160-C.215) نے لکھا کہ جب مسیح کو صلیب دی گئی ''اس نے اپنی مرضی سے جلاد کا کام کرتے ہوئے اپنے ہی الفاظ سے اپنی روح کو برخاست کیا''۔ دو سال بعد اولمپس کے بشپ میتھو ڈیس نے مشاہدہ کیا ''مسیح نے وہ موت چنی جس کا وہ موضوع نہ تھا اور وہ اسے ان کو دے سکتا تھا جو موت کے ہاتھوں بندھے ہوئے ہیں''۔

1886ء میں الفریڈ ایڈرشیم نے اس معاملے کو یوں لکھا ''اس کی موت اور اس کا جی اٹھنا، کوئی اسکے برعکس سوچ نہیں سکتا کہ یہ اس کا اپنا عمل تھا۔ وہ دونوں طرح سے اختیار رکھتا تھا، اور یہ دونوں ہی رضا کارانہ تھے۔ انسانی فعل بھی اور الٰہی فعل بھی''۔ 1895ء میں جیمز ڈینی نے کچھ شدت سے یوں لکھا:

> اگر موت مسیح کے لیے بھی باقاعدہ وہی مسئلہ ہوتا جو ہمارے لیے ہے تو پھر نیا عہد نامہ جس طرح موت کی بات کرتا ہے بالکل ناقابل فہم ہے۔ ابتدائی مسیحی یہ سوچتے تھے کہ کلام کے ہر صفحے میں جو فقرات ہم پاتے ہیں وہ کبھی اترے ہی نہیں۔ لیکن ان کا یہ ذہن نہیں تھا، وہ مانتے تھے کہ مسیح معصوم تھا اس لیے اس کی موت ہی اس کی صلاحیت تھی اور اس کی ایک منفرد حیثیت تھی۔ اس کی موت الگ طریقے کی تھی جو اس پوری کائنات میں اپنی قسم کی ایک ہی ہے۔ ایک معصوم موت جو گناہ کے گنبد کے حوالے کی گئی۔ یقیناً یہ وہی موت تھی جس کے لیے وہ آیا تھا۔ لیکن یہ اس کی موت نہیں بلکہ ہمارے لیے موت تھی کیونکہ اس نے بھی تو کبھی گناہ نہ کیا تھا۔ وہ خود کے لیے نہیں مرا تھا۔

پچاس سال بعد جان مرے نے وہ لکھا جو ہم آج کہہ رہے ہیں۔

> خداوند کی موت جس طرح وہ مرا منفرد تھی۔ کوئی دوسرا اس طرح نہیں مرا جیسے وہ مرا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سب دوسرے لوگ یوں مرتے ہیں کہ طاقتیں ان سے زندگی چھین لیتی ہیں اور روح و بدن کے اجتماع کو قطع کر دیتی ہیں۔ یسوع ملعون صلیب پر یوں نہ تھا، بے شک اسے دوسروں نے مصلوب کیا اُس نے خود ہی خود کو مصلوب نہیں کیا، لیکن جب وہ مرا اُس نے اپنی روح کو معطل کیا اور اپنی جان دے دی۔

اپنے عمل کی مشق اور اپنے اختیار کے ذریعے اس نے ملانے کی خدمت پیش کی۔

اس کی اور ہماری موت کے درمیان فرق کو مختصر اور متضاد بیانات کے سلسلے کے ذریعے واضح کیا جا سکتا ہے۔ اسے کلام مقدس سے حقیقی لفظوں یا واضح لفظوں میں نکالا گیا ہے۔ اسے انتہائی سادگی سے یوں مرتب کیا گیا ہے۔

ہم موت کے ماتحت ہیں ------------ وہ بھی موت کا ماتحت بن گیا

ہم موت کے آگے عاجز ہیں ------------ اس نے خود کو عاجز کر لیا

پولوس کی طرح ہم پیش کیے جاتے ہیں ------------ اس نے خود کو پیش کیا

ہم موت کے آگے دست بردار ہیں ------------ اس نے اسے گلے لگا لیا

ہم روح کو چھوڑتے ہیں ------------ اس نے اسے معطل کیا

ہم مرنے کا وقت چن سکتے ہیں ------------ اس نے موت کو چنا

ہم اپنی زندگیوں کو صرف مختصر کر سکتے ہیں ------ اس نے مرضی سے اپنی زندگی معطل کی تا کہ اسے دوبارہ لے سکے

کچھ مردوں میں سے زندہ کیے گئے ہیں ------------ وہ خود جی اٹھا

ہماری موت ست ہے ------------ اسکی موت چست ہے

ہم موت میں مبتلا ہوتے ہیں ------------ اس نے اپنی موت کو حکم دیا

وہ صلیب سے نہیں بلکہ صلیب پر مرا۔
ہوسکتا ہے وہ شکستہ دل کیساتھ مرا ہو،
مگر اس وجہ سے نہیں مرا۔

یہ سب باتیں ممکن بھی تھیں اور بامعنی بھی۔ آگسٹن لکھتا ہے ''مرنا اس کے لیے ناممکن نہ تھا مگر نہ مرنا اس کے لیے ناممکن تھا''۔ اس کی زندگی کی یہ شرائط کسی طرح بھی اس کی حقیقی انسانی فطرت کو نااہل نہیں کرتیں کیونکہ یہی شرائط آدم پر بھی لاگو ہوتیں تھیں۔

ایک مددگار، متبادل اور وافر قربانی

خداوند یسوع مسیح کے معجزاتی حمل کا مطلب اسے آدم کی نافرمانی کے نتائج یعنی جسمانی فنا کی وراثت سے بچانا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو خداوند کی موت کسی طرح مددگار نہ ہوتی بلکہ صرف وقت سے پہلے کی موت ہوتی۔

کچھ لوگوں کی تجویز ہے کہ وہ محض کوئی پہلا مسیحی شہید ہوگا۔ لیکن اس کی جسمانی ابدیت کی صلاحیت تصدیق کرتی ہے کہ اس کی موت قائم مقام تھی۔ اگر چہ اس کا جسم حقیقتاً انسانوں جیسا تھا اور وہ انسان کا حقیقی نمائندہ اور آخری آدم تھا۔ یہاں عیب اور اثر کا ایک دائرہ ہے جسے توڑا نہیں جا سکتا اور مسیحی عقیدے کا نامیاتی اتحاد تنقیدی طور پر اس میں ملوث ہے۔

مزید برآں وہ محض انسان نہیں بلکہ خدا کا بنایا ہوا انسان تھا۔ جہاں متوازن تلافی کے اصول پر ایک آدمی دوسرے کے لیے مر سکتا تھا وہاں وہ اکیلا تھا بجز یہ کہ وہ کتنا کامل تھا۔ وہ ایک سے زیادہ انسانوں کا متبادل نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف انسان سے بڑھ کر ایسا انسان ہونا جیسا کوئی دوسرا نہ ہو، اسے وہ میرے گناہوں کی بلکہ کسی بھی شخص کے گناہوں کی وافر قربانی بن سکتا تھا۔

ایک ہی وقت میں پہلے آدم نے نہ صرف جسمانی ابدیت کا مزہ لیا بلکہ اس میں ''حقیقی راست بازی'' بھی تھی جس کا مطلب حقیقی اخلاق آزادی ہے۔ پہلے آدم کو نہ گناہ کرنے کی ضرورت تھی اور نہ مرنے کی۔ اس طرح آخری آدم حقیقی انسان تھا اگرچہ اس نے کبھی گناہ نہ کیا۔

ان باتوں کے علاوہ آدم میں اخلاقی محاسبے کی سوجھ بوجھ بھی تھی جس نے اسے ایک منفرد مخلوق بنا دیا کیونکہ وہ خدا سے بھی آگاہ تھا اور حکم عدالت اور گناہ کی فطرت کو پہچاننے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔

ان بنیادوں پر ایک صنف بنائی گئی جس کا ہر رکن شفاعت اور نجات کے ادراک کے قابل ہے کیونکہ یہ اس پر لاگو ہوتی ہے۔ انسان ایسی مخلوق ہے جو فضل کے وسیلہ سے اپنی نجات کو پہچاننے کے قابل ہے اور بچانے والے ضروری ایمان کو کام میں لا کر زوال کی حالت میں اسے گلے لگا سکتی ہے۔

بائبل کی تاریخ کا یہ مذہبی پہلو کہ دونوں آدموں کی بنیاد اور موت کیساتھ کیا ہوا، کو عقلی طور پر ارتقائی دنیا کے اسی نظریے میں جو وہ انسان پر نافذ کرتا ہے، مرکب نہیں کیا جا سکتا۔

یہ حقیقت ہے کہ عمل شفاعت کا کسی فرد پر تضاد انسان کی روحانی فطرت پر منحصر ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ انسانی نجات کا انداز اس کے جسم کی فطرت پر منحصر ہے، کیونکہ یہ جسم بنیادی طور پر وہ جسم ہے جس میں خدا کا بیٹا انسان بن کر اپنی متبادل موت کے ذریعے انسان کی شفاعت کے لیے آیا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی الٰہی فطرت سے بھی دست بردار نہ ہوا۔ مختصر یہ کہ انسان کی ضرورت کے احساس کی بنیاد اس کی روح کی منفرد خصوصیات میں ہے اور اس کا قابل شفاعت ہونا اس کے جسم کی منفرد خصوصیات پر ہے۔

ارتقاء اور شفاعت متضاد ہیں

انسان پر لاگو ہونے والا نظریہ ارتقاء منصوبہ نجات کو تباہ کر دیتا ہے۔ ایک ماہر ارتقاء کرٹلی الیف ماتھر نے مضامین کی ایک جلد مرتب کی جس کی تدوین ہارلو شیپلے نے کی۔ اس کا عنوان تھا ''سائنس مذہب پر غور و فکر کرتی ہے'' ایک مضمون میں وہ لکھتا ہے ''جب کوئی ماہر علم الٰہی یہ مان لیتا ہے کہ ارتقاء وہ عمل ہے جسے خود خالق نے استعمال کیا تو وہ ہر طرح سے اس کے ساتھ جانے پر راضی ہو جاتا ہے'' میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ عقلی طور منصوبہ نجات سے جڑا ہوا کوئی شخص نظریہ ارتقاء کو قبول نہیں کر سکتا۔ مقدسین کی امید زمانوں کیساتھ کم ہو گئی۔

اندرونی ساخت کے جوہر میں ارتقائی قیاسات شفاعت کی علمیت کو للکارتے ہیں کسی دو کی تسلی بخش ''شادی'' منطقی طور پر ناممکن ہے۔ شعوری طور پر منصوبہ نجات مکمل طور پر متوازن بحالی کے تصور پر مبنی ہے یعنی آنکھ کے لیے آنکھ، دانت کے لیے دانت اور انسانی زندگی کے لیے انسانی زندگی۔ یہ سادہ حقیقت بائبل کے علم کی بنیاد پر ہے۔

ایچ بی ویلز صحیح تھا جب اس نے 1920ء میں لکھا:

> اگر تمام جانور اور انسان کسی غالب انداز میں سلجھائے جاتے، تو نہ کوئی پہلے والدین ہوتے، نہ عدن ہوتا اور نہ ہی زوال۔ اگر آدم کو گرایا نہ جاتا تو مسیحیت کی مکمل تاریخی شکل پہلے گناہ کی کہانی، کفارے کا سبب جس پر حالیہ تعلیمات کی بنیاد ہے، مسیحی جذبہ اور اخلاقیات سب کچھ تاش کے گھر کی طرح ڈھیر ہو جاتا۔

یہ ایک ایسے انسان کی ترغیب تھی جس کے عقائد مسیحی نہ ہوں مگر وہ مسیحی عقائد رکھنے والے لوگوں سے زیادہ ادراک رکھتا ہو۔ جیمز اور نے بھی اسی طرح کا مشاہدہ کیا۔

> میرے خیال میں اس بات پر زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا کہ مسیحی سچائی ایک نامیاتی کل بناتی ہے اور یہ ایک ربط اور اتحاد رکھتی ہے، جسے زخمی کئے بنا ظالمانہ انداز سے اس کو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ مباحثے کے طور پر کوئی دستاویز کوئی ایسا ثبوت دے جو اس جاندار کے لیے ناگزیر ہو، تو ہمارے پاس ''اس کی تصحیح'' مضبوط ترین ثبوتوں میں سے ایک ہوگا۔

جیسا کہ آخری باب میں دیکھا جائے گا کہ یہ ایک انتہائی قابل رحم بات ہے کہ ایمان کے دیگر زور آوروں سے اس امتحان کو مادے کے بارے میں اپنی سوچ پر لاگو نہیں کیا۔ بہت سے خدا پرست مسیحی جو آج تخلیق کی جگہ ارتقاء کو اختیار کر چکے ہیں کے لیے، ان کے وسیع ایمان کے نتائج کو غیر ارادی طور پر پھیلانے کے لیے ایک مسئلہ موجود ہے۔ وہ صرف تخلیق کے لئے ارتقاء کے متبادل کے ساتھ رہتے ہیں کیونکہ ان کا علم حیاتیات اکثر گہرا ہوتا ہے جبکہ مسیحی ایمان کے نامیاتی اتحاد کی تفہیم مناسب طور کام نہیں کرتی۔ وہ اس کی منطقی ساخت کی حقیقی فطرت سے بے خبر ہوتے ہیں اس لئے موافقت ناممکن ہوتی ہے۔

انسان کا گناہ اور خداوند یسوع مسیح کی موت سوائے ایک دوسرے کی روشنی کے دونوں ہی جواب دہ نہیں ہیں۔ ارتقاء ان دونوں کا جواب نہیں دے سکتی۔ انسان کی شہوت پرستی، ہوش کی سی نہیں ہے، اور خداوند کی موت منفرد اور مافوق الفطرت تھی۔ جانور کی جارحیت طبعی ہے اور انسان کی غیر طبعی۔ حیوانی موت چونکہ طے شدہ ہے اس لئے طبعی ہے اور انسان کی موت چونکہ سزا ہے اس لئے غیر طبعی ہے۔ خداوند کی زندگی اور موت کی پاکیزگی کی وضاحت مافوق الفطرت ہے۔

☆☆☆

موت کی موت

ایک انسان جس نے خود کو مردوں میں سے زندہ کیا

''ایک اور صورت میں'' مرقس 16:12

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ابتدائی کلیسا صلیب کی نسبت جی اٹھنے کو منانے کے لیے زیادہ متفکر تھی۔ وہ جی اٹھنے کی وضاحتیں آغاز ہی سے روم کی گلیوں اور مکانوں کے تلے تہ خانوں کی دیواروں پر اور قبروں پر لکھتے تھے۔ اس کے برعکس صلیب کا نشان ان میں خیر موجود تھا۔ اور ایسے مانا جاتا ہے کہ سب سے پہلا معاملہ زائر کے ذریعے بہت بعد میں واقعہ ہوا۔

کینتھر کلارک نے مشاہدہ کیا کہ ابتدائی تصاویر میں بھی صلیب کو باشکل ہی پیش کیا گیا اور جب ایسا ہوا تو اسے ان تخلیقی کاموں میں مرکزی جگہ پر لینے کی بجائے کونے میں چڑھا دیا گیا۔ پانچویں صدی تک ایسا نہیں ہوا کہ مسیح کی تصویر دو چوروں کے درمیان صلیب پر بنائی گئی ہو۔

ایسا لگتا ہے کہ تصلیب کی نسبت جی اٹھنے پر زیادہ تبلیغ کی گئی۔ ایک حقیقت ذرا حیران کن ہے کہ جدید دور میں خداوند کے جی اٹھنے کی نسبت اس کی موت پر زور ہے ولیم بارکلے کے تبصرے انتہائی مقبول ہیں مگر نوشتوں کی طرف اس کا رویہ قدامت پسندی سے دور ہے۔ وہ کھلم کھلا کہتا ہے کہ مجھے مسیحی عقیدے میں کنواری سے پیدائش کی کوئی اہم جگہ نظر نہیں آتی مگر وہ جی اٹھنے کو پر اسرار سمجھتا ہے۔

اس باب میں تفہیم کی غرض سے ظاہراً میں جی اٹھنے پر بات نہیں کر سکتا، میرا مقصد صرف ان چار انجیل نویسوں کے واقعات اور بیانات پر توجہ مبذول کروانا ہے جن پر اس کتاب کے مرکزی خیال کی بنیاد ہے۔ جس بات کی طرف میں دھیان دلانا چاہتا ہوں وہ آدم کی فطرت کے متعلق بائبل کی وتاریخ ہے جس کا مطلب اگر وہی لیا جائے جو روائتی طور پر لیا جاتا رہا ہے، یا پھر منصوبہ نجات کا منطقی ربط جس میں خداوند کے جی اٹھنے کا اعلیٰ مقام ہے تو یہ ربط ٹوٹ جاتا ہے۔

مسیح کے جی اٹھے جسم پر بائبل کا مواد

چاروں اناجیل کی طرف سے خداوند کے جسمانی طور پر جی اٹھنے کی واقعاتی تفصیل انتہائی اہم ہے۔

چونکہ ہمارے جی اٹھے اجسام خداوند کی طرح مُر سے سجائے جائیں گے اور وہ ہماری جنت میں ذاتی شناخت کا اہم حصہ ہونگے، تو یہ بات عجیب لگتی ہے کہ منبر پر ہمیں اس بارے میں سننے کو بہت کم ملتا ہے۔ آخر کار ہم ان میں ابدی زندگی گزاریں گے!

میں اس باب میں جس بات پر بحث کرنا چاہتا ہوں وہ میرا خداوند کے جسم کے متعلق کچھ تفصیل پر ایمان ہے جو تین حالتوں میں نمودار ہوتی ہیں۔

(ا) جیسے کہ وہ قبر میں لیٹا ہوا تھا

(۲) جیسے کہ وہ جی اٹھنے کی صبح فوراً جی اٹھا

(۳) جیسے کہ کچھ ہی دیر بعد وہ الٰہی ہستی کے ظہور کے لیے تبدیل ہیئت میں آ گیا اور کچھ بالکل نئی اور حیران کن خصلتیں حاصل کر لیں جنہیں ہم بھی اپنے جی اٹھے ہوئے اجسام میں حاصل کر لیں گے۔

جی اٹھنے کی صبح اور چالیس دن بعد خداوند کے آسمان پر جانے کے دوران ان حالات میں بتدریج تبدیلی جس کے بنیادی حقائق نیا عہدنامہ فراہم کرتا ہے، کو جان لیے سے ایک خاص مرحلہ قائم کرنے میں مدد ملے گی۔

۱۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ تاریخ کے منفرد حالات میں اس نے خود کو زندہ کر لیا۔

۲۔ لیکن ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ایک فرشتے نے نہ کہ خداوند نے قبر کا منہ بند کرنے والے پتھر کو ہٹایا۔ شاید یہ پہلے پہل کی جسمانی حدود تھیں کہ وہ اس جسم کیساتھ کیا کر سکتا ہے۔

۳۔ وہ جسم جس کیساتھ وہ سب سے پہلے مریم مگدلینی پر ظاہر ہوا وہی جسم تھا جو تین دن پہلے قبر میں رکھا گیا۔

۴۔ اس کے برعکس کے ان حالات میں کیا توقع ہوگی، وہ جسم جو تین دن تک دفن رہا، اس میں کوئی سڑاہٹ آئی تھی؟

۵۔ مریم پر پہلے ظہور اور مریم اور دیگر لوگوں پر دوسرے ظہور کے دوران ایک قسم کی تبدیلی اس کے جسم میں آ گئی اس تبدیلی نے اس کے جسم کو بالکل نئی خوبیاں وقف کیں مگر بلاشبہ اس نے اپنی شناخت نہیں کھوئی۔ یہ ابھی تک اسی کا ہی جسم تھا۔

۶۔ خداوند کے دوران ظہور کے درمیانی وقفے میں جو تبدیلی واقع ہوئی اسے کلام کے پیروں سے تیزی سے قیاس کیا جا سکتا ہے۔ مگر ایسا تب ہوگا جب مجوزہ توضیح کی اجازت ہو اور نمبر ۲ اور نمبر ۳ اس پر روشنی ڈالیں۔

۷۔ اس بات کی بھی اہمیت ہے کہ پہلے ارادۂ خداوند نے خود کو چھونے سے محفوظ رکھا اور پھر اس کی دعوت بلکہ حکم دیا۔ اس کا تجزیہ عبرانیوں کے کچھ بیانات سے کیا جا سکتا ہے جو عموماً ظاہری تضاد کے متعلق نہیں ہیں۔

۸۔ جی اٹھے انسانی جسم کی غیر معمولی نئی خوبیوں کی اہمیت پھر تلاش کی گئی کیونکہ ان کا تعلق ہمارے مستقبل سے ہے وہ تجویز کرتے ہیں کہ ہمارے اجسام اور اس لئے ہم بھی ایک نئی قسم کی آزادی کا مزہ لیں گے۔ ہم بھی الٰہی شناخت کی موجودہ حدود کو ختم کر کے پورے طور سے غیر مساوی طریقے سے بحال کر کے ابدیت حاصل کر لیں گے۔ یہ نظارہ حیران کن ہوگا اور انسانی جسم کی اہمیت شاندار طریقے سے نمایاں کی گئی ہے۔ جسم کی یہ صلاحیت نجات یافتہ روح کو مستعدی اور پر اثر طریقے سے وعدہ کیے گئے نئے آسمان اور نئی زمین میں پیش کرے گی جو بہت نزدیک اور لامتناہی لگتی ہے۔

میں اچھی طرح سے آگاہ ہوں کہ جی اٹھنے کے بارے میں بائبل کے اندراجات بہت سوں کے لیے موافقت سے دور اور تضاد سے بھرپور ہیں۔ کوئی بیوقوف ہی ہوگا جو یہ سمجھے گا کہ دوسروں کے عالمی طور پر مسلمہ تجزیے کے بعد اس کے پاس کوئی حتمی چال ہے۔ ان اندراجات میں تفاصیل کا جو سلسلہ مہیا کیا گیا وہ مجھے ایک مقصد کی طرف بتدریج آگے بڑھاتا ہے۔

یہ ترقی خداوند کے جسم میں آئی ایک اہم تبدیلی کو پیش کرتی ہے جو اس کے مریم مگدلینی پر پہلے ظہور اور پھر کوہِ زیتون سے آسمان پر

چلے جانے کے دوران واقع ہوئی۔ اس واقعے سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تبدیلی فوراً کیوں نہ تجویز کی گئی۔

''یہ بتدریج بڑھتا ہوا الہام'' نہ مادی طور پر متاثر ہوا اور نہ ہی لوگوں کے شکوک سے کہ کس نے دیکھا کہ یہ واقعات کس ترتیب سے نمودار ہوئے۔ میں یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ درج ذیل خلاصے کا بیان ان لوگوں کے لیے جو خدا کے کلام کو غلطیوں سے مبرا سمجھتے ہیں غیر متنازعہ ہوگا۔ اس کی بجائے کوئی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ لفظوں کا استعمال متاثر ہوا ہوگا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ بڑی حد تک ذمہ داری پر منحصر ہے۔ مختصر یہ کہ یہ محض دلچسپی کے واقعات نہ تھے بلکہ انہیں خداوند کے جی اٹھے جسم کی سچائی، جس کی بہت اہمیت ہے، کے ابلاغ کے لیے مرتب کیا گیا تھا، اور یہ شاید کسی اور طرح واضح نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہاں ہمارے پاس نمونہ ہے جس کے بعد ہمارے اجسام کو بھی سجایا جائے گا۔ اگرچہ یہ کام خداوند کی طرح بتدریج نہیں ہوگا۔

میں اس خلاصے کو سوالات کی شکل میں رکھوں گا۔ ان میں سے ہر ایک خصوصی حالات کا حوالہ دے گا، جن کی اہمیت نے پہلے شاید قاری کو نہ چونکایا ہو۔

اختصار کے پیش نظر مجھے یہ قبول کرنا پڑتا ہے کہ قاری ان تیز تر واقعات کے تفصیل سے کم و بیش واقف ہے۔ ان خاص تفاصیل کا عمومی پس منظر ہر سوال کا مرکزی نکتہ مرتب کرے گا۔

a)۔ فرشتے کے لیے پتھر کو لڑھکانا کیوں ضروری تھا (متی 28:2) خداوند اس کے بیچ سے کیوں نہ گزر گیا؟ یا پھر اس نے اپنے جی اٹھنے کی قوت کو استعمال کرتے ہوئے اسے خود کیوں نہ سرکا لیا۔

b) جب وہ قبر سے نکل کر پہلی بار مریم مگدلینی پر ظاہر ہوا تو اس نے کیوں اُسے خود کو چھونے سے روکا؟ اس نے اپنی وضاحت سے کس طرف اشارہ کیا؟ چھونے کی اجازت کیوں نہ دی گئی؟

c) جب مریم اور اس کے ساتھی دوبارہ قبر پر پہنچے، تو اب اُس نے اِسے اور اِس کے ساتھیوں کو اپنے پاؤں چھونے کی اجازت کیوں دی؟ ٹھوس طریقے سے ایک یقینی جسمانی عمل واقع ہو گیا۔

d) اماؤس جانے والے دو اشخاص نے اسے کیوں نہ پہچانا جبکہ مریم اور اس کے ساتھیوں نے اسے پہچان لیا جب تک کہ اس نے روٹی توڑنے کا عمل نہ کیا۔

e) ہمیں یہ کیوں بتایا گیا ہے کہ دروازے بند تھے، یہ چیز قابل ذکر ہے بھلے ہی یہ رات کا وقت تھا؟ اس کا خود کو شناخت کروانے پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے؟ اس فقرے سے اس کا کیا مطلب ہے ''ایک روح جسم اور ہڈیاں نہیں رکھتی اور دیکھو میری ہیں''۔

f) کیا خداوند کے پہلے ظہور کے وقت توما کی غیر موجودگی اور آٹھ دن بعد موجودگی میں خدا کا کوئی خاص مقصد تھا (یوحنا 20:25,26)۔

g) اس ذاتی شناخت کے عروج کی کیا کوئی خصوصی وجہ ہے کہ خداوند ایک بار پھر ایک کھانے میں شریک ہوا جس میں وہ نہ صرف میزبان تھا بلکہ ایسا میزبان تھا جس کے مہمانوں کو کھانا آپس میں بانٹنے کو کہا گیا۔

ان واقعات کی ترتیب کو دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ہر ایک کی خصوصی اہمیت ہے یہ ایک ایسا کردار ہے جو حالات کی تفصیل کو واضح کر دیتا ہے اور اس کی اہمیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ میں بظاہر تضادات کو خطاب کرنے کی کوشش نہیں کر رہا بلکہ اُن پر چھوڑتا ہوں جو ان واقعات کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ مگر میں ان واقعات کے نتائج اور خاص کرداروں کو جنہیں للکارا جا سکتا واپس نہیں لینا چاہتا۔ مجھے یہ کہنے کی جسارت کرنے دیجیے کہ وہاں فرشتے بھی قدم رکھنے سے ڈرتے ہیں۔

جسمانی طور پر جی اٹھنے کی تصدیق

یہودی قانون کے مطابق کسی رد کیے ہوئے شخص کا جسم دفنانے کے لیے غروب آفتاب سے پہلے ہی اٹھالیا جاتا تھا۔ کسی لاش کو مکمل طور پر تیار نہیں کیا جاتا تھا مگر وقتی طور پر کیڑوں سے بچانے کے لیے لپیٹا جاتا تھا۔ قبر کو عارضی طور پر بند کیا جاتا تھا کہ حملہ آوروں سے محفوظ رہے، تین دن بعد اسے کھولا جاتا تھا۔

تدفین کے انتظامات کو مکمل نہ کرنے کی وجہ ''موت کا تصدیق نامہ'' تھا جو ''دوسرے دن'' تک نہیں دیا جاتا تھا کیونکہ اتنے عرصے تک یہ فرض کیا جاتا تھا کہ چہرے میں ایک یقینی تبدیلی آجاتی ہے جو یہودی روایات کے مطابق یہ اشارہ کرتی ہے کہ روح جسم کو مکمل طور پر چھوڑ چکی ہے، اور پھر واپس نہیں آئے گی۔ اس احتیاط کا مقصد یہ یقین کرنا تھا کہ موت واقع ہو چکی ہے اور کوئی طبعی صحت یابی نہیں ہو سکتی، جیسا کہ کبھی کبھی موت کے تصدیق نامے کے بعد اب بھی ہو جاتا ہے۔

تدفین کی رسومات مرد نہیں بلکہ عام طور سے عورتیں ادا کرتی تھیں جو روائتی طور پر مردے کے رشتے دار یا دوست ہوتے تھے۔ یہ حالات اس حقیقت کے جواب دہ ہیں کہ تیسرے دن صبح سویرے عورتیں ہی یسوع کی قبر پر مصالحہ جات کے ساتھ قبر کے حتمی طور پر بند ہو جانے سے پہلے آخری بار جسمانی احتیاط کے لیے آئیں۔

جب مریم مگدلینی، جو کہ سب سے پہلے آئی تھی، پہنچی تو ابھی اندھیرا ہی تھا اور اسے توقع تھی کہ قبر بند ہو گئی لیکن واقعاتی طور پر وہ جلد از جلد وہاں پہنچنا چاہتی تھی تا کہ قبر کھلے اور یہودی قانون کے مطابق اسے تصدیق نامہ مل سکے۔ ان میں سے کوئی بھی یہ توقع کر سکتا تھا کہ حتمی تدفین سے پہلے انکے محبوب خداوند کا یہ آخری نظارہ ہو گا۔

یاد رکھیے کہ ابھی اندھیرا ہی تھا لیکن اتنا اندھیرا نہیں تھا کہ وہ کچھ دیکھ کر چونک نہ سکے، وہ پتھر پہلے ہی ہٹایا جا چکا تھا ''عورت احتیاطاً'' کھلی قبر پر پہنچی۔ ابھی تک اندھیرا اور خاموشی تھی اور اسے یقین دلانے کے لیے آس پاس بھی کوئی نہ تھا۔ اسلئے اس نے اندر جانے کی جرات نہ کی بلکہ ساتھ ڈھونڈنے کے لیے واپس چلی گئی۔

اب وہ ''دوسری مریم'' اور جیمز کی ماں سلومی کے ساتھ واپس آئی۔ اس وقت تک دن کی ہلکی سی روشنی ہو گئی تھی۔ اس لمحے ان کی حیرت دیکھ کر وہ فرشتہ جس نے پتھر ہٹایا تھا اس وقت وہاں بیٹھا تھا۔

فرشتے نے قدرتی انداز میں بولتے ہوئے انہیں قبر کا جائزہ لینے کی دعوت دی کہ وہ خود دیکھ لیں کہ خداوند وہاں نہ تھا۔ بے شک قبر خالی تھی مگر ایک دو اور فرشتے تھے جنہوں نے انہیں شک کی وجہ سے ڈانٹا، ''وہ یہاں نہیں بلکہ جی اٹھا ہے، یاد کرو کہ جب وہ ہنوز **گلیل** ہی میں

تھا تو اس نے تم سے کیا کہا تھا یعنی کہ ضرور ہے کہ ابن آدم گناہگاروں کے حوالے کیا جائے اور مصلوب اور تیسرے دن جی اٹھے'' (لوقا24:6,7)۔ہم یہ نہیں جانتے کہ مریم مگدلینی کے ساتھی کہاں گئے ہوئے تھے،شاید گھر گئے تھے مصالحے لینے یا وہ لائے تھے یا کچھ اور کرنے۔لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ مریم فوراً پطرس اور یوحنا شاگرد کی طرف بھاگی جنہیں یسوع خصوصی پیار کرتا تھا۔

پطرس اور یوحنا اور مریم جسے وہ کبھی ساتھ نہ رکھتے تھے،فوراً خود دیکھنے کے لیے قبر کی طرف بھاگے اور ان کا یہ جلدی کا سفر کچھ حیران کن پیراجات میں سے ہے جو چند لفظوں میں لکھے گئے۔

''چنانچہ وہ اکٹھے دوڑے مگر دوسرا شاگرد پطرس سے بڑھ گیا اور قبر پر پہلے پہنچا،اس نے جھک کر کتانی کپڑے پڑے ہوئے دیکھے مگر وہ اندر نہ گیا۔تب شمعون پطرس بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا اور قبر کے اندر گیا اور کتانی کپڑے پڑے ہوئے دیکھے،اور وہ رومال جو اس کے سر پر تھا ان کتانی کپڑوں کیساتھ نہیں تھا مگر الگ لپٹا ہوا ایک جگہ پڑا تھا۔تب دوسرا شاگرد بھی جو قبر پر پہلے آیا تھا اندر گیا اور دیکھ کر یقین کرلیا'' (یوحنا20:4-8)۔

انہوں نے قبر میں کتانی کپڑے ایک جگہ پڑے ہوئے دیکھے اور سر کا کپڑا احتیاط سے تہہ کیا گیا الگ پڑا دیکھا جیسے خداوند کے جسم کا انتہائی نرمی سے کھولا گیا ہو۔یقیناً وہاں پر جسم کو چرانے کا کوئی ثبوت نہ تھا کیوں کہ ایسی احتیاطیں چور نہیں کرتے۔

اسی وقت مریم ہانپتے ہوئے ان کے پیچھے عین اس وقت پہنچی جب پطرس اور یوحنا واپس جانے والے تھے اور باقی شاگردوں کو بتایا۔نہ جسم تھا اور نہ محافظ مگر یہ بات ان پر واضح تھی کہ یہ کام چوروں کا نہیں کیونکہ یہ غلط بات شاگردوں نے نہیں بلکہ خداوند کے دشمنوں نے پھیلائی تھی۔

اس اثنا میں مریم قبر کے داخلے پر ہی رہی۔وہ ان کی دریافت پر پریشان تھی اور اپنے ذاتی نقصان پر رو رہی تھی۔وہ خداوند یسوع مسیح کی آخری رسومات بھی ادا نہ کرسکی تھی جسے وہ بہت پیار کرتی تھی۔

اپنے آنسوؤں میں سے اس نے قبر کے اندر اچانک دو دوسرے لوگوں کو دونوں کونوں میں کھڑے دیکھا جہاں یسوع کو رکھا گیا تھا۔ انہوں نے اس سے کہا''تم کیوں رو رہی ہو؟''

''کیونکہ'' اُس نے کہا''وہ میرے خداوند کو لے گئے ہیں اور میں نہیں جانتی کہ انہوں نے اسے کہاں رکھا ہے''

اور یہ کہتے ہوئے وہ واپس مڑی اور کسی اور کو وہاں دیکھا۔اس کا زخمی چہرہ نکلتی ہوئی صبح میں چمک اٹھا کیوں کہ وہ قبر کے اندر کھڑی تھی۔اس شخص نے اس سے کہا،''تم کیوں روتی ہو؟تم کسے تلاش کرتی ہو؟'' (یوحنا20:15)

اُس نے اسے مالی سمجھا کیونکہ آرمیتھیا کا یوسف جس نے یہ جائیداد خریدی تھی اور یہ قبر کھدوا کر بنوائی تھی،وہ ایک امیر آدمی تھا،سو ہو سکتا ہے اس نے دیکھ بھال کے لیے ایک مالی رکھا ہو۔اِس لیے اُس نے اُس سے کہا''جناب مجھے بتائیے کہ اگر آپ نے اسے اٹھایا ہو تو کہاں رکھا ہے تاکہ میں اسے لے جاؤں''۔

اس نے روشن آسمان کو اپنے آنسوؤں کے اندر سے دیکھا تھا اس لیے وہ پہچان نہ سکی کہ کون ہے۔ اس پر خداوند نے اسے اپنی پہچان کی ضمانت دی اُس نے سادگی سے اس کا نام پکارا

''مریم!''

مریم فوراً اس کے گھٹنوں پر گر گئی اور اس کے خوبصورت پاوں دیکھے۔ اس نے جلدی سے کہا۔

''نہیں مریم تم مجھے چھو نہیں سکتی''

پھر اُس نے اسے وجہ بتائی ''کیونکہ میں ابھی تک اپنے باپ کے پاس نہیں گیا۔ لیکن اپنے بھائیوں کے پاس جاتا اور کہتا ہوں کہ میں اپنے اور تمہارے باپ، اپنے اور تمہارے خداوند کے پاس اوپر جاتا ہوں'' (یوحنا 20:16-17)۔

اور میں اس کی خوشی کا اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہ بنا مزید سوالات پوچھے واپس دوڑی اور اس جگہ پہنچی جہاں شاگرد جمع تھے تا کہ انہیں بتائے کہ میں نے سچ مچ خداوند کو دیکھا ہے اور وہ زندہ ہے۔ وہ جی اٹھا ہے اور میں نے روبرو اس سے بات کی ہے۔

اسی اثنا میں جبکہ یہ واقعات رونما ہو رہے تھے، اس پیغام کو پھیلایا جا رہا تھا اور باتیں کی جا رہی تھیں تو خداوند کے دو دوست سنجیدگی سے چلتے ہوئے اماؤس کی طرف اپنے گھر کو واپس جا رہے تھے۔ اگرچہ یہ خبر تیزی سے پھیلائی جا رہی تھی لیکن بلا شبہ سوائے مریم مگدلینی کے کوئی اس بات پر یقین نہیں کر رہا تھا کہ واقعی خداوند جی اٹھا ہے اور ایک بار پھر ہم میں واپس آ گیا ہے۔

پورے کلام میں ''اماؤس کی طرف جانا'' شاید سب سے زیادہ ڈرامائی منظر ہے (لوقا 24:13-35)۔ یہ دو مسافر چلتے ہوئے باتیں کرتے جاتے تھے کہ پچھلے چند دنوں میں کیا ہوا۔ وہ امید کرتے اور ریشخی مارتے تھے کہ بلا شبہ یسوع مسیح ماعود ہے، کس طرح اس کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا گیا اور کس طرح اسے خطرناک ترین موت یعنی صلیب کی موت کی طرف بلا مزاحمت لے جایا گیا۔ اور اب وہاں یہ افواہیں تھیں۔

جونہی وہ چل رہے تھے تو یسوع ان کے پیچھے گیا وہ ان سے اتنی دور تھا کہ ان کی بات چیت سن سکتا تھا۔ جلد ہی وہ ان میں شامل ہو گیا اور بنا مخل ہوئے پوچھا کہ وہ اتنی سنجیدگی سے کیا باتیں کر رہے ہیں۔ قدرتی طور پر وہ اس کی غفلت سے حیران تھے، انہوں نے پوچھا

''کیا تم یروشلیم میں واحد اجنبی ہو جو نہیں جانتے کہ ان دنوں کیا ہوا ہے؟''

اُس نے پوچھا ''کیا ہوا ہے''؟

انہوں نے کہا ''یسوع ناصری کی بابت، جو نبی تھا اور کام اور کلام میں خدا اور ساری امت کے نزدیک صاحبِ قدرت تھا۔ جسے سردار کاہنوں اور ہمارے سرداروں نے قتل کے لیے حوالہ کیا اور مصلوب کیا۔ مگر ہمیں تو امید تھی کہ یہی اسرائیل کو مخلصی دے گا اور ان سب باتوں کے علاوہ ان واقعات کو آج تیسرا دن ہوا ہے۔ اور ہم میں سے چند عورتوں نے ہم کو حیران کر دیا، وہ صبح سویرے اس کی قبر پر گئیں اور اس کی لاش کو نہ پا کر آئیں اور بولیں کہ ہم نے فرشتوں کی رویت دیکھی جو کہتے تھے کہ وہ زندہ ہے.....''۔

اب اس نے انہیں ڈانٹا اور پوچھا کہ انہوں نے ان باتوں کو کیوں محسوس نہ کیا جو ان سے پہلے ہی کی جا رہی تھیں۔ اُس نے اُن سے کہا:

''اے نافہمو اور سست اعتقادو!'' پھر موسیٰ سے اور سب نبیوں سے شروع کر کے سب نوشتوں میں جتنی باتیں اسکے حق میں لکھی ہیں ان کو سمجھا دیں۔(لوقا 24:18-27)۔

جلد ہی وہ گھر تک پہنچ گئے اور اپنے گھر کی طرف مڑے۔ان کا نیا بے پہچان ساتھی آگے بڑھ گیا کیونکہ خود بخود اندر نہیں جا سکتا تھا۔ مگر انہوں نے اسے اندر آنے پر قائل کیا اور اس نے دعوت قبول کر لی۔وہ اکٹھے اندر آئے اور جلد ہی وہ کھانے کی میز پر تھے۔اسی دوران گفتگو جاری رہی، اُس نے روٹی لی اسے برکت دی اور توڑا۔اچانک ان کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے اسے پہچان لیا۔ابھی انہوں نے پہچانا ہی تھا کہ وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

انہوں نے اسے پہلے کیوں نہ پہچانا؟ اس کا جواب شاید مرقس 16:12 میں ہے ''وہ ان پر ایک اور شکل میں ظاہر ہوا''۔

اگر ہم اس جملے کے لیے کوئی اور لفظ تلاش کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا جسم تبدیل ہو چکا تھا۔اصل میں اس نے اب ایک تبدیل صورت اختیار کر لی تھی یہ اب بھی اس کا اپنا ہی جسم تھا مگر حیران کن طور پر تبدیل تھا۔چہرے کا کرب، تین گھنٹے کے اندھیرے کا سایہ، کانٹوں کے تاج کے نشانات، صلیب پر جھولنے کے آثار، خون آلود پسینہ، ہانپنا، پانی کی شدید ضرورت، بے چمک بال اور جھکے ہوئے کندھے جو صلیب کا بوجھ برداشت نہ کر سکے یعنی ایک ''المیہ شکل'' جس کے ساتھ مکمل بدسلوکی کی گئی اور سزا دی گئی، وہ جس چہرے میں ''وہ خوبصورتی جس کی ہم خواہش کرتے ہیں'' نہ رہی۔یہ سب ختم ہو چکا تھا۔یہ سب کچھ اب آخری اظہار اور ایک یاد تھے۔مگر ان اجنبیوں کے لیے جو اماؤس کی طرف واپس گئے، خداوند ویسا نہ تھا جیسا انہوں نے تین دن پہلے دیکھا۔

انہیں ہرگز توقع نہ تھی کہ وہ کبھی اسے دوبارہ بھی دیکھ سکیں گے اور وہ بھی زندہ، جھومتا ہوا اور خوبصورت۔اس میں واقعی کوئی حیرانی نہیں کہ انہوں نے اسے نہ پہچانا کیونکہ وہ ان پر ''ایک شکل'' میں ظاہر ہوا۔وہ چہرہ شرمسار نہیں خوبصورت تھا۔وہ اس قدر مختلف تھا کہ اس نے ان کے ساتھ کھانا کھایا اور پھر اچانک غائب ہو گیا۔وہ بنا انداز غائب ہو گیا۔بلکہ اُس کھانے کا اندازہ کئے بنا ہی جو وہ ان کیساتھ کھا چکا تھا۔وہ فوراً اٹھے اور شہر کی طرف واپس چل دیے تا کہ باقی شاگردوں کو ملیں۔بے شک خداوند زندہ تھا۔خداوند اپنے وعدے کے مطابق جی اٹھا تھا۔

مصدقہ جسمانی تبدیلی

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اب اگر وہ آسانی سے غائب ہو سکتا تھا تو فرشتے کے لیے یہ بات اہم کیوں تھی کہ وہ آئے اور پتھر کو ہٹائے اور خداوند قبر سے باہر آئے جیسے لعزر کے لیے پتھر ہٹایا گیا کہ وہ باہر نکلے، وہ اس کے اندر سے کیوں نہ گزر گیا؟

کیا یہ ممکن ہے کہ اس کے جسم میں تب تک تبدیلی نہیں آئی جب تک مریم مگدلینی نے اسے دیکھ نہ لیا؟ اگر ایسا ہے تو یہ وہ جسم نہ تھا جسے قبر میں رکھا گیا۔اس کا جسمانی، زمینی اور انتہائی زخمی جسم وہی تھا جس کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ جی اٹھے گا، یہ وہی ہیکل تھی اور کچھ نہیں۔

مگر ایسا جسم پتھر میں سے نہیں گزر سکتا تھا نہ ہی یہ انسانی طور پر ممکن ہے۔اس کو زندہ کیا اور نئی زندگی دی گئی۔ایسے جسم کے لیے یہ

ممکن نہ تھا کہ وہ اس پتھر کو چیر دیتا جس نے قبر کا راستہ بند کر رکھا تھا۔ اور یہ پائیلیٹ (موت کی تصدیق کرنے والا ڈاکٹر) کے احکام کے مطابق ہوا تھا۔ قبر کے اندر سے کوئی بھی حتیٰ کہ شاید شمعون بھی پتھر کو طاقت سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ باہر سے کوئی آدمی یا فرشتہ اس ''تالے'' کو ہٹا یا لڑھکا سکتا تھا۔

اس طرح ہم ایک باسبب منظر نامہ اور مفروضہ تیار کر سکتے ہیں کہ خداوند نے، جو کہ پرانے عہدنامے کا یہواہ ہے، اپنی ہیکل (یعنی اپنا جسم) میں پھر سے روح پھونکی مگر اسمیں کوئی اہم تبدیلی نہ آنے دی ایک فرشتے نے پتھر ہٹایا اور دوسرے دو نے اس کا کفن کھولا جیسے یہ سب کچھ لعزر کے لیے کیا گیا (یوحنا 11:41-44) پھر وہ اپنے پرانے زمینی جسم سے آگے بڑھا جس پر بلاشبہ زخموں کے نشان باقی تھے۔ جونہی مریم مگدلینی واپس آئی تو شاید وہ مدھم روشنی میں ایک طرف کھڑا ہو گیا اور وہ قبر میں داخل ہو گئی اور اس مجروح چہرے کے ساتھ کھڑی رہی۔ پھر وہ آنسوؤں میں سے آسمان کو دیکھتی ہوئی حیرانی سے باہر آ گئی۔ آگے کیا ہوا ہم جانتے ہیں۔

لیکن سوال باقی ہے۔ تبدیلی کب واقع ہوئی؟ اس نے اسے (مریم مگدلینی کو) خود کو چھونے کی اجازت کو کیوں نہ دی؟ کیا اس زمینی جسم کے ساتھ کی کوئی منزل باقی تھی جو اس نے عبور کرنی تھی۔ میرا ایمان ہے کہ ایسا ہی تھا۔

زمین پر اس نے اپنی قربانی کا پہلا حصہ صلیب پر ادا کیا۔ ایک بلند ترین کاہن اور قربانی کے دنبے کے طور پر، اپنے ہی جسم میں مگر اب آسمان پر اسے ایک اور فرض ادا کرنا تھا۔ اب وہ اپنے باپ اور خدا کے پاس جانے کے قریب تھا تا کہ ذاتی طور پر اپنی جان پیش کرے اور قربانی کے کام کو مکمل کرے۔ یہ آسمان پر چڑھنا اور چالیس دن بعد آسمان پر چڑھنے میں بہت فرق تھا۔ اس چڑھائی کے بعد اسے فوراً زمین پر واپس آنا تھا۔ کیا فرشتے نے مریم اور اس کے ساتھیوں سے کچھ دیر بعد نہیں کہا کہ ''جاؤ اپنا راستہ لو اور جا کر شاگردوں اور پطرس کو بتاؤ کہ وہ جاتا ہے اس سے پہلے کہ تم **گلیل** پہنچو۔ وہاں تم اسے دیکھو گے جیسا کہ تم سے کہا (مرقس 16:7)۔ کیا کلام میں کوئی ثبوت ہے کہ خداوند واقعی اپنے خدا باپ کے پاس اپنے مقصد کے لیے آسمان پر چڑھ گیا؟ میرے خیال میں ہے۔

> ''لیکن جب مسیح آئندہ کی اچھی چیزوں کا کاہن اعظم ہو کر آیا تو اس بزرگ تر اور کامل تر مسکن (یعنی اس کا جسم، دیکھیں یوحنا 2:19) کی راہ سے جو ہاتھوں کا بنا ہوا یعنی اس خلقت کا نہیں۔ اور بکروں اور بچھڑوں کا خون لیکر نہیں بلکہ اپنا ہی خون لیکر مقدس میں ایک بار قطعی طور پر داخل ہوا''۔

میرا خیال ہے اس نے آسمان سے، خدا اور باپ سے مہربان فرشتوں سے بلکہ شاید شیطان سے بھی پہلے ابدی خانقاہی خون دیا تا کہ ہمیں ابدی شفاعت مل سکے۔

میرے خیال میں کسی بھی طور ان باتوں کو جسمانی اصطلاحات میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ اس بات کی سادہ وضاحت، کہ کیوں اسی مریم مگدلینی اور اس کے ساتھیوں کو اگلی ملاقات میں اجازت دی گئی کہ وہ اُسے (خداوند) اور اسکے پاؤں کو چھو سکیں، یہ کہ وقفے میں وہ کاہن اعظم اور خدا کے برے کے طور پر اپنی قربانی کے کام کو پورا کر چکا تھا۔ وہ جو کاہن اعظم تھا، اُس نے خود کو برہ بنا کر پیش کیا اور اپنا ہی خون مقدسین کے مقدس میں لے گیا۔ پرانی راہبانیت کے تحت کوئی بھی انسانی ربط کاہن اعظم کو فوراً ناپاک اور نااہل کر

دیتا تھا، اس لئے ایک ''محفوظ'' کاہن یوم کفارہ پر ہمیشہ تیار رکھا جاتا تھا تا کہ اس سال کا کاہن حادثاتی طور پر کسی ایسے ربط سے ناپاک نہ ہو جائے۔ مریم اسے نہیں چھو سکتی تھی جب تک کہ وہ اپنی قربانی کا یہ حصہ پورا نہ کر لیتا۔ اس لئے بعد میں اس نے نہ صرف اپنے جسم کو چھونے کی اجازت دی بلکہ دعوت دی ایک موقع پر حکم بھی دیا۔

ہم جانتے ہیں کہ اگلے ظہور تک جبکہ تبدیلی نے اس کا خوبصورت چہرہ بحال کر دیا تھا، تصلیب کے وقت کے شناختی نشانات یعنی ہاتھوں اور پاؤں کے زخم اور پسلی میں نیزے کے زخم ابھی باقی تھے۔ شاید یہ ابدیت کی نشانی ہے۔ ہمارے جسم گل جائیں گے اور تبدیل کر دیے جائیں گے۔ اس طرح کی مکمل تبدیلی اس کے لئے ضروری نہ تھی، کیونکہ اس کا جسم گناہ کے اندرونی دھبوں سے پاک تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اماؤس کی جوڑی نے اس کے ہاتھوں پر غور نہیں کیا، لیکن اس کا جسم ایک اہم طریقے سے تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ اب بھی اُسی کا جسم تھا اور قابل شناخت بھی تھا مگر کام کرنے کے لحاظ سے یہ زمینی جسم نہ تھا۔ تاہم یہ اس کا اپنا ہی جسم تھا۔

یہودیوں کا ڈر یہ ہے کہ جہاں اس کے شاگرد جمع تھے اور سب دروازے بند تھے تو اس کا پہلا ظہور کیسے ہوا؟ (یوحنا 20:19)۔ قبر کی بندش کے برعکس جسے صرف باہر سے کھولا جا سکتا تھا، یہ دروازے اندر سے بند تھے۔ لیکن خداوند ان کے بیچ سے گزر گیا اور اچانک کمرے میں نمودار ہو گیا جہاں وہ سب جمع تھے اور ان میں سے چند نے جو کچھ دیکھا اور سنا، اس پر بحث کر رہے تھے۔ جب وہ اچانک ظاہر ہو گیا تو اس کے نمودار ہونے کے حالات میں سب نے یہ جانا کہ محض اس کی روح ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے اس نے بلا ہچکچاہٹ اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے اور کہا ''یہ میں ہی ہوں، مجھے چھوؤ اور دیکھو۔ کیونکہ روح کا گوشت اور ہڈیاں نہیں ہوتیں، مگر تم دیکھتے ہو کہ میری ہیں'' (لوقا 24:39)۔

تصلیب کے نشانات کی نمائش کا یہ بصری اظہار شاندار تھا۔ اگرچہ یہ صرف دیکھنے کا ثبوت تھا چھونے کا نہیں۔ ایک بھوت بھی ہڈیوں اور گوشت کیساتھ ظاہر ہو سکتا ہے، مگر بھوت کے ہاتھ اس کے ہاتھوں جیسے کیسے ہو گئے۔ اگرچہ ہچکچاتے ہوئے مگر واضح طور پر اس نے خود کو حقیقی ربط کے امتحان میں رکھا۔ شاگرد ابھی تک شک میں کھڑے تھے۔ تقریباً ڈانٹتے ہوئے خداوند نے کہا ''کیا تمہارے پاس کھانا ہے''؟ اور کسی نے اس کو شہد کا چھتہ اور بھنی ہوئی مچھلی دی (لوقا 24:41-43)۔ پھر ہمیں سادگی سے بتایا جاتا ہے کہ ''اس نے اسے لیا اور ان سے پہلے کھا لیا''۔

کسی پیچیدہ صورت حال میں خداوند کے سلوک کی یہ ایک خوبصورت مثال تھی۔ ترغیب کا متبادل یہ تھا کہ ہر ایک کو ہاتھوں، پاؤں اور پسلی کا معائنہ کروایا جائے اور وہ شاید بیس سے زائد لوگ تھے، بصورت دیگر موجود لوگوں میں سے ہر ایک کیسے قائل ہو سکتا تھا اس کی جسمانی موجودگی کیسی بھی تھی مگر سب آنکھیں رکھنے والوں کو اس نے چھوڑ دیا۔

انہوں نے ضرور انتظار کیا ہو گا جب تک کہ اس نے کھانا کھا نہ لیا ہو اور شاید اس نے خاموشی سے انتظار کیا ہو گا کہ وہ اپنی حیرانی سے باہر آ جائیں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ یقیناً خود ہی تھا اور اس کا جسم بھی اتنا ہی حقیقی تھا جتنا وہ کھانا جو اس نے کھایا۔ اگرچہ وہ دروازوں کے بیچ سے گزر گیا اور ان کے درمیان آ موجود ہوا۔ بلاشبہ یہ بنا جسمانی روک ٹوک کے، اصلی اور آشکار، ایک نئی قسم کی تجسیم تھی۔

لیکن اس پر غور کرنا چاہیے کہ اس نے کہا ''روح کے گوشت اور ہڈیاں نہیں ہوتیں، جیسا کہ تم دیکھتے ہو میری ہیں''۔ گوشت اور ہڈیاں نہ کہ گوشت اور خون۔ اسطرح خداوند نے وہ زبان استعمال کی جو نئے عہدنامے میں اور کہیں نہیں۔ اگر چہ ''گوشت اور خون'' کے الفاظ ہیں۔ ''گوشت اور ہڈیاں'' لگتا ہے کسی اور قسم کے جسم کی طرف اشارہ ہے۔ جو بے شک جسم ہے مگر مختلف طور سے بنایا گیا۔

خداوند نے لفظ ''خون'' سے گریز کیا، ہوسکتا ہے کہ اب اس کے جسم میں ایک الگ قسم کی طاقت موجود تھی اور وہ ایک الگ اصول حیات سے مقوی تھا۔ اس کی پرانی زندگی کا اصول کلوری پر قربان کر دیا گیا اور اس کا خون آسمان پر پہنچ گیا، اور یہ نئی کتاب اب اس خون سے آزاد تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ زندگی جو خون میں تھی دی جا چکی تھی اور اسے کبھی واپس نہیں لیا جا سکتا تھا۔ یہ انتہائی حقیقی معنوں میں ایک ابدی قربانی تھی تاہم وہ آئندہ بھی انسان رہا۔ ایک انسانی جسم ابھی تک ضروری تھا یعنی گوشت اور ہڈی کا اصلی اور کام کرتا ہوا جسم۔ اگر چہ اب اس کا جسم مختلف طریقے سے کام کر رہا تھا۔

بند دروازوں میں سے بلا رکاوٹ گزرتے ہوئے، آٹھ دن بعد پھر وہ ان کے درمیان میں پہلے کی طرح نمودار ہوا۔ لیکن اس بار توما موجود تھا۔ اپنے عمومی آداب کے ساتھ اس نے (خداوند نے) کہا ''تم پر سلامتی ہو'' پھر اچانک توما کی طرف مڑتے ہوئے اور بنا پوچھے کہ تمہارے ایمان کی کمی کو کیسا ثبوت چاہیے، اس نے توما کو وہی حکم دیا جو اس نے یعنی توما نے باقی شاگردوں سے ثبوت کے طور پر کہا تھا، دیکھو اور یقین کر لو کہ کیلوں کے نشانات اصل ہیں۔ یہ بات واضح ہوگئی کہ خداوند، جب توما نے یہ بیان دیا، موجود تھا مگر نظر نہیں آتا تھا۔ اس طرح اس نے ثابت کر دیا کہ اس کی موجودگی غائب یا حاضر دونوں صورتوں میں حقیقی ہے۔ اس لیے جان لینا چاہیے کہ وہ خداوند جسمانی حقیقت ہے۔ اگر چہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ وہاں ہے۔ اس کے نئے جسم کی حقیقت اس کے ظاہر ہونے پر منحصر نہیں تھی۔

یوحنا 20:27 میں لکھا ہے کہ توما خداوند کے حکم پر حیران رہ گیا جو اس نے اسی کے الفاظ میں اسے تسلی کرنے کو دیا۔ ہمیں یہ نہیں بتایا گیا کہ ردعمل میں اس نے بھی ایسا کیا۔ شاید ہانپتے ہوئے اس نے صرف اتنا کہا ''میرے خداوند میرے خدا''۔ ان حوالوں سے یہ بات واضح ہے کہ خداوند نے ہر وہ معائنہ کروایا ہوگا جو کسی بھی انسان نے جسمانی حقیقت کے ثبوت کے طور پر مانگا ہوگا۔ کیونکہ اس کا جسم ایسی آزمائشوں کی تسلی کرنے کا قابل تھا۔ یہ ایک حقیقی جسم تھا، ہم سے بھی زیادہ حقیقی کیونکہ اب یہ لافانی تھا۔

آخری قسط واقعی حیران کن ہے۔ یہ اس کے آسمان پر چڑھ جانے کے غالباً زیادہ دیر پہلے واقع نہیں ہوئی۔ اس کو یوحنا 21:1-14 میں درج کیا گیا ہے۔ حالات درج ذیل ہیں

شاگردوں نے بنا کامیابی ساری رات ماہی گیری کی۔ اس ماہی گیر جماعت میں بظاہر ایک سے زیادہ کشتیاں تھیں۔ جونہی دن نکلا اور وہ ساحل کے قریب تھے تو انہوں نے تاڑ لیا کہ پانی کے کنارے کوئی کھڑا ہے، پانی کے پار سے کسی نے انہیں آواز دی جسے انہوں نے نہ پہچانا۔ ''بچو کیا کوئی مچھلی ملی؟'' انہوں نے جواب دیا ''نہیں''۔ اجنبی نے پھر آواز دی ''کشتی کے دہنی طرف جال ڈالو تو تم پاؤ گے''۔ اگر چہ انہوں نے خداوند کو نہ پہچانا مگر کسی سبب انہوں نے اس وقت اس کی بات بنا ہچکچاہٹ مان لی۔ یوحنا لکھتا ہے ''اور اب وہ مچھلیوں کی بہتات کی وجہ سے جال کو کھینچنے کے لائق نہ تھے''۔

یوحنا جو عقلمند تھا، پطرس سے دھیمی آواز میں کہتا ہے ''یہ خداوند ہے'' جونہی پطرس نے یہ سچائی پہچان لی، اس نے اپنا ماہی گیری والا لباس پہناتا کہ اپنے ننگے بدن کو چھپائے، اس نے کم گہرے پانی میں چھلانگ لگائی اور ساحل کی طرف دوڑا۔ اُسی وقت کچھ دوسرے شاگرد ایک اور چھوٹی کشتی میں نزدیک آ گئے اور ان کے درمیان میں مچھلی سے بھرا ہوا جال کھینچ کر کنارے تک لانے لگے۔ پھر انہوں نے وہاں کوئلوں کی آگ دیکھی اور اس پر مچھلی اور روٹی رکھی (یوحنا 21:9)۔

یہ سوچنا مشکل ہے کہ یہ اصل میں کیا اشارہ ہے۔ کیا خداوند نے ان مچھلیوں کو پکڑا؟ کیا اس نے یہ روٹی پکائی؟ کی اس نے جلانے کے لیے لکڑی اکٹھی کی؟ اور کوئلوں کی تہہ بنانے کے لیے کیا اس نے آگ جلائی؟ کیا وہ پانی میں گیا اور مچھلیاں پکڑیں؟ اور کیا ساحل پر دیر تک لکڑیاں تلاش کیں؟ یا یہ سب یعنی مچھلی، روٹی اور کوئلے اُس نے خلق کیے؟ اگر کوئی یہ سوچے کہ اس نے انہیں اکٹھا کیا۔ اپنی ہیئت میں تبدیلی کے باوجود جو اس کے جسم میں آ چکی تھی وہ ایک انسان سے کم نہ تھا اور اب وہ ایک میزبان بھی تھا۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ اُس نے بظاہر، اور مجھے یقین بھی ہے، کہ ارادۃً اس نے وہاں پر پہنچے ہوئے اتنے سارے مہمانوں کے لیے مچھلیاں نہیں پکڑیں۔ اس لئے اس نے کہا'' کچھ مچھلیاں لاؤ جنہیں تم نے اب پکڑا ہے'' (آیت 10)۔ یقیناً اس کی ضرورت نہ تھی مگر یہ ایک خوبصورت اشارہ اور ضمانت تھی۔ کیونکہ اس کے علاوہ انہیں کچھ بھی حقیقت کا شعور نہ دلا سکتا تھا۔ اس لئے صرف ان کی موجودگی ہی نہیں بلکہ اس کام میں ان کا کردار ادا کروایا۔ کیونکہ ان میں سے کوئی حیران ہو کر بے حس ہو گیا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اگرچہ پطرس نے خود کو سنبھالا، وہ اوپر گیا، جال کھینچا کچھ دیر وہیں رہا اور مچھلیوں کو گنا جو 153 تھیں۔ اُس نے یہ بھی غور کیا کہ جال پھٹا نہیں تھا اور نہ ہی اسے مرمت کی ضرورت تھی.....

اس وقت تک کھانا پک چکا تھا اور یسوع نے کہا'' آؤ اور کھاؤ'' (آیت 12)۔ یہ ایک نا قابل تصور منظر تھا یا شاید نا قابل ایجاد۔ ہر وہ بات جو کی گئی اور ہر وہ کام جو کیا گیا مکمل اور موزوں تھا۔ وہ خاموشی سے ''میز'' کے اردگرد بیٹھ گئے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ شاگردوں میں سے کسی نے بھی یہ پوچھنے کی جرات نہ کی کہ ''تم کون ہو؟''۔ وہ جانتے تھے کہ وہ کون ہے۔

کوئی حیران ہو سکتا ہے کہ سمندر پر پکنک میں بات کیسے آگے بڑھی، کس چیز نے اس کے فضل میں انکو اس کھانے میں شرکت کی اجازت دی۔ یسوع نے روٹی توڑی اور انہیں دی اور مچھلی بھی.....

ان کے ذہن میں کتنے خیال آئے ہوں گے۔ شاید انہوں نے 5000 کا کھانا یاد کیا ہو گا، 3000 کا اور آخری کھانا بھی، وہ آخری کھانا اب آخری کھانا نہیں رہا تھا۔ اصل میں یہ آخری کھانا تھا۔ بنا سائے کے یہ ایک پر امن اور پر لطف کھانا تھا۔

مناسب طور پر اس منظر پر یہ کہہ کر پردہ گرایا جاتا ہے ''اس لیے جب وہ کھانا کھا چکے.....'' کیسا کھانا ہو گا وہ!

جسمانی ابدیت: موت پر ہمیشہ کی فتح

اس حیران کن جسم کی حقیقت اور صلاحیت کشادگی سے پیش کی گئی تھی۔ اس جسم نے اعلیٰ ظہور سے اس کی خدمت کی۔ اس نے اسکی زمینی زندگی کو فضل دیا۔ اس نے قبر میں رہ کر بھی کبھی بگاڑ نہ دیکھا۔ اس نے خود کو چند گھنٹوں کے لیے فارغ کیا اور پھر اپنے قربانی کے کام

کے لیے مکمل مصروف کر دیا۔ اُس نے صلیب پر ہمارے گناہ لے لیے اور اسی جسم میں رہ کر اس نے اپنے باپ کو جلال دیا۔
انسانوں نے خدا کو ایک جسم میں مجسم دیکھا تھا جس نے کسی بھی قسم کے حالات میں کبھی کوئی شرمناک کام نہ کیا۔

اب یہ جسم وہ حتمی اور بلند تر شکل اختیار کر چکا تھا جس کے لیے اسے خلق کیا گیا تھا۔ اس کو تمام حدود اور کمزوریوں سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ یہ جسم سب سے زیادہ کامل ابدیت حاصل کر چکا تھا۔ اس کو کہیں ایک طرف نہیں رکھا جائے گا، اور خداوند یسوع مسیح اب ہمیشہ کے لیے انسانی شکل میں خدا کا اوتار رہے گا۔ اس جسم میں رہ کر وہ اپنی خواہش کے مطابق کام کر سکتا تھا۔ اس کی حرکات اور افعال میں نہ تو کوئی رکاوٹیں تھیں اور نہ ہی زمین کو زور آور کرنے والی قوتوں کی طرف سے خطرے کی اطلاعات۔

خداوند یسوع مسیح یعنی آخری آدم کے جسم کی صلاحیت ایسی تھی اور ایسی ہی صلاحیت پہلے آدم کی بھی تھی جب تک کہ اس نے ممنوعہ پھل نہ کھایا۔ مگر ایسا کر کے اس نے اس صلاحیت کو ہمیشہ کے لیے تباہ کر لیا اور نہ صرف خود کو بلکہ بنی نوع انسان کو زہر آلود کر دیا اور انسانی نسل فانی بنا دی۔

ارتقا اس قسم کے انسانی جسم کا جواب نہیں دے سکتی

کیا یہ بات قابل فہم ہے کہ اس طرح کی حقیقی روح کا جسم کبھی کسی جانور کی بنیاد سے بنا ہوگا۔ یقیناً صرف ایک معجزاتی ادراک ہی آخری آدم کے جسم کا صرف براہ راست تخلیق ہی سے پہلے آدم کے جسم کا جواب دے سکتی ہے۔

ارتقا کسی جانور کے جسم کو ماروائے عقل اہمیت نہیں دے سکتی۔ پھر بھی یہ اصرار کرتی ہے کہ ہمارے جسم ضروری طور پر مختلف نہیں ہیں اور نہ ہی یہ اس کی بلند تر اہمیت کو اجازت دیتی ہے۔ جہاں تک ہمارے اجسام کا تعلق ہے وہ جانوروں کی طرح سے مرتے ہیں۔ صرف ہمارے بھوت (روح) کو تسلسل کی اجازت دی جا سکتی ہے، اور زیادہ تر ماہرین ارتقا اس سے بھی صاف انکار کر دیں گے۔

لیکن بصورت دیگر نوشتہ جات بات کرتے ہیں۔ خداوند کے جلالی بدن کی طرح ہم بھی نئی تجسیم پر پُر یقین ہیں، ہم میں بھی یہ ناقابل یقین صلاحیت ہوگی۔ اب یہ جسم روح کے لیے آڑ نہیں بلکہ اس کے اظہار کا مکمل ذریعہ ہوگا۔

میں حیران ہوں کہ مسیحی ماہرین ارتقاء نے مسیح کے جسمانی طور پر جی اٹھنے کی روشنی میں اپنے عقیدے پر کام کیوں نہیں کیا....

☆☆☆

موت منسوخ کردی گئی!

ہماری امید اور ہماری منزل

مفروضہ؟ ہاں یہ ہے۔ ایک ایسا شخص جس کی ساری زندگی ہیومن فزیالوجی ریسرچ لیبارٹری کے سربراہ کے طور پر گزری ہو، وہ اس کے بغیر تھوڑی سی ہی ترقی کر سکتا ہے یا پھر بالکل نہیں۔ ہم صرف اسے نظریہ سازی کہتے ہیں اور لیبارٹری میں یہ کافی کامیاب ثابت ہوتی ہے۔

اسی طریقے سے مسیحیوں کو ذہنی آزادی کی مشق کیوں نہیں کرنی چاہیے۔ اس بار ایک ذہن کی تجدید کی جائے گی جو مطلع ہو، ارتقا کے راستے پر ہو اور منطق کے استعمال میں منظم ہو۔

کیوں نہیں؟

ایک انسان انسانی جسم کے بغیر انسان نہیں ہے۔ جب تک جسم انسان کا ناگزیر حصہ نہ ہو، نئے عہد نامہ میں جسم کے جی اٹھنے پر زور نا قابل جواب ہے۔

اگر ہم جسم کے بغیر اشخاص ہو سکتے ہیں تو پھر یہ بات بے سبب لگتی ہے۔ کیوں پولوس نے کہا کہ جب تک ہمارے جسم جی نہ اٹھیں ہم انتہائی تکلیف میں ہیں۔ کیوں اس نے ہماری آخری امید یعنی جسم کی شفاعت کی بات نہ کی۔ خداوند کے جی اٹھنے کا ثبوت اس کی روح کے طور پر ظاہر ہوتا ہے، بلکہ گوشت اور ہڈی کے بنے جسم کیساتھ ظاہر ہونے کو تھا۔ مردوں میں سے جی اٹھنا محض روحانی طور پر بحالی نہیں بلکہ جسمانی بحالی بھی ہے۔

اس نکتے کو، کلام کے پیروں کی فہرست کی شکل میں ثابت کرتے ہوئے، میں نہیں چاہتا کہ یہ باب اپنے عروج سے زوال میں چلا جائے۔ آئندہ دنیا کی حقیقت کی حیران کن یقین دہانی کئی بار تفصیلی وضاحت سے کروائی جا چکی ہے۔ جیسا کہ ہمیں 1 کرنتھیوں 15:35-38 فلپیوں 3:20,21 اور مکاشفہ کے آخری ابواب میں ملتا ہے، میں جسم کے جی اٹھنے کو ثابت نہیں کر رہا۔ بلکہ اسے بنیادی تمہید کے طور پر شروع کر رہا ہوں۔

میں کچھ تصوراتی آزادی کی مشق کرنا چاہتا ہوں اور اس جسمانی موجودگی کی صلاحیت کے چار پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جس کا تجربہ خداوند یسوع نے کیا اور آسمان پر اب بھی بطور انسان کرتا ہے ان چار پہلوؤں کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

a) ہم کیا بنیں گے؟

b) ہم کیا کریں گے؟

c) ہم کیا جانیں گے؟

d) ہم کیسے پہچانے جائیں گے؟

ہمیشہ کے لیے مکمل طور پر آزاد ہونا کیسا ہو گا یعنی اپنی پسند کے مطابق بننے ، پسند کے مطابق کام کرنے ، پسند کے مطابق جاننے ،پسند کے مطابق جانے اور پسند کے مطابق ملنے میں آزاد۔ ہمارا احساس کیسا ہوگا جب ہمیں اچانک پتا چلے گا کہ ہم بنا خوف یا فخر کے لازوال اور لافانی ہیں ۔ہمیں کیسے لگے گا جب ہم کشش ثقل ،وقت اور خلا کی حدود،ضرورت ،بھوک، درد، دیری یا بے صبری، نفرت یا عداوت، اکتاہٹ یا حسرت یا ان چاہی جدائی اور دکھوں اور مایوسیوں سے جو زندگی کا خاصہ ہیں اور خوبصورت زمین کو آنسوؤں کی وادی میں بدل دیتے ہیں، آزاد ہیں؟

کوئی بھی چیز جو انسانی شرم ،تشویش یا تفکر کا باعث ہو، ہماری نئی دنیا میں موجود نہیں ہوگی ۔ یہ کیسی آزادی ہوگی اور کیسی حفاظت سے ہم لطف اندوز ہونگے ؟ اصل سبب کی ہمیں اجازت نہیں دی جائے گی ۔حتیٰ کہ اچھی چیزوں کی بھی جن کی ہم خواہش کرتے ہیں ۔اس میں اُس کی خدمت کا ثمر بھی شامل ہے جو اتنی جلدی ہمارے لئے محفوظ نہ ہوگا۔ اگر ہماری تکالیف ہماری خواہش کے مطابق متبرک ہونگی تو ہمیں بہت جلد روحانی فخر عطا ہوگا۔ یہ مسیحی زندگی کا قول محال ہے جو سب گناہوں سے زیادہ تکلیف دہ ہے یعنی روحانی فخر ۔

آیئے موجودگی کے ان چار پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں جن کا نفاذ یقیناً آزادی کی حالت پر ہوگا۔ یہ غیر مجسم ہونے کی حالت نہیں بلکہ ''جلالی سے'' مجسم ہونے کی حالت ہے جس کا وعدہ فلپیوں 3:21 میں کیا گیا ہے۔

(a) ہم کیا بنیں گے؟

ہمارے پاس خداوند کا وعدہ ہے کہ جب وہ واپس آئیگا، وہ صرف خود ہی ہمیں وصول نہیں کرے گا بلکہ جب ہم اسے دیکھیں گے تو ہم اس جیسے ہونگے ۔ یہ ہے کہ ہم کیسے ہونگے ۔

تبدیلی فوراً ''پل بھر میں، آنکھ جھپکنے میں'' ہوگی ۔(1 کرنتھیوں 5:51,52)

ہم اس ملاقات کے لئے لازوال اور لافانی حالت میں زندہ کئے جائیں گے (1 کرنتھیوں 5:52,53)۔ یہ بیمار اور گلتا ہو جسم تبدیل ہو جائے گا۔ ''جس قدرت سے سب چیزوں کو اپنے تابع کر سکتا ہے، اس کی تاثیر کے مطابق وہ ہمارے پست حال بدن کی شکل بدل کر اپنے جلالی بدن کی صورت پر بنائے گا'' (فلپیوں 3:21)۔

اگر آپ سوال کریں گے کہ '' کیسے' تو میں آپکو تجویز کرونگا کہ آپ 1 کرنتھیوں 15:35-50 پڑھیں ۔ان الفاظ کو تبصرے کی ضرورت نہیں ، یہ صاف اور صریح ہیں ۔زمین سے وہی اگتا ہے جو بویا جاتا ہے ۔میں تھامس بوسٹن کا قول دوبارہ لکھتا ہوں، ''جسم کی ایک خباثت ہے، مقدسین میں بھی ہے اور وہ تب تک دور نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ قبر میں نہ گھل جائے اور جی اٹھنے پر نیا روحانی جسم اختیار نہ کر لے''۔

شناخت کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ یہ ایک حقیقت ہے جس نے ایوب کو یقین دہانی کرائی اور اس نے یہ دعویٰ کر دیا ''اگر چہ میری کھال میرے گوشت سے اکھاڑ لی جائے ، پھر بھی میں اس جسم میں ہو کر خدا کو دیکھوں گا، ہاں میں ہی اسے دیکھوں گا اور میری ہی آنکھیں اس پر نگاہ کریں گی نہ کہ غیر کی'' (ایوب 19:26,27)۔ہم خود ہی ہونگے اور سب ہی پہلا تجربہ کریں گے ۔

خدا ہم میں سے ہر ایک کو ایک ایسا جسم دے گا جس سے وہ خوش ہو گا (1 کرنتھیوں 15:38) اور اس نے ہمیں اسی بات کے لیے تیار کیا (2 کرنتھیوں 5:5) یہ کہیں بہتر ہے کہ وہ ہمارے لیے ایسا جسم چنے جو ہمیں پھر سے مکمل کر دے جیسا کہ ہم نکتہ (d) میں دیکھیں گے۔ ہم خود اس حالت میں نہ ہونگے کہ خود کو چن سکیں۔ جو جسم وہ ہمارے لیے چنے گا وہ مکمل طور پر ہماری روح کے گھر کے لیے مناسب ہو گا۔ آمیں رہ کر وہ ہمیں پھر سے مرتب کرے گا اور ہمیں اندرونی و بیرونی طور سے ایسا شخص بنائے گا جس کی ہمیں ہمیشہ خواہش رہی۔

سب سے بالاتر یہ کہ ہم فرشتے نہیں انسان ہونگے، یہ نکتہ اہم ہے۔ آدم کو زمین کے وسائل کی کھیتی باڑی اور نگرانی سونپی گئی۔ اسے اور اس کے بعد آنیوالوں کو اپنی نسل کو بڑھانا تھا اور اسے مناسب حد تک ''معمور'' کرنا تھا۔ جب خداوند یسوع مسیح نے کہا ''قابض رہو جب تک کہ میں پھر نہ آؤں'' (لوقا 19:13)۔ اس نے دو چیزوں کی دلالت کی، پہلی یہ کہ وہ دوبارہ آئے گا اور دوسری یہ کہ وہ دوبارہ آدم ثانی کے طور پر زمین پر ''قابض'' ہونے کے لیے آرہا جس سے مراد سب کچھ ہے۔

اگر خدا نے انسان کو اپنی تخلیق کردہ دنیا کا انتظام سونپا تو ضروری ہے کہ وہ اسے ذرائع بھی مہیا کرے۔ اُسے (یعنی خدا کو) اس کو (انسان کو) ایک ایسا ذہن مہیا کرنا ہو گا جو اسے اس لائق بنا دے کہ وہ خدا کی عرضی کو سمجھ سکے۔ اسے ایک مناسب دماغ مہیا کرنا پڑے گا تا کہ ذہن اپنی عرضی جسمانی دنیا پر کام میں لا سکے۔ یہ سوچنا بیوقوفی ہے کہ اگر کوئی نیا آسمان اور نئی زمین ہو گی تو ہم پہلے سے موجود زمین و آسمان کے ساتھ کام جاری نہیں رکھ سکیں گے۔

ہم اب بھی یہ نہیں جانتے کہ ذہن یا ارادہ جسم پر کیسے عمل کرے گا اور اس کے اضافے کا استعمال کیسے کرے گا۔ مثال کے طور پر ہاتھ ہماری خواہشات کو عمل میں لاتا ہے۔ یہ ایک راز ہے کہ کیسے ایک روحانی طاقت جیسے کہ میرا ارادہ کسی مادی چیز کو حرکت میں لائے گا۔ جیسے میرے ہاتھ کلاک کی سوئیوں کو ماسوائے بالواسطہ طریقے کے حرکت میں نہیں لا سکتے۔ لیکن یقیناً ہمارے پاس ارادہ بھی ہے اور بڑھتی ہوئی مہارت بھی تا کہ ہم جسمانی دنیا کا انتظام کر سکیں اگر ہم یہ بات دل میں ٹھان لیں۔

لیکن فرشتوں کے پاس ماسوائے عارضی تجسیم کے، ایسی بلاواسطہ قوتیں نہیں کہ وہ مادی اشیاء پر اثر انداز ہو سکیں۔ ''پتھر کو سرکانے والے'' فرشتے کو شاید 1500 سے 2000 پونڈ تک کا مادی وزن ہٹانا پڑا۔ راستے میں پڑا ایک چھوٹا سا پتھر بھی جو مٹی یا گارے سے اپنی جگہ پر جم گیا ہو، انسان کو روک کر پیچھے دھکیل سکتا ہے جب تک کہ اس کو ہٹایا نہ جائے۔ بلاشبہ فرشتے نے اسے پہلے ناگزیر مرحلے کے طور پر کیا، لیکن ایسا لگتا ہے کہ فرشتے نے ضرور عارضی تجسیم لی ہو گی جیسے ان دو فرشتوں نے لی جو لوط اور اس کی بیوی کو ''ہاتھ پکڑ کر'' جلدی سے تباہ ہوتے ہوئے شہر صدوم سے باہر لے گئے (پیدائش 19:16)۔

اگرچہ فرشتے انسان نہیں ہیں کیونکہ بلحاظ تعریف انسان وہی ہے جو حقیقی انسانی جسم رکھتا ہے۔ فرشتے عارضی تجسیم ضرور لیتے ہیں مگر یہ ان کی روائتی تنظیم نہیں ہے۔ مزید برآں انسان کے برعکس وہ اجسام کے بغیر خالص ارواح ہونے کے باوجود مکمل شعور رکھتے ہیں۔

جب خداوند یسوع انسان بنا تو وہ جسم بنا، یعنی انسان کا، ایک عورت کا، داؤد کا اور ابراہام کا بیج۔ وہ ''خون اور گوشت کا حصہ دار'' بن

گیا (عبرانیوں 2:14)۔ مگر وہ بے عیب تھا۔ اس نے فرشتوں کی فطرت نہ لی (عبرانیوں 2:16)۔ کیونکہ وہ اس دنیا پر خصوصی طور سے ہماری ہی طرح عمل کرنے آیا۔ ایک فرشتہ ایسا نہیں کرسکتا۔ وہ ہمارے درمیان رہا، بیماروں کو صحت مند کیا، بھوکوں کو کھانا دیا، مردوں کو زندہ کیا اور ہماری جسمانی زندگی میں پورے طور سے ہمارے ساتھ شریک رہا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی جان دینے یعنی مرنے آیا جو خدا بطور خالص روح نہیں کرسکتا۔

اس طرح انسان اپنی فطرت کے ذریعہ جسمانی دنیا سے رابطہ رکھ سکتا ہے، اور چونکہ اُس کی روح اور اُس کا ذہن خدا کی مرضی کو سمجھتے ہیں اس لئے اس کا منظم ہونے کے ناطے، وہ جسمانی ڈھانچے میں رہتے ہوئے ہی خدا کی مرضی پوری کرسکتا ہے۔ وہ دو حقیقتوں کے درمیان ایک ربط اور ایک ذریعہ اور نئے آسمان اور نئی زمین میں چونکہ ہمارے جسم اور روح کی بنیادی ترکیب قائم رہے گی۔ اس لیے ہم ایک ربط اور وسیلہ بن کر زندگی جاری رکھیں گے۔

(b) ہم کیا کریں گے؟

ہمیں نئے آسمان اور نئی زمین کے بارے میں زیادہ نہیں بتایا گیا ہے ماسوائے اس کے کہ وہ باقی رہیں گے اور کبھی ختم نہ ہونگے۔ وہ نئے ہونگے اور انہیں کبھی ہلایا نہ جاسکے گا۔ یہ اشارہ شاید اس طرف ہے کہ وہ مستقل ہونگے اور ان میں کوئی تباہ کن خلل نہیں آئے گا۔ جیسے فلکیات اور جغرافیہ موجودہ کائنات کو تھامے رکھتے ہیں، ماضی کا قصہ بن جائے گا۔

موجودہ انسان کی ترکیب کو دیکھ کر یہ لگتا ہے کہ موجودہ دنیا کو واضح طور پر انسان کا مسکن ہی بنایا گیا ہے۔ یہ بات بلاشبہ نہ صرف زمین کے لیے ہی سچ ہے بلکہ آسمان کے لیے بھی ہے یعنی پوری کائنات کے لیے۔ حالیہ سالوں میں ماہرین علم کائنات کی مجوزہ رائے یہی ہے۔

نتیجے پر پہنچنے کے لیے یہ بات منطقی لگتی ہے کہ اگر ہم کسی بھی قسم کی تبدیلی میں جاتے ہیں اور ہمیں کسی نئی کائنات میں رکھا جاتا ہے تو کائنات بھی اس کائنات کی تبدیل شدہ شکل ہوگی۔ اس لیے یہ اس لحاظ سے نئی ہوگی۔ اسے نہ صرف اس حالت میں بلکہ اصلاح شدہ حالت میں بدلا جائے گا جس میں ہم خود ہی رہیں گے اور گھومیں گے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارا اس سے مکمل تعلق ہوگا جیسا کہ موجودہ حالت میں کچھ اور نہیں تو وقت کی کمی کے باعث نہیں ہے۔ کائنات کی اور ہماری ترکیب میں وہی مشابہت ہوگی جواب ہے۔ ہم ان جسمانی حدود کی بندش میں نہیں ہونگے جس میں اب بندھے ہوئے ہیں۔

موجودہ آسمان اور زمین گزر جائیں گے، مگر نئی زمین کبھی نہیں ختم ہوگی اور نہ کبھی ہم۔ اس طرح یسعیاہ 9:7 کے الفاظ ''اُس کی سلطنت کے اضافے کا کوئی اختتام نہ ہوگا'' مکمل طور پر نیا مطلب لے سکتے ہیں اور خاص لفظ ہوگا ''اضافہ''۔ چند سال پہلے ایسا منظر مکمل بے ہودہ لگتا تھا مگر اب نہیں۔ نہ ہمیں خلائی لباس کی ضرورت ہوگی اور نہ خلائی جہازوں کی اور ہماری حرکات کی رفتار روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ ہوسکتی ہے۔

لمحہ بھر کے لیے میں یہ پیش گوئی نہیں کرتا کہ ہمارا وقت بین بجاتے ہوئے گزرے گا مگر میں یہ کہوں گا کہ ہم کوئی بھی ساز بجانے کے

لائق ہونگے۔لیکن میرا ایمان ہے کہ ایسی کامیابی آسانی سے ہماری پہنچ میں ہے۔صرف ہمیں ارادہ چاہیے۔اس طرح میں پر اعتماد ہوں کہ ہم زمین پر، آسمان پر اور اپنی مرضی سے پوری کائنات میں گھومنے کے لائق ہونگے۔پھر بھی میرا خیال ہے کہ یہ گھومنا پھرنا بے کار نہ ہوگا۔

تخلیقی ذمہ داریاں ہونگی جیسے کہ بہت سے چیزوں سے متعلق ''حکمرانی''۔حقیقت کچھ بھی ہو، مجھے یقین ہے جب وقت آئے گا ہماری صلاحیتوں کی تکمیل کو آسانی سے پہچانا جا سکے گا۔میری پیش گوئی ہے کہ ''اِس دنیا''میں کامیابی کا احساس ''اُس دنیا'' کی آنے والی کامیابی کے احساس کا پیش خیمہ ہے۔انسان کو بے کاری کے لیے نہیں بنایا گیا۔

ایک آخری بات یہ کہ ایسے افعال ''ہماری تجسیم انسانیت کو اس کی تخلیقی سرگرمی کی صلاحیت کے تسلسل کے ساتھ قبول کریں گے۔مگر ایسا لگتا ہے کہ خداوند بحال ہوگا اور میرا ایمان ہے ایسا ہوگا۔اس کی انسانیت کا نشان اس کے باپ کی ارادی فرمانبرداری میں تھا اور ہے۔ حتیٰ کہ اس کی خدائی کا نشان تھا اُس کے دعوے کے مطابق باپ کے برابر ہے۔اگر یہ عقلی قبولیت ہو تو شاید ہمیں اس کی انسانیت کی مستقل یقین دہانی ہے۔اصل میں جب خدا نے ہر چیز اس کے (خداوند یسوع مسیح کے)پاؤں تلے کر دی تو وہ بھی اپنے باپ کا ماتحت ہے جس نے کائنات اس کے ماتحت کر دی یعنی مختارِ کل خدا ہی ہے۔لہذا وہ اس کی دونوں فطرتیں بحال کرتے ہوئے کبھی نہ رکے گا،ان میں سے ایک میں ہم بھی شریک ہیں۔نہ وہ (خداوند)اور نہ ہم دوبارہ کبھی غیر مجسم ہونگے۔اس سے مراد یہ ہے کہ ہم کبھی بھی کسی کام کے لیے نااہل نہ ہونگے۔ہماری تجسیم سے مراد یہ ہے کہ کائنات ''ناگزیز''ہوگی اور ہم ہر کام کرنے کے لائق ہونگے۔

(c) ہم کیا معلوم کریں گے؟

میرا خیال ہے کہ ہم اپنی ضرورت اور خواہش کے مطابق ہر چیز جان سکیں گے اور ہمارا علم غلطی سے پاک ہوگا۔حافظے کی ناکامی کا تصور ناممکن ہے۔نئی کائنات میں ہم ایک بار جو سیکھ لیں گے، کبھی نہیں بھولیں گے۔

اس سے مراد کوئی درمیانی غفلت نہیں اور نہ ہی کسی گناہ کی غفلت نئے عہدنامہ سے ہم جانتے ہیں کہ اس کا جواب منفی ہی ہوگا۔

خداوند یسوع بطور انسان ہر چیز کو خود بخود نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اسے ہر چیز کا اپنی پیدائش ہی سے علم تھا۔مگر زندگی کی ہر سطح پر جو چیز اُس نے جاننا چاہی جان لی۔اور جو کچھ اس نے جانا وہ ممکن تھا۔کچھ چیزوں سے وہ واضح طور پر غافل بھی لگتا ہے۔انسانی فطرت اختیار کرتے ہوئے یہ اس کی تحقیر کا حصہ تھا۔ایک حقیقی انسان کے لیے یہ ضروری بھی تھا کہ وہ اپنے الٰہی کل علم کا جوہر اڑا دے یا اُسے ایک طرف رکھ دے۔اس کی وقتی غفلت حقیقی مگر گناہ کے سبب نہ تھی (جیسے وہ اپنے شاگردکو اپنی واپسی کے بارے میں نہ بتا سکا)۔

کئی مواقع پر ہم اس کا کل علم الٰہی ایک طرف رکھا ہوا دیکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم اس کی شجر انجیر کے بے پھل ہونے کی حیرت دیکھتے ہیں جبکہ اسے پھل بننے کی توقع تھی۔ہم اس کی عظیم خوشی دیکھتے ہیں جب اس نے ایک انسان کو جو یہودی نہ تھا مگر خداوند کے تندرست کرنے پر عقیدہ رکھتا تھا۔ایک اور موقع پر اس نے اپنے پیارے ساتھیوں مریم اور مارتھا سے پوچھا کہ لعزر کو کہاں دفن کیا ہے۔کیا یہ اس کے دوستوں کے لیے سہولت تھی کہ اس نے اپنے علم کو مخفی رکھا

یا یہ محدود علم کا حقیقی معاملہ تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ کسی بھی حالات میں وہ بہانہ نہیں کرے گا اس لیے وہ واقعی نہیں جانتا تھا۔

میرا ماننا ہے کہ نئی کائنات میں اپنی کامل حالت میں بھی ہمارے لیے جاننے کو بہت کچھ ہوگا۔ ہم وہ سب کچھ جان لیں گے جس کی ضرورت ہوگی اور کچھ بھی سیکھ لیں گے جس کی ہمیں خواہش ہوگی۔ ان چیزوں کو جو ہمارے لیے ضروری ہوں یا نہ ہوں۔ ہم ایک عمل کے ذریعے جانیں گے، شاید یہ ایک طرح کا الہام ہو یا محض پوچھنے سے۔

ایک سوال یہ ہے کہ ہمارے نئے اجسام میں ہمارا دماغ کس طرح کا ہوگا۔ یہ براہ راست خبر رسانی میں ملوث ہوگا۔ جس میں کسی بھی قسم کے صحیح مواد کے لیے نہ کسی قسم کی دیر ہوگی نہ رکاوٹ۔ وہ آسمانی علم ہوگا جو خدا کے ذہن کے کسی طور کم نہ ہوگا۔

(d) ہم پہچانے کیسے جائیں گے؟

زندہ کی ہوئی روح کے لیے ایک نیا گھر یعنی قابل پہچان جسم آسان معاملہ ہوگا اور ہم ایک دوسرے کو ایسے ہی پہچان سکیں گے جیسے اس دنیا میں پہچانتے ہیں۔ ہمارے اجسام کی جسامت، شکل اور اطوار ہمارے اردگرد کے لیے ہماری شناخت کا حصہ ہونگے۔ ہمارے چہرے کے خدوخال اور تاثرات معاملے کو ظاہر کریں گے۔ اس لیے ہمارے پاس ایک دوسرے کو پہچاننے کے بہت سے اشارے ہیں۔

لیکن پھر ایک مسئلہ کھڑا ہوتا ہے۔ اگر ہم نے اس دنیا میں کسی خاص دوست کو پچیس سال پہلے دیکھا ہوگا تو اس کا کیا ہوگا؟ چہرے بدل جاتے ہیں اور اسی طرح خدوخال بھی۔ اگر ہم اس وقفے کے دوران شیر خوارگی سے بلوغت تک پہنچ جائیں تو ہم ایک دوسرے کے کیسے پہچانیں گے۔ یا اگر ہم درمیان عمر سے بڑھاپے میں پہنچ جائیں تو؟ مختصر یہ کہ ہمارے جی اٹھے ہوئے اجسام زندگی کی کون سی سطح کو ظاہر کریں گے۔

مسئلے کے طور پر فرض کرتے ہیں کہ ایک بچہ جب ایک سال کا ہے تو اس کی ماں مر جاتی ہے۔ وقت کیساتھ وہ ایک مشہور مسیحی رہنما بن جاتا ہے۔ انہی سالوں میں وہ خداوند کیساتھ گھر جاتا ہے۔ اب ماں بچے کو اور بیٹا ماں کو کیسے پہچانے گا؟ بیٹے کے پاس موجود موزوں تصاویر ماں کو پہچاننے میں مدد کر سکتی ہیں مگر ماں کے پاس موجود تصاویر یہی کام نہیں کر سکتیں۔ آسمان پر اس قسم کے خونی رشتوں کا کوئی معاملہ نہ ہوگا مگر ہمیں۔ جس بھی شخص سے ہم ملتے ہیں، تعارف کی ضرورت ہوگی، خواہ وہ ہمارے پرانے دوست ہوں یا قریبی رشتے دار؟

اور ان کا کیا ہوگا، جن سے ہماری سالہا سال خط و کتابت رہی مگر نہ ہم نے کبھی انہیں دیکھا اور نہ ہی فون پر بات کی، لیکن ابھی تک ان سے آمنے سامنے ملاقات نہ ہوئی۔ ہم انہیں یا وہ ہمیں کیسے پہچانیں گے؟ یقیناً ان کے نام کی پنی چٹ کے ذریعے نہیں۔

شاگردوں کے لیے خداوند کو پہچاننا آسان تھا۔ ایک بار ان کے اذہان جی اٹھنے کی حقیقت کو قبول کر چکے تھے۔ کیونکہ اس کے جسم پر نشانات تھے جنہوں نے یہ مقصد پورا کر دیا۔ لیکن یہ بات انتہائی غیر مشابہ لگتی ہے کہ کوئی شفاعت یافتہ، اس قسم کے نشانات کیساتھ، یعنی لنگڑاتے ہوئے، بنا بازو کے یا نئے جسم کی ناقص کاملیت کیساتھ خداوند کے سامنے آئے۔

ہم خود کو اس خام خیالی کی اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمیں خودکار طریقے سے شاندار یا خوبصورت جسم ملے گا جو زندگی کے آغاز کے لیے موزوں ہوگا۔ کیونکہ اس قسم کا جسم بہت سے معاملات میں شناخت کے لیے موزوں نہ ہوگا۔ کوئی اور ہی ''شناخت'' کا اصول نظر میں

ہوگا۔

ایک بلا تصویر شناخت بھی ہے۔ اس کو فنکار پہچانتے ہیں اور اکثر اس سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں بھلے اس کا آغاز بھی نہ ہوا ہو یا یہ بگاڑ کا شکار ہو۔ مائیکل اینجلو ماہر مجسمہ ساز کے طور پر اکثر اشیاء کو اس طرح بناتا کہ انہیں پہچانا بھی جا سکے اور نہ بھی پہچانا جا سکے۔ یہ اس کے بے تکلف دوستوں کے لیے قابل پہچان تھیں اور باقیوں کے لیے نہیں۔ قابل پہچان اس طرح کہ وہ اپنے موضوع کی روح کو پکڑ لیتا، جو جاننے والوں کے لیے آشنا تھا۔ مگر ان کے لیے نا قابل پہچان تھا جو موضوع کی روح کو نہیں جانتے تھے، کیونکہ وہ بیرونی موجودگی کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیتا تھا اور اپنی تصویر کو موزوں بھری ربط کے بغیر ہی چھوڑ دیتا۔

مثال کے طور اُس نے لوریزو کی، عظیم خوبصورتی کی روح کے طور پر (جو لوگوں کی نظر میں تھا) اور اس کا عظیم محسن بھی تھا ایک شاندار تصویر بنائی۔ اُس نے اسے حقیر کردار کے طور پر نہیں، جیسا ہم سکول میں دیکھتے ہیں، بلکہ اپنے زندگی بھر کے تصور سے بنایا۔ سکے یہ دکھاتے ہیں کہ وہ کیسا لگتا تھا۔ مائیکل اینجلو نے یہ دکھایا کہ وہ کیسا تھا۔

اگر کوئی (The Pieta)، اُس کے شاہکار کا جائزہ لیتا ہے تو اس نے مصلوب خداوند کی تصویر بنائی ہے جس پر مریم کے گھٹنوں کے سامنے اس پر ''موت کا پردہ'' ڈالا گیا۔ اگر کوئی غور کرے تو مریم کا چہرہ خداوند کی نسبت جوان تھا۔ اس کا مقصد بلا شبہ عظیم خوبصورتی کے طور پر، بطور دیکھنے والا، مریم کو پیش کرنا تھا۔ اس بات سے الگ تھلگ کہ اس کا رویہ المیہ تھا۔ مگر سوچنے والی بات یہ ہے کہ وہ اس وقت کم از کم پچاس سال کی ہوگی۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مشرق وسطیٰ کی عورتوں کے چہرے حکمرانی نہیں بلکہ تصویری ہوتے ہیں۔ مگر وہ بوڑھا چہرہ مریم کے دل کو ظاہر کر رہا تھا۔ مائیکل اینجلو محض مہربان ہونے کی کوشش نہیں کر رہا تھا بلکہ محض سچ گو رہنا چاہتا تھا اور ہم اس تصویر میں لا شعوری طور پر سچ پڑھتے ہیں۔

محض تصویری مشابہت کی نسبت، ہمارے نئے اجسام میں ہماری شناخت زیادہ سچی اور زیادہ گہری ہوگی۔ شاید شناخت وضع قطع سے قائم نہیں ہوگی۔ شکل اور وضع جو ہم ظاہر کریں گے، وہ ہماری نہیں بلکہ دیکھنے والے کی تخلیق کردہ ہوگی۔ ہم اپنے دوست میں وہی دیکھیں گے جو ہمارے لیے مثالی ہو اور جب کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھے گا تو وہ بالکل مختلف ہوگا مگر اس کے لیے مثالی ہوگا۔ ہم دونوں دیکھنے والے نہیں جانیں گے کہ ہم کچھ مختلف دیکھ رہے ہیں۔ یہ ممکن بھی لگتا ہے کہ اگر ہمارے پاس کوئی آسمانی آئینہ ہو تو ہم وہی دیکھیں گے جو ہمیں خود میں پسندیدہ لگے۔ جبکہ دوسرے دیکھنے والوں کے لیے یہ بالکل مختلف ہوگا۔

کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم میں سے ہر کوئی عمومی بصری اثر سے نہیں بلکہ معجزاتی تبدیل سے پہچانا جائے۔ ایک ایسی تبدیلی جو دماغ کے بصری اشاروں کو ایک ایسی موزوں شکل میں تبدیل کر دے کہ وہ دیکھنے والے کو اس دنیا میں بھی ویسا ہی لگے جیسا وہ کبھی اسے جانتا تھا۔ عورت ان کے لیے عورت کے طور پر ظاہر ہوگی جو اسے اس طرح جانتے ہیں مگر جنہوں نے اسے لڑکی کے طور پر دیکھا انہیں وہ لڑکی ہی لگے گی۔ اسی طرح ایک بچہ بھی اپنی ماں کو ویسا ہی لگے گا جیسا وہ اپنے ابتدائی چند سالوں میں تھا جب وہ مر گیا۔

چاروں اناجیل ہمارے سامنے بظاہر مختلف مگر ارادی طور پر متضاد جواب پیش کرتی ہیں۔ اگرچہ مرکزی شخصیت واضح طور پر ایک ہی

ہے۔اس لیے ہمیں یہ قبول کرنا پڑے گا کہ اس نے (خداوند نے) مختلف دیکھنے والوں کے اذہان میں مختلف تاثرات پیدا کئے۔ متی نے اسے وعدہ کئے گئے بادشاہ کے طور پر دیکھا، جس میں بادشاہ ہونے کی نشانیاں تھیں۔مرقس نے اسے ایک شاندار خادم کے طور پر دیکھا جو بالکل مختلف چیز ہے۔لوقا نے اسے انسانوں کے درمیان انسان کے طور پر دیکھا۔ بے شک وہ ''ابن آدم'' تھا۔یوحنا نے اسے خدائی صفات والے انسان کے طور پر نہیں بلکہ انسانی صفات والے خدا کے طور پر دیکھا۔

وہ یہ سب کچھ تھا۔اس نے مختلف انسانوں کو اپنی موجودگی اور شناخت سے مختلف طریقوں سے آگاہ کیا۔ایسا اس لیے نہیں تھا کہ وہ کسی طور قابل تبدیل تھا بلکہ اس لیے کہ خدا نے جن لوگوں کو پراثر ریکارڈ کے مصنفین کے طور پر چنا، ان میں سے ہر ایک نے اس کا ادراک اپنی شخصیت اور پس منظر کے مطابق کیا۔

مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ اردگرد کے ملکوں کو لوگوں نے اسے اپنے رنگ اور ظاہری خدوخال سے بالا لحاظ، اپنے مطالب کے مطابق بنی نوع انسان کے حقیقی نمائندے کے طور پر دیکھا۔اس امکان کی بھی ہلکی سی اطلاع ہے کہ چھوٹے بچے دوسری نسل کے بچوں کیساتھ خوشی سے کھیلیں گے اور رنگ اور خدوخال کے فرق کی کوئی بظاہر آگاہی نہیں ہوگی۔ایسا ممکن ہے کہ ہم ان چیزوں سے لاعلم ہوں۔ شاید یہ غلط بات ہے کہ ہم خدوخال کی تصویر ''ہم میں سے ایک'' کی طرح بنائیں جس کے خوبصورت بال اور نیلی آنکھیں ہوں۔کیونکہ اس طرح کے ثقافتی امتیازات لوگوں کو صحیح طور سے بیزار کرتے ہیں۔ان عمومی حدود سے ہٹ کر یقیناً خداوند ابن آدم تھا۔میں حیران ہوں کہ ہماری مفصل بائبلز اور کرسمس کارڈز وہی کام کر رہے ہیں جو کچھ انسان کی سوچ میں ہے۔

میرا ایمان ہے کہ جب ہم خداوند کو دیکھیں گے تو ہم بھی اسے مختلف طور سے دیکھیں گے۔سفید انسان کے لیے وہ اس کا مثالی ہوگا اور سیاہ کے اس کا۔چینی شخص کے لیے اس کا مثالی ہوگا اور ایسکیمو کے لیے اس کا۔بلاشبہ ''ہر شخص'' کا۔ہم میں سے ہر شخص کا آئیڈیل (پسندیدہ) الگ ہے کہ خوبصورتی کیا ہے اور عمومی کاملیت کیا۔وہ ہماری سب پسندیدگیوں کو فرداً فرداً پورا کرے گا۔اس لیے نہیں کہ وہ سیاہ بھی ہوگا اور سفید بھی بلکہ اس لیے کہ ہمارے زندہ کئے ہوئے اذہان اس طرح بنے ہونگے کہ ہماری بصارت کو موزوں طور سے صاف کر دیں۔

اس طرح خداوند میں ہم اپنے پیارے دوستوں کو پہچان لیں گے۔خواہ وہ بعد کی زندگی میں کتنے ہی تبدیل ہو گئے ہوں۔ہمیں ان کے تعارف کی بھی ضرورت نہیں ہوگی جنہیں ہم کبھی نہیں ملے۔آدم، ایوب، داؤد، پولوس، آگسٹن، وائٹ فیلڈ یا پھر کوئی بھی ہو ہم انہیں اک کی شکل سے نہیں انکے ''جوہر'' سے پہچانیں گے۔

جیسے وہ ہمیں اس کامل طور سے دیکھتا ہے جو حقیقتاً ہماری شفاعت یافتہ روح کے کردار کو منکشف کرتا ہے۔اسی طرح ہم بھی اسی (خداوند) کی مانند ہونگے اور اسے اسی طرح دیکھ سکیں گے جیسا وہ ہے یعنی دیکھنے میں خوبصورت اور اپنے شفاعت یافتہ بچوں یعنی حقیقتاً خوبصورت لوگوں میں گھرا ہوا۔

ارتقا کی کوئی منزل نہیں

سی ایس لیوس نے ایک خطبے میں، جس کا موضوع ''جلال کا وزن'' تھا۔ ایک ادراکی اشارہ کیا جو ایک خصوصی تجویز تھی کہ ہم کیا کہنا چاہتے ہیں۔ وہ تجویز کرتا ہے کہ سب سے زیادہ اکتا دینے والا اور عام شخص جس سے کبھی ہم ملے ہوں، ایک ایسی مخلوق بن سکتا ہے، جسے ہم ملیں تو اس کی پوجا کرنے پر راغب ہو جائیں۔ دوسری طرف ایک دن وہ ایسی مخلوق بھی ہو سکتا ہے جو بدعنوان اور دہشت سے بھرپور ہو، جسے ہم صرف ڈراؤنے خواب میں ہی دیکھتے ہیں۔ اس نے لکھا ''آپ نے کبھی محض فانی شخص سے بات نہیں کی''۔ میرے خیال میں اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص جیسا ہمیں نظر آتا ہے، ویسا نہیں ہوتا۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس میں اچھا یا برا بننے کی صلاحیت کتنی ہے، وہ لوگ جن کیساتھ ہم مذاق کرتے ہیں یا جھڑکتے ہیں، بہادری کا کام کرتے ہیں یا شادی کرتے ہیں ان میں ''لافانی دہشت یا ابدی جلوہ'' کی صلاحیت ہوتی ہے۔

یہ ایک نیک سوچ ہے، حقیقتاً غمناک یا حیرت ناک۔ اور اس کا انحصار جتنا انسانی جسم پر ہے، اتنا ہی روح پر بھی ہے۔ اتفاقی ارتقائی عمل کا تصور ایک ایسی مخلوق پیدا کر رہا ہے جس میں نا قابل بیان خوبصورتی ہے یا نا قابل یقین بدصورتی۔ یہ بات مجھے بہت بیہودہ لگتی ہے۔ ان ذرائع سے (ارتقائی عمل) ہم نہ تو گناہ کے اثر کی دہشت کا جواب دے سکتے ہیں اور نہ ہی شفاعت کے اثر کے جلال کا۔ اس خوبصورتی یا خوف میں جسم ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

جنت یا جہنم کا خوبصورت یا خوفناک روحوں سے بھرنا نا قابل تصور ہے۔ اور بائبل بھی یقیناً اس بات کو تجویز نہیں کرتی۔ ہمارا ''جسم میں'' ہی انصاف ہو گا یا نوازا جائے گا۔ ہمارے اجسام یا تو جلال میں شریک ہونگے یا پھر شرم میں۔

☆☆☆

نتیجہ: منزل بنیاد ماپتی ہے

بنیاد اہمیت رکھتی ہے

روحانی تحریک کا جائزہ لینے کا صحیح طریقہ منطقی روابط ہیں۔ منطق ایک عظیم حرکی قوت ہے اور سوچ کے کسی بھی انداز میں منطقی الجھنوں پر، وہ جلد آئیں یا دیر سے یقینی کام کرتا ہے۔

۔جے گریشم میکن۔

میں پورے طور سے قائل ہوں کہ ایک قائم شدہ حقیقت اتنی ہی پاک ہے جتنا کہ منکشف سچ۔ لیکن انسان کی تخلیق یعنی ''ایک منکشف سچ'' پیدائش کے جواب کی محض ایک ممکن وضاحت ہے۔ ہم اس بات کا فیصلہ کیسے کرتے ہیں؟ اس واقعے کی امتیازی وضاحت کا اصل سچ کیا ہے؟ کیا ''سچائی'' حقیقت نہیں ہے؟ کیا یہ محض ہماری وضاحت ہے یا ہمارا تصور؟ ہمیں کیسے فیصلہ کرنا ہے کہ ''پیدائش'' کی صحیح وضاحت کیا ہے؟

میری اپنی لائبریری ''کتب خانہ'' میں پیدائش پر 350 سے زائد تبصرے ہیں۔ ان میں سے کچھ 1600 میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ میرے پاس مسیحیوں کا چند پہلی صدیوں کے دو رکا، چرچ فادران کا کام بھی ہے۔ ان میں سے بہت سے صحائف مختلف اشکال میں پیدائش پر ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور پیچھے چلے جائیں تو میرے پاس پیدائش پر کچھ ابتدائی مبصرین کی وضاحتیں بھی ہیں جنہیں خود یہودی لوگوں نے لکھا ہے۔ غالباً بائبل کی کسی بھی دوسری کتاب کو اس قدر جانچ پڑتال کا موضوع نہیں بنایا گیا، نہ ہی اتنی توجہ سے عطا کیا گیا اور نہ ہی اتنے کھرے دلائل دیے گئے۔ کیوں؟ کیونکہ ابتدائیں ہمیشہ اہم ہوتی ہیں۔ اگر ہمارا ایمان ایک منطقی تعمیر ہے تو یہاں اس کی بنیاد ہے۔

البتہ ہمیں ابھی مقدس ریکارڈ کی وضاحت کرنی ہے۔ یہ کام مختلف آراء کا جواب دہ ہے، کیونکہ ان تبصروں میں ہر تبصرے کو دیکھنے کا الگ انداز ہے۔ کوئی ایک سو سال پہلے کی لکھی ہوئی تحریریں بلا اعتراض کہتی ہیں کہ انسان کی تخلیق نہ صرف روحانی طور پر بلکہ جسمانی طور پر بھی، خدا کا براہ راست اور فوراً فعل ہے۔

اگر بائبل کی آراء و اطلاعات کسی بھی چیز کی جواب دہ ہیں تو پھر یا تو جدید ارتقائی موافقت وزن نہیں رکھتی یا پھر تقریباً دو ہزار سالہ مسیحیت اپنے عقائد کی بنیاد میں غلط راہ پر ہے۔ اگر انسان کے متعلق نظریہ ارتقاء ہی سچ ہے تو ہماری بنیاد غلط ہے۔ اگر اس کی بنیاد ہی تباہ کر دی جائے تو مسیحی ایمان کا دفاع کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

آدم کی براہ راست تخلیق بلا شبہ صدیوں تک کلیسیا کا ایمان رہی ہے۔ اگر اس روشنی میں انسان کے آغاز کو سمجھا جائے تو اُس کی منزل بھی سمجھ آ جائے گی، کیونکہ دونوں برابر منفرد ہیں۔ جانوروں کے برعکس جن کی ارواح اور اجسام زمین کی طرف چلے جاتے ہیں، انسان

کی روح خدا کے پاس اوپر جاتی ہے۔جس نے یہ روح اس لیے دی کہ وہ اپنے جسم کے جی اٹھنے کا انتظار کرے اور دوبارہ اس کے ساتھ متحد ہو کر ایک ابدی فرد بن جائے۔چونکہ حیوانی جسم اور انسانی جسم کی منازل فطری طور پر متضاد ہیں اس لیے یہ مانا جا سکتا ہے کہ ان کی بنیادیں بھی برابر مختلف ہوگی۔

کسی ''عقیدے'' کا دفاع

اب ارتقاء سختی سے ایک عقیدہ ہے اور اس کے مفروضے بھی دوسرے مفروضوں کی طرح سادہ طور سے لیے گئے ہیں۔غالباً فطرتاً وہ سائنسی اصطلاحات میں نا قابل ثبوت ہے۔سائنس کی ہر شاخ میں ثبوت کے اپنے قوانین ہیں۔جیسے ریاضی میں منطق، فلکیات میں مشاہدہ اور طبعی سائنس میں تجربہ۔چونکہ ارتقائی نظریہ فطری سائنس ہونے کا دعویدار ہے، اس لیے اس کا تجرباتی ثبوت بھی ہونا چاہیے، مگر نہیں ہے۔یہ ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ جو گزر گیا سو گزر گیا، اس کو دہرایا نہیں جا سکتا۔سائنس میں کسی بھی ثبوت کا دہرایا جانا ہی اہم ہوتا ہے۔ہم اس رو میں دو مرتبہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔

ہم اپنے عقیدے کے عظیم اجزا کو بھی ثابت نہیں کر سکتے، کیونکہ ہم اپنے خدا کا وجود ثابت نہیں کر سکتے۔''وہ جو خدا کے پاس آتا ہے، ضرور ہے کہ ایمان لائے کہ وہ ہے اور اسے جانفشانی سے تلاش کرنے والے کو اجر دیتا ہے'' (عبرانیوں 11:6)۔ایسے معاملات کو سمجھنے کے لیے ایمان ایک کنجی ہے نہ کہ کنجی ایمان ہے جیسا ہم اکثر سوچنا پسند کرتے ہیں۔

این سیلم (C.1033-1109) نے لکھا ''میں ترتیب میں ایمان رکھتا ہوں، اس لیے سمجھ سکتا ہوں'' اور ایبی لارڈ (C.1079-1142) نے پچاس سال بعد دلیل دی ''میں ترتیب کو سمجھنے کے لیے تلاش کرتا ہوں جو میرا ایمان ہے''۔این سیلم صحیح تھا۔ کیونکہ دنیا کا ہر نظریہ ایمان کے عمل سے شروع ہوتا ہے اور تبھی قابل فہم ہوتا ہے جب بنیادی حوالہ بنایا گیا ہو۔

سوچ کا ہر ''نظام'' بشمول ارتقاء ایک تمہید کیساتھ شروع ہوتا ہے جو کہ ایمان کا عمل ہے، ہمیں اسی کی پیروی کرنی ہے۔اگر ہم کسی مخالف کی تمہید کا انکار کرتے ہیں یا وہ ہماری تمہید کا، تو بامعنی مکالمے کے لیے ہمارے پاس کوئی نکتہ آغاز نہیں۔جب ہم بنیادی تمہید کے ثبوت پر اصرار کرتے ہیں تو ہم ایک مفید بحث کے لیے جگہ بناتے ہیں۔اگر ایک تمہید بن جائے اور نکتہ آغاز کو روک دے تو اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

کیونکہ مسیحی ایمان کی بنیادی تمہید، دنیاوی سخت ارتقائی نظریے کے نکتہ آغاز کے متضاد ہے، تو حقیقی موافقت ممکن نہیں۔سوائے اس کے کہ ہم منطقی وسعت کی انتہائی ثابت قدمی کو ترک کر دیں۔مسیحی نظریہ روحانی فطرت کے حقائق اور قوتوں کو اجازت دیتا ہے کہ وہ طبعی دنیا کے موجب عوامل بنیں۔ارتقاء انہیں مکمل منع کرتی ہے۔یہ دو حالتیں منطقی طور پر ناقابل موافقت ہیں۔اس لیے مسیحی علم الٰہی اور ارتقائی نظریے کے میل جوڑ کی کوشش ناامید ہے۔وہ مختلف تمہیدوں پر استوار ہیں اور انہیں صرف منطقی تضاد سے ہی موافق کیا جا سکتا ہے۔

کیا دو مخالف عقائد کی درمیانی حالت ممکن ہے؟

مسیحی ماہر ارتقا جو انسان کی بنیاد کو کلی قدرتی عمل قرار دیتا ہے۔ وہ اس کی منزل کو بھی مافوق الفطرت بتاتا ہے جو عجیب سی نا موزونیت لگتی ہے۔ کیا ایسی ناموزونیت کا دفاع کیا جا سکتا ہے؟ کیا ایک انسانی جسم جی کی منزل مافوق الفطرت ہے، اس کی بنیاد بھی ایسی ہی ہے جیسی ارتقاء، حیوانوں کی بتاتا ہے؟

اگر انسانی جسم کسی حیوانی ذریعہ سے اخذ کیا گیا ہے اور اسمیں قدرت کی طرف سے کچھ مہیا نہیں کیا گیا تو پھر وہ ایک جانور کے سوا کچھ نہیں۔ اگر وہ حیوانوں کی بنیاد اور فطرت میں شریک ہے، تو عقلی طور پر انکی منزل بھی وہی ہوگی۔ اگر ایک مسیحی ماہر ارتقاء دلیل دیتا ہے کہ انسان ایک جانور ہے، مگر جانور اپنی روح کیساتھ کسی بیرونی نظام سے متعارف ہوا تو یہ بات علم الٰہی کے لیے ایک ترنوالہ ہے مگر کٹھور ماہر ارتقاء کے لیے نا قابل قبول۔

پھر بھی علم الٰہی کی ارتقا کے لیے یہ رعایت مکمل ناموزوں ہے کیونکہ انسانی جسم تو عمل نجات میں بھی شریک ہے۔ اس لیے یہ دلیل دینا کافی نہیں کہ روح کی وجہ سے انسان جانوروں سے مختلف ہے۔ اس کے لیے ایسا جسم بھی ضروری ہے جو منفرد طور پر انسان ہو۔ کیوں؟ کیونکہ عمل نجات کو ایک حقیقی انسانی جسم کی متبادل قربانی درکار ہے۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ آدم کے تخلیق شدہ جسم کی فطرت کیساتھ عمل شفاعت کس طرح مربوط ہے تو جواب درج ذیل تین تصدیقوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ تینوں تصادیق اکٹھی بندھی ہیں اور ان کو تعظیم دی جاتی ہے یا پھر ان میں سے کوئی بھی درست نہیں۔ سب سے پہلے، جب تک کہ خداوند یسوع مسیح کا جسم مرنے کی ضرورت کے ماتحت نہ ہو، تو اس کو متبادل کے طور پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری بات یہ کہ جب تک خداوند یسوع کا جسم حقیقتاً انسانی نہ ہو، تو یہ انسان کے لیے متبادل نہیں ہو سکتا۔ آخری بات یہ کہ اگر اس کا جسم فطرتاً مرنے کی ضرورت سے آزاد تھا، اور اس لیے بلاشبہ انسان کے متبادل کے طور پر قربان کیا گیا، پھر آدم کا جسم بھی اپنی اصل حالت میں فطرتاً مرنے کی ضرورت سے آزاد ہونا چاہیے۔

بائبل کے علم الٰہی کے مواد کے مطابق آدم کا جسم ایسا تھا۔ ممکنہ طور پر اسے کسی سردار جسم سے اخذ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ دوسرے سب سرداروں کی فطرت موت ہے۔ ضرور یہ خدا کی براہ راست تخلیق ہے۔ فوراً تخلیق علم الٰہیہ کی ضروریات کو پورا کرتی ہے، جبکہ ارتقاء کا اخذ کرنے کا وضاحتی عمل کچھ بھی پورا نہیں کرتا۔

مسیحی ماہر ارتقاء خاموش ذمہ داری میں پناہ لیتا ہے کہ یہ انسان کی روح ہے جو منفرد ہے اور یہی اہمیت رکھتی ہے۔ انسانی جسم چونکہ اس کی بنیاد حیوان سے ہے، ماورائے عقل اہمیت نہیں رکھتا۔ مختصر یہ کہ انسانی ابدیت کے تسلسل کے لیے جسم اہم نہیں۔ اس نظریے میں انسان صرف اپنی روح کیوجہ سے انسان ہے۔ بائبل کا نظریہ کہ انسان روح و جسم کی ہستی ہے، ترک کر دیا گیا ہے۔ انسان محض سائے کی طرح بھی رہ سکتا ہے۔ اور وہ سایہ شناخت کے مقاصد کے لیے کوئی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔

ماہرین ارتقاء کے نزدیک فطرت میں ایسا کچھ نہیں ہوسکتا جس کی فطرت میں ایک موءلف نہ ہو۔ ایبا سے انسان تک کے عظیم سلسلے میں کوئی بھی عدم تسلسل نہیں ہوسکتا۔ طبعی موجب کے سلسلے کو خراب کرنے کے لیے کوئی معجزہ نہیں ہوا اور نہ ہی اس واقعے کی توضیح میں انسانی دماغ کی کوتاہی کی طرف کسی انکشاف کا اشارہ۔

ایسا مسیحی جو تخلیق یا الہام میں ایمان رکھتا ہے، وہ ارتقاء پر شبہ کرتا ہے کیونکہ یہ پیائشی، مادی اور وجودِ باری تعالیٰ سے انکار کا فلسفہ ہے۔ کسی ایسی حالت میں قائم رہنا مشکل ہے جو دو مخالف دنیاوی نظریوں کے درمیان ہو۔ بائبل کے کسی عقیدے کو خفیف شک سے ترک کر دینا ایک پھسلنی راہ ہے۔ وہ جو انتہائی معصومیت سے یہ راستہ شروع کر دیتے ہیں، انہیں جلد ہی پتا چل جاتا ہے کہ اس پھسلن پر رکنا بہت مشکل ہے۔ وہ جو ایسا کرتے ہیں انہیں پتا چل جائے گا کہ سوائے جذباتی بنیاد کے انکے ایمان کا دفاع بتدریج مشکل ہے۔

اگر کوئی واقعی اس بات کو نہیں سمجھا کہ جسم انسانی کا مسئلہ اتنا اہم کیوں ہے، تو اُس کے لیے اس دست برداری کا عقلی دفاع ذرا آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقی صورتِ حال سے ایسی غفلت بمشکل ہی مضبوط اور پختہ مسیحی عقیدے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ بدقسمتی سے اگر روح کے متعلق ہمارا علم الٰہی انتہائی ترقی یافتہ ہے، تو ایسا ہی ترغیبی متوازی نظریہ جسم کے متعلق نہیں ہے۔ دکھ کی بات ہے کہ جسم کی اہمیت نظر انداز کی گئی ہے۔

مسیحی ماہر ارتقاء کی ''پھسلنی ڈھلوان''

ارتقاء کی مسیحی قبولیت بڑی حد تک قولِ محال (بظاہر غلط مگر حقیقتاً صحیح بات) کا نتیجہ ہے۔ بھاری مادہ پرستی کے باوجود، جس نے ہم سب کو روگی کر دیا ہے، ہم کسی نہ کسی طرح مادی جسم کی اہمیت کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ نیا عہدنامہ اس پر کافی زور دیتا ہے۔ ہم یونانی نظریے کی طرف جھکتے نظر آتے ہیں کہ جسم ایک جیل ہے جسے جلد از جلد ترک کرنا ہے۔ اس طرح یہ بات آسان ہو جاتی ہے اور ارتقائی بنیاد قابل قبول نظر آتی ہے کیونکہ اس نظریہ میں جسم انسان کا ایک عارضی حصہ ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ابدی ہو۔ یہ (جسم) کہاں سے آیا اتنا ہی لاتعلق ہے، جتنا کہاں کو جائیگا۔ دوسری طرف جلال کی امید کے لیے یہ ایک ناگزیر حقیقت ہے۔

ہم اس جلال کی امید کو محض قابل فہم مراحل کے ذریعے، کوئی فرضی نکتہ (جیسے کہ انسان کے قدیم آثار کی وسعت) مہیا کر کے دغا دیتے ہیں جو کہ اس پھسلنی ڈھلوان کا ایک قدم نیچے بن جاتا ہے۔ ہم اسے اس طرح کرتے ہیں کہ یہ ہمارے لیے کم فکر کا باعث بنتا ہے کیونکہ ایمان کی دھوکہ دہی کا عنصر عیاں نہیں ہوتا۔ ہم بالکل نہیں دیکھتے کہ اس کی بھی اہمیت ہے۔

جلد ہی ایک قدم آگے جا کر حقیقی آدم اور حقیقی حوا کے تصور کو جو بائبل کی تاریخ میں موجود ہے، اور اس کیساتھ ہی انکے زوال کی کہانی کو بھی ترک کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ جونہی انکی ٹھوس حقیقت آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی ہے، تو ہم ایک خاموش مفروضہ بنا لیتے ہیں کہ اگر ماضی بعید میں کوئی آدم اور حوا تھے، تو وہ ظاہری طور پر بندر نما انسانوں کی طرح ہی ہونگے اور بہت جلد حوا کا آدم سے نکالا جانا بھی ایک فرضی داستان بن جائیگی۔

اگلا مرحلہ نسبتاً بلا درد ہے۔ بندر کی کوئی قسم دراصل ہمارے براہ راست زوال کا ہی سلسلہ ہے۔ قدرتی پیدائش کے ذریعے

جب ہم اور پیچھے جاتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو زیادہ ''بنیادی'' پاتے ہیں۔ابتدائی انسان جلد ہی ماندہ سرداروں سے نا قابل امتیاز ہو جاتا ہے۔اس لیے ''ہم سادہ طور سے اس خاندان میں شریک کیوں نہ ہو جائیں''؟

اب ہمارا راستہ ڈھلوان سے نیچے جاتے ہوئے پوری طرح ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ یہ کافی خوش کن ہوتا ہے، ہم ہجوم کیساتھ آزادی سے نیچے کی طرف جاتے ہیں۔ہم اب اکیلے نہیں کھڑے ہوتے، اور آرام دہ جزیہ ہے کہ اس کی اہمیت دکھائی نہیں دیتی۔ہم قربانی کو مسیحی ایمان کا حصہ رکھتے ہوئے ظاہر نہیں کرتے۔کسی طور لگتا ہے کہ ''پرانی کتاب'' ڈانٹنے، شاتر کرنے اور حوصلہ افزائی کرنے کی اپنی طاقت کھو چکی ہے۔ہم خداوند یسوع مسیح کے حوالے آخری آدم کے طور پر دیکھتے ہیں اور بمشکل ہی محسوس کرتے ہیں کہ اب یہ اصطلاح بے معنی ہے کیونکہ پہلا آدم دو، تین ملین پہلے کہ ارتقائی آثارِ قدیمہ کی دھند میں کھو چکا ہے، اور وہ ممکنہ طور پر آخری آدم کی شخصیت کا جوانا جیل میں ملتی ہے نمونہ نہیں ہو سکتا۔

لیکن اب اس کو سمیٹنے میں بہت دیر ہو چکی ہے۔کم از کم ''ثباتِ عقل کی ناموری'' کی اصطلاحات میں اور شاید ملازمت کے تحفظ میں بھی قیمت بہت زیادہ ہوگی، جس کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔آخر میں ہم ایک ایسے فلسفے میں قائم ہو جاتے ہیں جو ہمارے اس ''ایمان'' کے بالکل مخالف ہے جس میں کبھی ہم رہتے تھے۔بصورت دیگر زیادہ سے زیادہ اخلاقی ہمت چاہیے کیونکہ ظاہری ''ترقی'' کی خوشی کو ترک کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔سوا ایک مضبوط احساس جرم کے کوئی محرک نہیں کہ کوئی غلط راستے سے واپس آ جائے۔کوئی اس وقت تک احساس جرم نہیں رکھ سکتا جب تک کہ وہ یہ نہ سمجھتا ہو کہ اس معاملے کا سبب ایک جرم ہی ہے۔

دراصل کوئی انسان بھٹکنا نہیں چاہتا۔کسی بہاؤ کے خلاف جانے کے لیے بہت طاقت چاہیے۔ایک ایسی حالت میں قائم رہنا مشکل ہے جو ان کے لیے عقل ہو، جو اس تمہید کو مانتے ہیں یا دشمن سنگ خارا اور اس تمہید کو رد کرتا ہے۔

لیکن مسیحی ایمان کی منطق میں اس قدر اندرونی تضاد ہے کہ اس کے ساتھ اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا اور غیر منطقی مجازی حوالگی کے بغیر اس کو ترتیب نہیں دیا جا سکتا اس لیے اس کا دفاع کرنا مشکل ہے۔اس کے کسی بھی حصے کی حوالگی یا تو کل حصے کی حوالگی ہے (جیسے کہ حالیہ سالوں میں بہت سے لوگوں نے کیا) یا پھر ان لوگوں کے لیے جنہوں نے یہ کام نہیں کیا، نا قابل فہم طریقے سے محفوظ کرنا ہے۔

اس طرح کا اندرونی تضاد جاری جماعت کو ایک یقینی سطح کی اجازت دے سکتا ہے جو خالص روحانی سطروں کیساتھ ہو۔مگر یہ اس ذہنی شراکت کو تباہ کر سکتا ہے جو خداوند کے لوگوں کے لیے ہمیشہ ایک خوشی رہی ہے۔دکھ کی بات یہ ہے کہ نا انصافی کی ایسی صورتیں اکثر مایوس کن ہوتی ہیں کیونکہ علم الٰہی کا تضاد روحانی تضاد کی نسبت نا انصافی کا زیادہ سبب لگتا ہے۔ذہنی احساس جرم ایک دوسرے پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔عام طور پر ہم علم الٰہی کی نسبت روحانی معاملات کی طرف جھکنا زیادہ آسان سمجھتے ہیں۔دل دماغ کی نسبت زیادہ ''معاف کرنے والا'' ہے۔پروٹسٹنٹ مسیحی جو علم الٰہی کو تھوڑی اہمیت دیتے ہیں، رومن کیتھولک مسیحیوں کیساتھ زیادہ قریبی صحبت رکھتے ہیں۔ایسا تب ہوتا ہے جب یا تو جماعت علم الٰہی کی ماہر ہو جاتی ہے یا پھر ان کی شراکت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

بائبل کی واقعات نگاری پر سوال:

آدم کے ظہور کا وقت

1859 میں ڈارون کی ''اصناف کی بنیاد'' شائع ہونے کے فوراً بعد پرنسٹن تھیولوجیکل سیمنری میں انا جیلی علوم پر جو نشست واقع ہوئی جس پر ہم پہلے باب میں بات کر چکے ہیں، اُس کو نہیں دہرائیں گے۔ مگر اس سلسلے میں لئے گئے پہلے قدم پر ایک لمحے کے لیے رکنا قابل و در ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ اس وقت بے ضرر لگتی تھی۔

سر چارلس لائل (1797-1875) نے جو برطانیہ کے پہلے ارضیات میں سے تھے نے 1830 سے 1833 کو دوران ''ارضیات کے اصول'' شائع کی۔ اس تین جلدی تصنیف میں اس نے قائل کیا کہ ارضی تاریخ کا بہت لمبا عرصہ آدم کی پیش روی کر چکا ہے جبکہ زمین اس کے لیے بنائی جا رہی تھی۔ لگتا ہے اسے (چارلس لائل کو) پیدائش کے بیانات کی حقیقت پر کوئی شکوک نہ تھے کہ آدم اور حوا اور ان کے فوراً بعد آنے والوں کے ساتھ کیا ہوا۔ آدم کی تخلیق سے پہلے کے چھ دن بہت لمبے عرصے کی وضاحت کرتے ہیں۔ لیکن بعد کے تصنیفی کام ''انسان کے آثار قدیمہ'' میں جو 1863 میں شائع ہوئی، لائل نے دلیل دی کہ آدم 4000 سال قبل مسیح، جو بائبل کی تاریخ ہے، سے بہت پہلے، منظر میں نمودار ہوا کیونکہ اس کے باقیات طویل العمر چٹانوں میں پائے جا رہے تھے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ولیم گرین اس معاملے میں بائبل کو ارضیات کے موافق کرتا ہے اور تجویز دیتا ہے کہ جینیاتی ریکارڈز میں وقفوں کی وجہ سے بائبل کی کوئی مکمل تاریخ ممکن نہ تھی۔ گرین کے نظریہ کی حقیقت یہ تھی کہ وقفوں کی موجودگی مکمل طور پر دائرہ نما تھی۔ مگر اس بات کو نہ چارلس لائل نے اور نہ ہی الیگزینڈر ہوج نے پہچانا۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ ''آپ وقفوں کے بارے میں کیسے جانتے ہیں؟'' تو جواب یہ ہوگا کہ ''کلام کے کہیں کے بھی متوازی اندراجات غائب ناموں کے ذریعے انہیں ظاہر کرتے ہیں''۔ کوئی کیسے جانے گا کہ وہاں کوئی چیز کم تھی؟

لیکن اگر اسی کتاب کے وقفوں یا درزوں کو بھر دیا جائے، تو وقفے نہیں رہیں گے۔ دیگر الفاظ میں ہم جانتے ہیں کہ کچھ واقعات میں بائبل کے جینیات کو مختصر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات ہم صرف اس لیے جانتے ہیں کہ کہیں اور اس اختصار کی نشاندہی کر کے غائب چیزوں کو مہیا کر دیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ دراصل کچھ بھی غائب نہیں ہے، صرف مواد کو کہیں اور پیش کر دیا گیا ہے۔ جہاں یہ کمیاں ''کہیں اور'' بھی نہیں پیش تو ایسے میں ہم وقفوں کی پیش روی کا علم حاصل نہیں کر سکتے۔ صرف ایک طریقے سے ہم جینیاتی اختصارات سے آگاہ ہو سکتے ہیں کہ بعد میں ہمیں ان اختصارات کے بارے میں انتباہ کر دیا جائے کیونکہ ہمیں دیے گئے افراد کے نام وہاں داخل ہو کر ریکارڈ کو مکمل کر دیں گے۔ جب ہمیں یہ نام نہیں دیے جاتے، تو ہم وقفوں کا تصور نہیں کر سکتے۔ اس طرح جینیات (شجرہ نصب) ہرگز ان بھرے وقفے نہیں رکھتے۔ حرف ٹھوس شہادت سے ہی واقع کی ''بھرائی'' ہو سکتی ہے، جو کہ بائبل میں کہیں اور مہیا کیا گیا ہو۔ یہ بھرائی وقفے کو بھر کر اس کو منکشف کر دیتی ہے۔

مثال کے طور پر کسی سراغ رساں کہانی میں کوئی اطلاع کتاب کے آخر میں دی جاتی ہے تو بعد میں دیکھنے والا کہے گا ''بدقسمتی سے کہانی میں وقفے ہیں''۔ اگر کوئی مصنف قاتل کی شناخت آخری فقرے میں رکھتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ قاتل کی شناخت غائب

ہے۔کہانی کی ایک جگہ کی بھول چوک جو کسی دوسری جگہ بیان کر دی گئی ہو، کہانی کی درزیا وقفہ نہیں ہوتی بلکہ مصنف جان بوجھ کر اسے عارضی طور پر روکتا ہے۔ایک امتحانی پرچے پر اگر کوئی قرات کی آسانی اور صفائی کی غرض سے، ریاضی کا سوال کرتے ہوئے حساب کتاب کے کچھ عام مراحل چور دیتا ہے اور پھر اسے پرچے کی آخری شیٹ پر حل کر دیتا ہے تو ممتحن کے لیے یہ کہنا غیر واجب ہوگا کہ طالب علم نے حساب کتاب میں وقفے چھوڑے ہیں۔

بائبل میں یہ نام نہاد ''درزیں (کمیاں یا وقفے)'' آشکار کی گئی ہیں اور کلام میں ہی کہیں اور کے ریکارڈ کا واضح اشارہ دیا گیا ہے۔ دیگر وقفوں کا کوئی ثبوت نہیں، ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ کسی اور بائبلی وقفے کا ثبوت کیا ہوگا جو کہیں اور ظاہر نہیں کیا گیا؟ کوئی اس درز کو کیسے شناخت کر سکتا ہے جب تک کہ اسے کسی دوسری جگہ ''بھرا'' نہ گیا ہو اور اسے وسائل سے ہٹایا نہ گیا ہو۔ولیم گرین کا ان وقوف میں جینیات کا یہ دعویٰ بے جا تھا کیونکہ اس کے پاس ان دعووں کا کوئی علمی ثبوت نہ تھا۔

اس کے علاوہ اگر آثار قدیمہ 4000 سال قبل مسیح کی روائتی تاریخ سے کہیں دور ہیں تو پھر یہ دنیا انسان کی تخلیق سے بہت پہلے کی ہے۔مثال کے طور پر ''پیدائش'' کے دن اسی طرح سے ہیں جیسے کہ موسیٰ پر عیاں ہوئے، یا ان ایام کا مطلب زمانے ہو سکتا ہے یا پھر ہم پیدائش 1:1 اور 1:2 اور اسی طرح باقی آیات کے درمیان ایک ٹوٹی ہوئی کڑی متعارف کروا سکتے ہیں۔کوئی ان متبادلات سے ناراض بھی ہو سکتا ہے مگر انہیں بائبل کے علماء نے صدیوں میں پیش کیا اور آج بھی کلام کے بہت سے سنجیدہ اور مطلع طلباء ان پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

لیکن اگر ہم خود کو سختی سے بائبل کے ثبوت تک محدود کر لیں کہ آدم پہلا انسان تھا (اور آخری آدم اسی کا حقیقی نمائندہ تھا) تو ہم حالیہ وسیع آثارِ قدیمہ میں نہیں دھکیلے جا سکتے۔آدم سے پہلے لمبے عرصوں کے راستے ہیں مگر یہ آدم کو دس لاکھ سال یا اس سے زائد پیچھے نہیں دھکیلتے۔

بائبل کی تاریخ پر سوال: کوئی پہلا آدم نہیں

بلاشبہ آدم وہ پہلا انسان ہے جو بائبل سے واضح ہے۔آدم سے پہلے زمین پر کوئی انسان نہ تھا (پیدائش 2:5) اور جب آدم کو اس کام کے لیے خلق کی گیا تو وہ دنیا میں تن تنہا تھا۔اس کی تنہائی میں اس کے لیے کوئی مدد مناسب نہیں تھی اور پھر اسی کے جسم سے کسی کو بنایا گیا۔ پھر یہ مددگار سب زندوں کی یعنی سب انسانوں کی ماں بن گئی۔

اور اس معاملے کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے پولوس بتاتا ہے کہ حقیقتاً آدم ''پہلا انسان'' تھا۔

فرض کیا آدم واقعی دس لاکھ سال پہلے متعارف کروایا گیا۔پھر ہم کیسے اس دس لاکھ سالہ خاموشی کی تاریخ کو پیدائش کے پہلے تین ابواب میں سیٹ کریں گے؟ کی اتنا ''لمبا عرصہ'' پہلے کوئی باغ عدن تھا جس میں آدم میں سے ہی تشکیل کردہ حوا اس کے لیے مددگار کے طور پر لائے گئی؟ اور کیا پھر ان دونوں کا ممنوعہ پھل سے امتحان لیا گیا؟

کیا ان کی نافرمانی کا تباہ کن اثر تمام انسانی نسل پر پڑا اور آدم کی نسل کا ہر فرد زوال شدہ مخلوق بن گیا؟ کیا یہ واقعی لاکھوں سال تھے جن کے بارے میں کلام خاموش ہے؟ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ آخری آدم پہلے آدم کے بعد آنیوالے سب لوگوں کے لیے متبادل کی

صلاحیت رکھتا تھا اور پھر اس ان لاکھوں خاموش سالوں کے سب انسان شامل ہونگے۔ آخری آدم کو لاکھوں نہ بتائے گئے درمیانی قسم کے لوگوں کا بھی جسمانی یا روحانی نمائندہ ہونا چاہیے یا پھر وہ ''قابل شفاعت'' ہی نہیں ہیں۔ان پر بائبل کا بتایا ہوا طریقہ نجات لاگو نہیں ہوتا۔

مختصراً، باغ عدن سے بے دخلی کے بعد پہلے انسان اور اس کی بیوی نے اپنے رشتہ ازدواج کو نبھایا اور دو بیٹے پیدا کیے۔ایک بڑا ہو کر کسان بن گیا اور دوسرا **اگلہ** بان۔ دراصل ہمارے پاس ان کے نام بھی ہیں۔ان بیٹوں میں سے ایک نے حسد میں آکر اپنے بھائی کو قتل کر دیا اور اپنے بھائیوں اور بہنوں کو چھوڑ کر چلا گیا۔وہ اپنی ایک بہن کو بیوی بنا کر ساتھ لے گیا اور پہلا ''شہر'' تعمیر کیا جس کا نام اس نے اپنے بیٹے کے نام پر انوش رکھا۔یہ سب کچھ آدم کے پہلے ظہور سے دو نسلوں کے درمیان میں واقع ہوا۔

آئندہ آنے والی تیسری اور چوتھی نسل نے اعلیٰ تہذیب کو ترقی دی جس میں فنون اور ٹیکنالوجی بھی شامل ہیں۔چند صدیوں کی ٹوٹی ہوئی کڑی کے ثبوت کے بغیر ملین سالوں کو تنہا چھوڑ دیں تو ہم خود کو ترقی یافتہ تہذیب کی دہلیز پر پاتے ہیں جس کی گواہی علوم ارضی کی دریافتیں کثرت سے دیتی ہیں۔

آدم کو تاریخی دور میں لانے کی سمجھ آتی ہے مگر دس لاکھ سال کی ٹوٹی کڑی کا کیا جائے؟ مجھے انسان کی ارتقاء پر ایک مختصر مضمون یاد آتا ہے جو کہ ایک مشہور مسیحی میگزین میں آیا۔ یہ عمومی ارتقاء پر تھا اور مختلف مصنفین اسے سلسلہ وار کرتے تھے۔اسے ایک مسیحی ماہر علم بشریات نے لکھا۔اپنے مضمون میں مصنف نے لکھا کہ یہ بات یقینی ہے کہ انسان کم از کم ایک لاکھ سال پرانا ہے۔وہ واضح طور پر رضامند تھا کہ اپنی سوچ کو جو پیدائش کے متعلق ہے اس نئی حالت کے موافق کر دے۔حیرانی کی بات یہ ہے کہ پندرہ سال بعد زیادہ اعتماد سے اس ایک لاکھ سال کو کیسے دس لاکھ سال محسوس کر لیا۔اور اب ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہماری جڑیں غالباً 30 لاکھ سال پیچھے ہیں۔کس نکتے پر کوئی یہ کہے کہ ''بس اب یہی کافی ہے'' اور یہ کر کے بھی کوئی کس حالت پر قائم رہے؟ کس نکتے پر اس مضمون کا مصنف اب یہ کہے گا کہ ''یہ ہے وہ (دور) جب آدم متعارف کروایا گیا''۔

یہ کھڑے ہونے کا وہ مقام ہے جس کا کوئی اختتام نہیں اور جلد ہی یہ مقام اتنا دھندلا ہو سکتا ہے کہ کسی کے لیے کوئی مقام ہی نہ رہے، یا پھر معاملہ ذرا مختلف ہو جائے اور ہمیں یہ کہنا پڑ جائے کہ کبھی کوئی آدم تھا ہی نہیں۔اس طرح پہلا آدم خارج ہو جاتا ہے تو پھر یہ (نظریہ) آخری آدم کیساتھ کیا کرے گا؟

کون صحیح ہے؟ سچ کہاں ہے؟

ان دس لاکھ سالوں کے لیے جگہ ہمیں کہیں نہ کہیں تلاش کرنا پڑے گی۔اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو واضح طور پر پیدائش کا سادہ اور کھرا ریکارڈ تباہ ہو جاتا ہے (یعنی آدم اور حوا کیساتھ کیا ہوا اور تمام بنی نوع انسان کیساتھ، کیونکہ وہ انہی کے اندر تھے)۔انسان کی نجات کی تاریخ کی بنیاد اس طرح قطعی تباہ ہو جاتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ عظیم پرنسٹن کے مسیحی ایمان کے دفاع کرنے والوں نے کوئی ضرورت محسوس نہ کی کہ ان دو تاریخی مناظر کے درمیان مفاہمت کی کوشش کریں۔نہ ہی وہ اس بات سے آگاہ تھے کہ آدم کے جسم کو ارتقاء کی اجازت دے کر وہ

نظریہ نجات کو خطرے میں ڈال رہے ہیں جس کی وہ قابلیت سے تشریح کرتے تھے۔

شاید انہوں نے انتہائی آسانی سے ہتھیار ڈال دیے۔ ارتقائی تصویر خود بھی آہستہ آہستہ ایک ایسے مقام کی طرف جھک رہی ہے جس میں انسانی اصناف کی بنیاد بائبل کے براہ راست تخلیق کے تصور کے زیادہ قریب ہے۔ اگر چہ وہ لوگ اسے ہرگز تسلیم نہیں کریں گے جو کہ ارتقائی عمل کے لیے تصورات کی دلالت کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم تیسرے باب میں دیکھ چکے ہیں۔ گولڈ سمتھ کی ''اچھل کود'' (Saltations) پھر سمپسن کی ''مقداری ارتقاء'' (Quantum Evolution) اور اب گولڈ کی ''تاکیدی مساوات'' (Punctuated Equllibrium)۔

یہ سب ایک نئی صنف کے اچانک ظہور کا جواب دینے کی کوششیں ہیں جس میں کہ انسان ایک ہے، لیکن یہ وضاحتی نہیں بلکہ بیانیہ اصطلاحات ہیں۔ اگر چہ یہ سب اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں جس میں یقیناً سادگی سے تخلیقی مداخلت کے ثبوت کو واضح کیا گیا ہے۔ بائبل کی تاریخ بلا لحاظ ہموار اور ''بتدریج'' چلتی ہے لیکن وقتاً فوقتاً اس میں اچانک تبدیلیاں اور اچانک اختتامیے بڑے پیمانے پر شامل ہیں۔ یہ اچانک کے نئے ابھار عظیم انسانی سلسلے میں بہت سے وقفے چھوڑ دیتے ہیں جو ملنے والی مسلسل یقین دہانیوں کے باوجود ثابت قدم رہتے ہیں۔ یہ وقفے تقریباً عالمی طور پر تسلیم شدہ ہیں، مگر یہ حقیقت کہ اب انہیں پہلے کی طرح سے ''نامکمل فوسل ریکارڈ'' سے منسوب کیا جاتا۔

انسان کا اچانک ظہور اب پہلے جیسا مسئلہ نہیں رہا۔ مگر اُس کے ظہور کا قبول شدہ وقت کسی کے لیے بھی جو کلام پر پختہ یقین رکھتا ہے اب بھی ایک مشکل کام ہے۔ میرا خیال ہے کہ بائبل کبھی بھی موجودہ انسانی قدامت کے نظریات کو جگہ نہیں دے گی۔ ذاتی طور پر میں اس بات کا قائل ہوں کہ اس وسیع قدامت کے دلائل وقت کے ساتھ ساتھ نئے ثبوتوں کیساتھ تبدیل کر دیے جائیں گے۔ مگر بائبل اس بات ہر ڈٹی رہے گی جس پر ہمیشہ سے ہے۔ یقیناً تاریخی دور کے دوران علم الارض نے بائبل کے ریکارڈ کی اصولی تصدیق کی ہے۔ یہ تصدیق عمومی نہیں بلکہ انتہائی علمی ہے۔ تاریخی طور پر اس نے ہر طرح کی جانچ کی اور میں قائل ہوں کہ آدم اور حوا کی کہانی تاریخ کا حصہ ہے، تاریخ سے پہلے کا نہیں۔

مجبور کرتا ہوا علم الٰہی کا مواد

بڑھتی ہوئی تعداد میں بہت سے خدا پرست مسیحی ایسے ہیں جو انسانی جسم کی ارتقاء کو سمجھتے ہیں۔ ان کا رجحان پیدائش کو شاعری، تمثیل یا دیوتاؤں کے قصے کے محور پر عزت دینے کی طرف ہے۔ لیکن وہ موزوں طور پر نہیں سوچتے کہ کیا ایسی رسائی نئے عہدنامے میں پہلے آدم اور آخری آدم کے درمیان مضبوط موافقت پیدا کرتی ہے۔

فقط دو حقیقی انسانوں کے درمیان جوڑ، جو دونوں آدم کہلائے، اور دونوں ہی کی معجزاتی بنیاد باوثوق ہے۔ پہلے انسان یعنی آدم کی تخلیق، جو کہ واضح طور پر ایک مافوق الفطرت مرحلہ تھا اور آخری آدم کا کنواری سے جنم لینا بھی مافوق الفطرت ہے۔

حیوانی بنیاد کا جسم، جو ارتقائی مراحل کو درکار ہے، اس الٰہی بنیاد کے جسم سے کلی طور پر ایک الگ جز ہے جسے براہ راست

تخلیق کیا گیا۔ حیوانی بنیاد کے لیے موت فطرتی ہے۔ یعنی یہ ایک جدی سلسلہ ہے جس کے لیے موت قدرتی ہے۔
جبکہ براہ راست تخلیق والے معاملے میں موت فطرتی نہیں بلکہ سزا کے طور پر ہے۔

نجات کا تمام منصوبہ اسی فرق پر منحصر ہے کیونکہ آخری آدم فطرتاً موت کا موضوع نہیں ہوسکتا اور یہی بات اس کو متبادل قربانی بنا دیتی ہے۔ متوقع وقت سے پہلے وہ محض فطرت کو ایک قرض ادا کرے گا۔

ہمیں یہ امتیاز کرنا پڑے گا کہ جہاں ایک حیوان طبعی موت مرتا ہے جو کہ اس کے لیے ضروری ہے، وہاں انسان غیر طبعی موت مرتا ہے کیونکہ یہ اس کی سزا ہے۔ دراصل اسے مارا جاتا ہے، برعکس اس کے خداوند یسوع مافوق الفطرتی موت مرا۔ کیونکہ وہ متبادل کے طور پر، اپنی مرضی سے، خود کو خود ہی مارنے والا تھا۔ جونہی یہ اہم پیچ منظر سے غائب ہوجاتا ہے تو ہم انسان کی نجات کا الٰہی منصوبے کا شعور بھی کھو دیتے ہیں۔

پہلے آدم کی بنیاد اور موت وقدرتی مراحل نہ تھے اور نہ ہی آخری آدم کی پیدائش اور موت قدرتی تھے۔ یہ چاروں مراحل اکٹھے ہی گرتے یا کھڑے ہوتے ہیں۔ موخر الذکر (یسوع مسیح) کی بات کرنا اور اول الذکر (آدم) کا انکار کرنا ''پہلے اور آخری'' جیسی اصطلاحات کو بے معنی کر دیتا ہے، جن پر منصوبہ نجات منحصر ہے۔

ہمیں صرف ''نظریہ روح'' ہی درکار نہیں بلکہ ''نظریہ جسم'' بھی درکار ہے۔ بااصول علم الٰہی میں ایک حصہ ہے جو ''بشریات'' کہلاتا ہے جو کہ انسان کی فطرت کے متعلق ہے۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ انسانی جسم کے بارے میں نہ صرف اس دنیا میں بلکہ آنیوالی دنیا میں بھی بہت کم کیوں کہا گیا ہے۔ آخر کار یہ اس کی فطرت کا انتہائی ضروری حصہ ہے۔ کسی بھی شرح پر جہاں ہمارے پاس انسانی روح کی اہمیت پر مسیحی تصانیف کی افراط ہے تو وہاں انسانی جسم کی اہمیت پر گرہن کیوں ہے۔ واقعی اس میں کوئی حیرانی نہیں کہ انسانی جسم کے ارتقاء کو آسانی سے اور وسعت سے قبول کرلیا گیا ہے۔ اس کو نہ قبول کرنے کے لیے کوئی سبب مجبور کرتا دکھائی نہیں دیتا مگر ایسا کرنے کے لیے بلاشبہ دباؤ بہت زیادہ ہے۔ اگر کوئی شخص ایک مسیحی کے طور پر اپنے ایمان کی درستگی کے نکتہ نظر سے کوئی سبب نہیں دیکھ سکتا، تو پھر وہ اسے کیوں قبول نہ کرے جبکہ ہر شخص ایسا کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اس کے علاوہ نظریہ ارتقاء شاندار صلاحیت کیساتھ قائم ہو چکا ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہ ہر چیز کی چابی ہے جو تبدیلی اور ترقی میں ملوث ہے۔ کیونکہ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کوئی ''مفید'' نظریہ متضاد اصولوں کی بنا پر نہیں بلکہ ''بہتر'' نظریے کی بنا پر ختم ہوتا ہے۔
چونکہ ''بہتر'' نظریہ، جسے ہم بطور مسیحی ترجیح دیتے ہیں، یقینی غیر مادی تمہیدوں پر ثابت کیا جاتا ہے، سائنسی حلقے کے لیے فی الحال قابل قبول نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ایسا کوئی متبادل نہیں جو ہمیں مخالفت میں رہ کر کامیابی کی امید دلا سکے۔

بنیادی مسئلہ تمہید کا ہے اور یہاں ایمان تمہید منتخب کرنے کے لیے فیصلہ کن جزو ہے۔ خالق کی حقیقت پر ایمان شعوری دلیل سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اندھیرے کی چھلانگ یعنی اچانک تبدیل نکتہ نظر سے حاصل نہیں ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس جنگ میں ہماری اکلوتی امید خود کو اندرونی طور پر نیا کرنے میں اور اپنے بڑے مخالفین کے درمیان بچانے والے ایمان میں پر فضل داخلے میں ہے۔

شاید ہمیں اپنے مخالفین کے لیے زیادہ دعا کرنے کی ضرورت ہے۔صرف حقائق کو جاننے کی کوشش ہی نہیں کرنی چاہیے۔اگر چہ ہمیں ڈر میں بے ہتھیار داخل نہیں ہونا چاہیے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ ہمارے جنگی فنون اس معاملے میں بہ نسبت ذہنی مشق یا شعوری جنگ کے روحانی ہیں۔پھر بھی یہ بہت اہم ہے کہ واضح طور پر ذہن میں رہے کہ عقل کا استعمال نظر انداز نہیں کیا

جا سکتا۔کسی ذہین شخص کیساتھ بات چیت کرتے ہوئے ہمیں اس لائق ہونے چاہیے کہ ہم اپنے اندر کی امید کی وجہ بتا سکیں۔ نامعقولیت عظیم ایمان کا اہم ثبوت نہیں ہے، لیکن جسم آدم کی براہ راست تخلیق اور ہماری ''امید'' کے درمیان تعلق، اگر ہمارے الفاظ میں وزن ہے تو کم از کم ہم پر ضرور واضح ہونا چاہیے۔

نصف صدی سے زائد کی ارتقاء اور تخلیق کے درمیان جنگ و جدل کو دیکھنے کے بعد میرا احساس یہ ہے کہ نظریہ ارتقاء میں بلاشبہ مہلک نقائص موجود ہیں جنہیں عوام الناس کے سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔دوسری طرف الٰہی علمی نتائج بھی ہیں جن سے مسیحی لوگ تقریباً مکمل طور غافل ہیں۔

لیکن اس جنگ میں انسان کے ارتقائی جسم کو رد کرنے کے لیے الٰہی علمی دلائل کو اسقدر ''ہتھیاروں'' کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کی بنیاد ان تمہیدوں پر نہیں ہے۔جن بنیادوں پر مخالفین کا معاملہ ہے اور اس لیے وہ بہت تھوڑا وزن رکھتے ہیں یا بالکل وزن نہیں رکھتے۔تاہم یہ دلائل (بہت سوں کا جائزہ اس کتاب میں لیا گیا ہے) خداوند کے لوگوں کو مسلح کر سکتے ہیں اور آسان ارتقائی مشروط معاہدہ کے خلاف ایسا کرنا بھی چاہیے کیونکہ اس کا اطلاق انسانی جسم پر ہوتا ہے، اگر چہ اس حیاتیاتی مواد کو، جس پر نظریہ ارتقاء کی بنیاد ہے، للکارنے کے لیے ہمارے پاس مناسب ساز و سامان نہیں ہے۔

مگر اس سب سے بالاتر، ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی ہے کہ ہر وہ جز جو پہلے آدم کی حقیقت اور تاریخی اہمیت کو کم کرتی ہے وہ آخری آدم کی حقیقت اور تاریخی اہمیت کو منعکس کرتی ہے۔اس لیے میرے نکتہ نظر میں یہ مسئلہ بہت سنجیدہ ہے اور اسے دونوں محاذوں پر کیوں لڑا جائے یعنی حیاتیاتی اور الوہیاتی۔

نا امید ارتقاء

ہمیں انسانی جسم کی ارتقاء کیساتھ اس قدر شدید تکرار کیوں کرنی چاہیے؟ کیونکہ ہماری نصف انسانی فطرت اس میں لپٹی ہوئی ہے۔ جسم کی تعریف مجسم ہونے میں ہے، ایک ایسا جسم جس کا مستقبل موت سے پرے ہے، اور یہ بات ایک دوسرے سے ہماری ابدی پہچان کے لیے اہم ہوگی۔

نیا عہدنامہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ یہ جسم قابل شناخت شکل میں زندہ کیا جائے گا اور ہمیشہ کے لیے موت کی طاقت سے دور کر دیا جائے گا۔علاوہ ازیں یہ وعدہ خود آدم پر بھی لاگو ہوتا ہے اور اس کے بعد آنے والے سب لوگوں پر بھی، خواہ ہم اسے وقت میں کتنا ہی پیچھے رکھیں۔

یہ سماں ایک منفرد بنیاد کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ عمل نجات جس سے کہ منزل متاثر ہوتی ہے، اس حقیقت پر منحصر ہے کہ پہلی بار انسان کا آغاز جسم کیساتھ شروع ہوا جس میں لافانی صلاحیت تھی۔ ایسا جسم کسی ارتقائی عمل سے نہیں ابھر سکتا کیونکہ یہ ایک منفرد منزل کے لیے بنایا گیا، جس کا وعدہ کسی دوسری مخلوق سے نہیں کیا گیا۔

ارتقاء کے اپنے بڑے وکلاء اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جس میں ایسی کوئی امید نہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ آخری آدم (جس کی ابتدائی شکل، پہلا آدم تھا) کی پیدائش، موت اور جسمانی طور پر جی اٹھنے کے ذریعے نہ صرف ہمیں مستقبل کی روشن امید ہے بلکہ اس کا پورا یقین ہے۔

☆☆☆